اردو میں ادبی تحقیق کی روایت: ایک تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی

مقالہ نگار

ایاز احمد

نگراں

ڈاکٹر محمد آصف زہری

معاون نگراں

پروفیسر محمد شاہد حسین

ہندوستانی زبانوں کا مرکز

اسکول آف لینگویج، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز

جواہر لال نہرو یونیورسٹی

نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

۲۰۱۷

जवाहरलाल नेहरू विश्वविद्यालय
JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY
भारतीय भाषा केन्द्र
Centre of Indian Language
भाषा, साहित्य एवं संस्कृति अध्ययन संस्थान
School of Langauge, Literature & Culture Studies
नई दिल्ली–110067, भारत NEW DELHI-110067, INDIA

Dated:21/07/2017

DECLARATION

I hereby declare that the research work done in this Ph.D. Thesis entitled "*Urdu Mein Adabi Tahqeeq ki Riwayat:Eik Tajziyati Mutala" (Tradition of Litrary Research in Urdu : An Analytical Study)* by me is an original research work and it has not been previously submitted for any other degree in this or any other University/Institution.

Ayaz Ahmad
(Research Scholar)

Dr. Mohammad Asif Zahri
(Supervisor)
CIL/SLL&CS/JNU

Prof. Mohd. Shahid Hussain
Co-Supervisor
CIL/SLL&CS/JNU

Prof. Govind Prasad
(Chairperson)
CIL/SLL&CS/ JNU

GRAM: JAYENU, Tel.: (91-011) 26741557, 26742676 Extn.: 4217, (D) 26704217; Email: chair_cil@mail.jnu.ac.in

انتساب

اپنی دونوں بیٹیوں افرح، صفیہ اور بیٹے ضرغام کے نام

ستارے توڑنے کی میری خواہش تم سے پوری ہو
دعا ہے تم مرے قد سے بہت اونچے نکل جاؤ
مظفر حنفی

مندرجات

مطلع کتاب	3
باب اول: اردو میں ادبی تحقیق کا دور اول	8
(الف) تحقیق کا مفہوم اور دائرۂ کار	9
(ب) تحقیق کے ابتدائی نقوش (تذکروں میں تحقیقی عناصر)	47
(ج) تحقیق کے ارتقائی مراحل (ابتدائی محققین)	73
باب دوم: اردو تحقیق ۱۹۲۰ء کے بعد	116
(الف) لسانی تحقیق (اہم محققین)	117
(ب) متنی تحقیق (اہم محققین)	156
باب سوم: اردو تحقیق کا معاصر منظر نامہ (اہم محققین)	186
باب چہارم: چند غیر معروف محقق	233
باب پنجم: اردو تحقیق: مسائل اور امکانات	281
ماحصل	299
کتابیات	310

مطلع کتاب

انسان فطری طور پر متجسس واقع ہوا ہے اور اسی صفت کی بدولت اس نے زندگی کے ارتقائی مراحل طے کیے ہیں۔ مختلف شعبۂ حیات میں اس بنیادی وصف کی کارفرمائیاں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ کبھی بھاپ کے ذریعے کیتلی کے ڈھکن کو اٹھتا دیکھ کر اسے بھاپ کی طاقت کو جاننے کی فکر ہوئی تو اس نے اس حد تک غور وفکر کیا کہ بھاپ سے چلنے والا انجن تیار کر ڈالا تو کبھی پرندوں کے اڑنے کے عمل پر غور کرتے ہوئے ہوائی جہاز بنا ڈالا۔ اشیا کے عمل اور ردِ عمل پر تجسس ہوا تو علم کیمیا کی دریافت ہوئی۔ خود اپنے ماضی کو جاننے کا شوق جاگا تو علم تاریخ وجود میں آیا۔ اسی تجسس کی کارفرمائیوں نے اسے معلوم سے نامعلوم کی طرف سفر کرنا سکھایا اور آج انسانی علوم وفنون نے اس حد تک وسعت اختیار کر لی ہے کہ اس کے معجزہ ہائے ہنر کی حدود کا اندازہ لگانا بھی کارِ دشوار ہے۔

زندگی کے دیگر شعبہ جات کی طرح ادب میں بھی تحقیق و تجسس کا عمل جاری وساری رہتا ہے۔ اگر ہم اردو ادب کے ارتقا پر نظر ڈالیں تو یہاں بھی ادب کے ارتقا کے ساتھ ساتھ تحقیقی عمل کے نشانات بھی ملتے ہیں۔ تذکرے اس کی بہترین مثال ہیں۔ اگرچہ تذکروں میں باقاعدہ تحقیقی عمل مفقود ہے تاہم تحقیقی شعور کی کارفرمائی ضرور موجود ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس شعور میں پختگی آتی گئی اور طریق تحقیق سائنسی ہوتا گیا۔ محمد حسین آزاد کی آب حیات میں تحقیق کے ساتھ ساتھ تاریخی شعور بھی کارفرما ہے جسے اردو تحقیق کی نئی منزل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

سرسید نے جہاں جامِ جہاں نما لکھ کر اپنی تحقیقی و تاریخی بصیرت کا ثبوت دیا وہیں آئینِ اکبری، تاریخ فیروز شاہی اور تزک جہانگیری ترتیب دے کر اردو ادب میں تحقیق کو ایک فن کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ حالی نے یادگارِ غالب، حیات سعدی اور حیات جاوید لکھ کر سوانحی تحقیق کو فروغ دیا۔ شبلی نے شعر العجم کے ذریعہ ادبی تاریخ نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا۔ حافظ محمود شیرانی نے 'پنجاب میں اردو' لکھ کر لسانی تحقیق کے در وا کیے اور مجموعۂ نغز کو ترتیب دے کر قدیم متون کی تلاش و تحقیق کو باقاعدہ ایک فن کی حیثیت سے پیش کیا جانے لگا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ادبی تحقیق کی جانب خصوصی توجہ دی جانے لگی۔ قدیم ادبی متون کی فراہمی،

ان کی ترتیب و اشاعت، تاریخ ادب کی تدوین، قواعد و لسانیات اور شعرا و ادبا پر مستقل کتابیں لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا اور بیسویں صدی کے نصف اول تک آتے آتے اردو زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقات کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ جمع ہو گیا۔ بہت سارے مسلمہ حقائق باطل قرار پائے اور نئے حقائق سامنے آئے۔ قدیم متون کی دریافت نے اردو شعر و ادب کی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا۔ اردو ادب کی تاریخ کی روایت جو اب تک ولی تک محدود تھی، محمد قلی قطب شاہ اور اس کے ماقبل شعرا تک پہنچ گئی۔

آزادی کے بعد اردو تحقیق کی سمت و رفتار میں تیزی آئی۔ ایک طرف علمائے ادب سنجیدگی سے اس طرف متوجہ ہوئے تو دوسری طرف جامعاتی تحقیق (سندی تحقیق) کا رجحان بھی عام ہوا۔ تحقیق کے اصول و ضوابط بھی تحریر میں لائے گئے۔ نتیجتاً تحقیق کے معیار میں بھی اضافہ ہوا۔ ترتیب متن کے سلسلے میں بھی پیش رفت ہوئی اور کئی قابلِ ذکر متن جدید طرزِ تدوین سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئے۔ پروفیسر مختار الدین احمد (کربل کتھا)، عبدالرزاق قریشی (مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا کلام، دیوان عزلت اور راگ مالا)، مولانا امتیاز علی عرشی (دیوان غالب، رانی کیتکی کی کہانی، سلک گوہر) وغیرہ کو ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ یونیورسٹیوں میں لکھے جانے والے مقالوں میں کئی مقالے اس معیار کے ہیں کہ انھیں حوالوں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ آزادی کے بعد لکھے جانے والے مقالوں میں پریم چند (قمر رئیس)، اردو میں ترقی پسند تحریک (خلیل الرحمن اعظمی)، ذوق، سوانح و انتقاد (تنویر احمد علوی)، کلیات ذوق (تنویر احمد علوی)، اردو میں تمثیل نگاری (منظر اعظمی)، شعرائے ارود کے تذکرے (حنیف نقوی) وغیرہ اس ضمن میں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

ایم۔فل۔ کے دوران راقم الحروف کو تحقیق سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ جب اس فن کی روایت اور ارتقا سے واقفیت کا شوق ہوا تو کوئی ایسی کتاب نظر نہیں آئی جو اس تشنگیِ شوق کے لیے تسکین کا باعث ہوتی۔ البتہ کچھ مضامین ضرور نظر سے گزرے جو اس تشنگی کو اور بڑھا گئے۔ میں نے اپنے اس شوق کا ذکر استاذی شاہد حسین صاحب سے کیا۔ انھوں نے اسی موضوع پر تحقیق کا مشورہ دیا۔ بس پھر کیا تھا، میں نے اس موضوع سے متعلق مواد جمع کرنا شروع کیا۔ ایم۔فل۔ کے بعد پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے لیے میں نے ''اردو میں ادبی تحقیق کی

روایت: ایک تجزیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے خاکہ بنا کر شعبے میں جمع کر دیا۔ شفیق اساتذہ نے شعبے کی میٹنگ میں اس موضوع کی وسعت اور مشکلات سے آگاہ کیا اور کسی دوسرے موضوع پر کام کرنے کا مشورہ دیا مگر میرے شوق اور اصرار کو دیکھتے ہوئے انھوں نے مجھے اس موضوع پر کام کرنے کی اجازت دے دی۔ آج اس کام کی تکمیل کے وقت کام کے مکمل ہونے کی خوشی کم اور اپنی نارسائی کا احساس زیادہ ہے۔

مذکورہ موضوع کی وسعت کو دیکھتے ہوئے میں نے اپنے کام کا دائرہ صرف رجحان ساز اور کل وقتی محققین تک محدود رکھا ہے۔ اگرچہ خاکے میں شامل کئی محققوں کے علاوہ چند اور لوگوں کو بھی مقالے میں شامل کرلیا گیا ہے تاہم کئی قابلِ قدر اربابِ تحقیق اس مقالے کی زینت بننے سے رہ گئے ہیں۔ اسے میری نارسائی اور وقت کی قلت دونوں پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اگر حالات نے ساتھ دیا تو اگلے مرحلے میں اس کام کو آگے بڑھانے پر غور کیا جائے گا۔

مقالۂ ہٰذا پانچ ابواب پر منقسم ہے۔ پہلا باب 'اردو میں ادبی تحقیق کا دور ابتدا سے ۱۹۲۰ء تک' ہے۔ جسے تین ذیلی عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ 'الف' کے تحت تحقیق کی تعریف اور دائرۂ کار کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے لیے اردو محققین کے ذریعے پیش کی گئی تعریفات کے علاوہ ہندی اور انگریزی کے ادیبوں کے تحقیقی نظریات بھی پیش کر دیئے گئے ہیں۔ نیز محققین کے طریقۂ کار کا تعارف بھی کرایا گیا ہے اور نامور محققوں کے طریقۂ تحقیق کی مثالیں بھی پیش کردی گئی ہیں۔ 'ب' کے تحت تحقیق کے ابتدائی نقوش تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور تذکروں کا بطور خاص مطالعہ کیا گیا ہے اور ان میں موجود تحقیقی عناصر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ 'ج' کے تحت اردو تحقیق کے ارتقائی مراحل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس ذیل میں سرسید احمد خان، حالی، محمد حسین آزاد، شبلی، مولوی عبدالحق اور گارساں دتاسی کی تحقیقات کا مطالعہ کیا گیا ہے اور ان کے تحقیقی مقام و مرتبے کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔

باب دوم بعنوان 'اردو تحقیق ۱۹۲۰ء کے بعد' ہے۔ اسے بھی دو ضمنی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (الف) لسانی تحقیق (ب) متنی تحقیق۔ لسانی تحقیق کے ضمن میں محمود شیرانی، نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، سیدہ جعفر، مسعود حسین خان اور پروفیسر عبدالستار دلوی وغیرہ کی تحقیقی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے

اوران کے مقام کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔متنی تحقیق کے حوالے سے قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، مالک رام، نورالحسن ہاشمی کی تحقیقی خدمات کے مطالعے پر توجہ دی گئی ہے۔ باب سوم 'اردو تحقیق کا معاصر منظر نامہ' سے متعلق ہے جس میں ۱۹۸۰ء تا حال ہونے والی تحقیقات کو زیر مطالعہ رکھا گیا ہے۔اس صف میں وہ محقق بھی شامل ہیں جو ۲۰۱۰ء سے پہلے تک وفات پا چکے ہیں اور وہ محقق بھی شامل ہیں جن کی تحقیقات منظر عام پر آ چکی ہیں اور ابھی تک ان کا رشتہ علمی و تحقیقی دنیا سے جڑا ہوا ہے۔ اس میں رشید حسن خان، مختارالدین احمد، کالی داس گپتا رضا، حنیف نقوی، تنویر احمد علوی اور خلیق انجم کا نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔

باب چہارم کو 'چند غیر معروف محققین' کا نام دیا گیا ہے۔اس باب میں ان محققوں کو شامل کیا گیا ہے جن کے تحقیقی کارنامے قابلِ قدر ہیں مگر انھیں کسی سبب ادبی تحقیق میں وہ شناخت نہیں مل سکی جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ان میں نجیب اشرف ندوی، حفیظ الرحمان واصف دہلوی اور عبدالرزاق قریشی کے نام شامل ہیں۔

باب پنجم 'اردو تحقیق: مسائل و امکانات' پر مبنی ہے۔اس باب میں اردو تحقیق کو درپیش مسائل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز اس میدان میں نئے امکانات پر روشنی دالی گئی ہے۔سب سے آخر میں مقالے کا خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے۔ بعد ازاں ان کتب کی فہرست درج کردی گئی ہے جن سے اس مقالے کی تیاری میں کسی صورت بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

اس موقع پر جب یہ مقالہ اپنے تکمیلی مراحل میں ہے، میں استاد گرامی شاہد حسین صاحب کا ممنون ہوں جن کی شفقتیں میرے اس علمی سفر میں زادِراہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔سبکدوش ہونے کے باوجود جب بھی ان سے ملاقات یا فون پر بات ہوئی انھوں نے میرے تحقیقی مشاغل کے بارے میں ضرور دریافت کیا۔انھیں کی ایما پر ان کے سبک دوش ہونے کے بعد میں نے ڈاکٹر محمد آصف زہری کو اپنے تحقیقی سفر کا رہنما منتخب کیا اور یقیناً موصوف میرے لیے ہر اعتبار سے بہترین راہنما ثابت ہوئے۔ میں شکریہ اور احسان مندی جیسے الفاظ استعمال کر کے ان کے خلوص اور بے مثال تعاون سے سبک بار نہیں ہوسکتا کہ ع

اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن

ڈاکٹر سید اشرف بمبئی، ڈاکٹر آمنہ تحسین حیدر آباد، پروفیسر مظفر شہ میری اور پروفیسر عبدالستار دلوی نے میری طلب پر بروقت کتابیں بھیج کر اپنا تعاون دیا۔ان کا شکر ادا نہ کرنا احسان فراموشی ہوگی۔ڈاکٹر فخر عالم

صاحب (ایسوسی ایٹ پروفیسر خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی) سے میں نے ہر مشکل مرحلے میں مشورہ طلب کیا اور موصوف نے ہر مرحلے میں نہایت صائب مشوروں سے نوازا۔ان کی علم دوستی اور خرد نوازی کے لیے شکریہ کا لفظ بہت چھوٹا ہے۔

والدین کو خدا سلامت رکھے۔ان کے وجود سے زندگی میں روشنی ہے۔خدا مجھے ان کی خدمت کی توفیق دے۔شوکت پھوپھا، ابوسعد عرف گڈو بھائی، نور عالم اور ماسٹر ہارون کی محبتوں اور خلوص پر انھیں دل کی گہرائیوں سے ہدیہ خلوص وسلام۔

جے۔این۔یو۔ کے تمام ساتھیوں کا اس طویل علمی سفر میں حق رفاقت ادا کرنے کا بے حد شکریہ۔ خصوصاً تنویر بھائی، اسرار احمد، محمد کوثر علی، معین خان، محمد عمر وقار، آصف اقبال، محمد اعظم اور روی کانت کا جن کے علمی وتحقیقی استفسارات میرے ذوق علم وتحقیق کو مہمیز کرتے رہے ہیں۔ایاز خلیل کے خلوص کا صلہ ممکن ہی نہیں، اس تحقیقی سفر میں جب بھی میرے قلم کی رفتار سست ہوئی اسی نے مجھے لکھنے پڑھنے کی طرف مائل کیا۔

میں نے اس مقالے کی تیاری میں در در کی خاک چھانی ہے۔دہلی کی بیش تر لائبریریوں کا بار بار چکر لگایا، ملک کے دوسرے حصوں میں موجود مواد تک رسائی کی کوشش کی۔کہیں کامیابی تو کہیں ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔محققین کی تمام کتابیں تو دستیاب نہیں ہوسکتی تھیں لہٰذا کئی محققوں کو نظر انداز کرنا پڑا۔ مجھے اپنی ناکامیوں اور نارسائی کا احساس ہے تاہم میں نے پوری ایمانداری اور لگن کے ساتھ مقالے کو اس مقام تک پہنچایا ہے۔ پورے اعتماد کے ساتھ اہل علم کی عدالت میں یہ مقالہ اس احساس کے ساتھ پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں:

ہے گرد گرد لباس وجود دیدہ وراں
یہی غبار مری زندگی کا حاصل ہے

ایاز احمد

جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی

باب اول

اردو میں ادبی تحقیق کا دور اول (ابتدا سے ۱۹۴۷ تک)

(الف) تحقیق کا مفہوم اور دائرۂ کار

(ب) تحقیق کے ابتدائی نقوش (تذکروں میں تحقیقی عناصر)

(ج) تحقیق کے ارتقائی مراحل (ابتدائی محققین)

اردو میں ادبی تحقیق کا دورِ اول (ابتدا سے ۱۹۴۷ تک)

(الف) تحقیق کا مفہوم اور دائرۂ کار:

تجسس انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ وہ ہر اس چیز کے بارے میں جاننے کا خواہش مند ہوتا ہے جس کے متعلق اس کی معلومات مشتبہ ہوتی ہے۔ وہ ذاتی طور پر ان اشیا کی تلاش و تحقیق بھی کرتا ہے۔ انسان نے اپنی اسی خصوصیت کے سبب بڑے بڑے انکشافات اور ایجادات کے معرکے سر کیے ہیں۔ تلاش و تحقیق کے اسی وصف کی بدولت اس نے نئی دنیاؤں کی سیر کی ہے۔ سائنسی ایجادات نے عقل انسانی کو مبہوت کر رکھا ہے۔ تلاش و تحقیق کا یہ سلسلہ ابتدائے آفرینش سے آج تک ہنوز جاری ہے زمانۂ قدیم میں جب علم انسانی محدود تھا۔ اس کے وسائل محدود تھے جس کے سبب اس کی تلاش و تحقیق کے دائرے بھی محدود تھے۔ آج وسائل کی فراوانی نے تحقیق کے نئے نئے در وا کیے ہیں۔ جس سے انسانی زندگی تیز سے تیز تر ہوگئی ہے۔

ہر نئی نسل اپنی سابقہ نسلوں سے کسبِ فیض کرتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے سامنے اپنے ابا و اجداد کے کارناموں کی ایک مفصل تاریخ ہو۔ اس تاریخ کو مرتب کرنے میں ان کے ادبی، سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اقتصادی کارناموں اور دوسرے تاریخی حقائق کو صحیح طور پر جاننے اور مختلف شواہد و دلائل کی بنیاد پر حقائق کی صحت کا تعین کرنا اور اس سے نتائج کے استخراج کا عمل تحقیق کہلاتا ہے۔ تحقیق کی مختلف صورتیں ممکن ہیں جن کا استعمال زندگی کے مختلف شعبوں میں ہوتا ہے۔ سرِ دست ہمیں صرف ادبی تحقیق سے سروکار ہے۔ ادب میں تحقیق کا لفظ ایک اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے جو کسی فن پارے کی صحت و عدم صحت، تعین زمانہ، مصنف اور منشائے مصنف کو جانچنے پرکھنے سے عبارت ہے۔ اس کے علاوہ ادب سے متعلق دوسری چیزیں بھی اس کے دائرۂ عمل میں آتی ہیں۔ تحقیق کو ہمارے علمائے ادب نے ایک مستقل فن کی حیثیت سے برتا ہے۔ اور اس میدان میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں کہ اردو ادب بہت ہی کم عرصے میں عالمی ادب میں اپنا ایک مقام بنا چکا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ علمائے ادب تحقیق کے

بارے میں کیا نظریات رکھتے ہیں۔

مولانا کلب عابد اپنی کتاب 'عماد التحقیق' میں لفظ تحقیق کی تشریح اس طرح کرتے ہیں:

تحقیق کسی شے یا مسئلے کی حقیقت کو دریافت کرنے کا عمل ہے جس میں واقعے کو دلائل وشواہد کی بنیاد پر جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔(۱) ڈاکٹر سید عبداللہ تحقیق کی تعریف ان لفظوں میں کرتے ہیں: ''تحقیق کے لغوی معنی کسی شے کی حقیقت کا اثبات ہے۔ اصطلاحاً یہ ایک ایسے طرز مطالعہ کا نام ہے جس میں موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔''(۲) قاضی عبدالودود کے مطابق: ''تحقیق کسی امر کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔''(۳)

مشہور محقق پروفیسر گیان چند جین تحقیق کی اس تعریف کو ناکافی قرار دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

''اس تعریف کے الفاظ کافی نہیں۔ اگر حقیقت افشا ہے تو اس کی اصلی شکل کو دیکھنا تحقیق نہیں۔ اگر میں میز کرسی پر بیٹھا لکھ رہا ہوں اور گردن گھما کر ایک طرف پڑی کرسی کو دیکھتا ہوں تو یہ کوشش بھی ہے اور کرسی اپنی اصلی شکل میں دکھائی بھی دیتی ہے لیکن یہ تحقیق نہیں۔ کہنا چاہیے جب کسی امر کی اصلی شکل پوشیدہ یا مبہم ہو تو اس کی اصلی شکل کو دریافت کرنے کا عمل تحقیق ہے۔''(۴)

عندلیب شادانی تحقیق کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''تحقیق یعنی ریسرچ کا مطلب یہ ہے، یا تو نئے حقائق دریافت کیے جائیں یا پھر معلومہ حقائق کی کوئی ایسی نئی تعبیر پیش کی جائے کہ اس سے ہماری معلومات میں اضافہ ہو جائے۔''(۵)

جمیل جالبی ہمارے عہد کے مشہور محقق ہیں۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کا بھی نظریۂ تحقیق درج کیا جائے۔ وہ اپنی کتاب 'نئی تنقید' میں صفحہ ٦٦ پر لکھتے ہیں:(٦)

''تحقیق دراصل تلاش وجستجو کے ذریعہ حقائق معلوم کرنے اور ان کے تصدیق کرنے کا نام ہے۔ یہ ایک ایسا

عمل ہے جس سے آپ صحیح اور غلط میں امتیاز کرتے ہیں۔اور پھر صحیح کی مدد سے اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہیں۔''

ایک دوسری جگہ اپنے نظریے کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

تحقیق کا کام سچ کو جھوٹ سے صحیح کو غلط سے الگ کر کے اصل حقیقت کو دریافت کرنا ہے۔اس کا فائدہ یہ ہے کہ تحقیق کے ذریعے کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد جو رائے قائم کی جائے گی یا جو لائحۂ عمل مقرر کیا جائے گا وہ صحیح و درست ہوگا۔''(۷)

اردو میں اصولِ تحقیق مغرب سے آیا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک نظر مغربی محققین کے نظریۂ تحقیق پر بھی ڈالتے چلیں۔انگریزی میں تحقیق کے لیے ریسرچ کا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی توجہ سے تلاش کرنا یا دوبارہ تلاش کرنا ہے،آکسفورڈ ڈکشنری میں اس کے مندرجہ ذیل معنی دیئے گئے ہیں:

۱۔کسی مخصوص چیز یا شخص سے متعلق گہری محتاط تلاش کا عمل۔

۲۔کسی حقیقت کے انکشاف کی غرض سے محتاط غور وفکر یا کسی مضمون کے مطالعے کے ذریعے تلاش یا چھان بین ، ناقدانہ یا سائنسی سلسلۂ تلاش۔

۳۔کسی مضمون کی چھان بین یا مسلسل مطالعہ۔

۴۔دوسری بار یا بار بار کی تلاش۔(۸)

عبدالرزاق قریشی نے کرافورڈ کے حوالے سے اپنی کتاب 'مبادیات تحقیق' میں لکھا ہے کہ:

''اس کی (تحقیق) ابتدا کسی مسئلے سے ہوتی ہے۔پھر وہ مواد جمع کرتی ہے۔اس کا تنقیدی تجزیہ کرتی ہے اور صحیح شہادت کی بنا پر کسی نتیجے پر پہنچتی ہے۔''(۹)

اسی طرح گیان چند جین نے ' فن تحقیق' میں تحقیق کی تعریفات کے ذیل میں شیریڈن (Sheridan) کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

'' ریسرچ کے معنی دوبارہ تلاش کرنا ہے۔یعنی جہاں دوسروں نے

تلاش کی وہیں پھر تلاش کر کے ایسی نئی بات کھوج نکالنا جو دوسرے نہیں ڈھونڈ پائے تھے۔''(۱۰)

ہندی ادب میں بھی اصولِ تحقیق سے متعلق کئی کتابیں ملتی ہیں۔ ان کتابوں میں تحقیق کے مفہوم اور ماہیت کے بارے میں بھی بحث موجود ہے۔ جن کا ماحصل یہ ہے کہ ہندی میں تحقیق کے لیے کئی اصطلاحیں موجود ہیں۔ جن میں انوسندھان اور شودھ زیادہ مشہور ہیں۔ اس لیے ہم ان ہی دونوں اصطلاحوں کی تشریح پر اکتفا کرتے ہیں:

''انوسندھان اس کا مادّہ، 'ودھا' ہے جس کے معنی برقرار رکھنا ہے۔ سندھان کے معنی 'لکش' یا 'نشانہ' ہوتا ہے یعنی مقصود برقرار رکھنا یا نشانہ لگانا۔ انو کے معنی ہیں 'پیچھے' یعنی 'انوسندھان' کے معنی ہوا کسی مقصود یا نشانے کا پیچھا کرنا۔ انوسندھان کے ایک معنی ٹوٹے بکھرے دھاگوں کو جوڑنا بھی ہے۔ 'شودھ' اس کا مادہ شدھ یعنی خالص ہے۔ شودھ کے معنی میل دور کر کے خالص کرنا یا صاف کرنا، جیسے کسی دھات مثلاً سونے کو صاف کیا جائے۔''(۱۱)

ایک ضمنی بات یہ کہ گیان چند جین نے انگریزی، ہندی اور اردو کی اصطلاحوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اردو اصطلاح 'تحقیق' اپنے اندر جو وسیع مفہوم رکھتی ہے وہ ہندی یا انگریزی میں ناپید ہے۔

بہر کیف موجودہ تعریفات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ تحقیق کا مقصد نامعلوم کی تلاش، معلوم کی تصدیق، حقائق کی توسیع اور معلوم کی خامیوں کی تصحیح ہے۔ تحقیق کے نتائج کی صورت میں علم کی توسیع ہوتی ہے اور علم کی توسیع ہی انسانی ترقی کی کلید ہے۔ البتہ تحقیق اتنا مشکل اور خشک کام ہے کہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ اس میدان میں وسیع مطالعہ، سچی لگن، سخت محنت، صبر، استقلال اور بڑے حوصلے کی ضرورت ہے۔ کاہلی، آرام طلبی اور زود یقینی سے اسے ازلی بیر ہے۔ تحقیق ریت نچوڑ کر آب حیات حاصل کرنے کا فن ہے جو لوگ اس فن کی دشواریوں سے کماحقہٗ آگاہی نہیں رکھتے وہ اس صحرائے بے سنگ و میل میں ایڑیاں گھستے

گھستے بے دم ہو کر منھ کے بل گر پڑتے ہیں اور انھیں بجز مایوسی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ یہی سبب ہے کہ اس مسابقتی دور میں بھی اچھے محققین کی تعداد انگلیوں پر شمار کی جا سکتی ہے۔

عبدالرزاق قریشی نے 'کرافورڈ' کے حوالے سے تعلیمی تحقیق کی مندرجہ ذیل نو خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے بعض علمی و ادبی تحقیق کے لیے بھی ضروری ہیں:

۱۔ اس (تحقیق) کا مرکز کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔

۲۔ اس میں کوئی نئی بات کہی جاتی ہے۔

۳۔ اس کا دار و مدار جستجو، پسند، دل اور دماغی رجحان پر ہے۔

۴۔ اس کے لیے کھلے دل و دماغ کی ضرورت ہے۔

۵۔ اس کا انحصار اس مفروضے پر ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں تبدیلی ممکن ہے۔

۶۔ اس کا مقصد قوانین کا انکشاف کرنا اور پھر انھیں عام کرنا ہے۔

۷۔ یہ سبب اور اثر کا مطالعہ ہے۔

۸۔ اس کی بنیاد پیمانہ پر ہے۔

۹۔ اس کے لیے ایک بیدار فنی طریقۂ کار لازمی ہے۔ (۱۲)

تحقیق کا آغاز کسی مسئلے سے ہوتا ہے۔ اس لیے محقق کا اصل مقصد اس مسئلے کا حل تلاش کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ تمام ممکنہ وسائل سے کام لے کر دلائل اور شواہد کی روشنی میں اس کا حل پیش کرتا ہے۔ مثلاً خان آرزو نے اصلاح زبان کا کام کیوں شروع کیا؟ یہ ایک مسئلہ ہے۔ اس کے حل لیے ایک محقق کو اس زمانے کے شعری رجحانات کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ اس کے لیے اس زمانے کے قابل ذکر شعرا کے کلام کا مطالعہ کرنا ہوگا، اس کے لسانی پہلو، فنی و ادبی و معاشرتی پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ کرنا ہوگا۔ نیز خان آرزوؔ کا مقصد و مدعا سمجھنے کے لیے ان کا اور ان کے شاگردوں کے کلام کا مطالعہ بھی ضروری ہوگا۔ تمام مباحث پر مدلل بحث کرنے کے بعد جو نتیجہ نکالا جائے گا۔ اسے سبب اور اثر کا مطالعہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

تحقیقی عمل کے دوران اکثر نئی نئی باتوں کا انکشاف ہوتا رہتا ہے۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو بات

کہی جائے وہ بنیادی طور پر نئی ہو، بلکہ ایک بات جو پہلے کہی جا چکی ہے اس میں جدید معلومات کا اضافہ بھی تحقیق ہے۔ زیرِ بحث موضوع پر نئے زاویے سے روشنی ڈالنا بھی تحقیق ہے اور موجودہ تحقیق میں اگر خامیاں در آئی ہوں تو انھیں دور کرنا بھی تحقیق ہے۔ کسی طے شدہ مسئلے پر دوبارہ روشنی ڈالنا بھی تحقیق ہے۔ اگر ہم اپنی تحقیق کا سرا تلاش کریں تو وہ ماضی کے دھندلکے میں ملے گا۔ کسی چیز کو جو موجود ہوتے ہوئے بھی امتدادِ زمانہ کے سبب نظروں سے اوجھل ہو، دوبارہ سامنے لانا بھی تحقیق ہے۔

تحقیق میں یہ بھی ضروری ہے کہ محقق پہلے یہ معلوم کرے کہ وہ جس موضوع پر تحقیق کرنے جا رہا ہے اس سے پہلے کن کن لوگوں نے اس موضوع پر کام کیا ہے اور ان کے کام کی نوعیت کیا ہے۔ اس سے اسے اپنے موضوع کی افادیت و اہمیت کا اندازہ بھی ہوگا اور اپنی تحقیق میں موضوع سے متعلق نئے گوشے پیدا کرنے کے مواقع بھی میسر ہوں گے۔ نیز تکرارِ مضمون سے بھی محفوظ رہے گا۔ اس کے برعکس اگر محقق نے موضوع کے انتخاب کے وقت اس طرف توجہ نہ کی تو بہت ممکن ہے کہ وہ اپنی تحقیق میں ان ہی باتوں تک رسائی حاصل کر سکے، جہاں تک اہلِ نظر پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔

نئے محققین کو اپنے پیش رو محققین کے کارناموں کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ نو واردوں کے لیے ان کے کارنامے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ نیز اس سے اچھی تحقیق کا شعور بھی پیدا ہوگا۔ اگر ان ماہرین فن کے تجربات یا تجویزیں تحریری صورت میں مل جائیں تو نئے تحقیق کرنے والوں کو اس سے ضرور استفادہ کرنا چاہیے۔

تحقیق میں جذبات یا قیاس آرائی کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔ اسی طرح محقق کے ذاتی خیالات و نظریات اور حمایت و مخالفت کا جذبہ یا پہلے سے قائم کیا گیا نظریہ تحقیق کے لیے سمِّ قاتل ہے۔ محقق کا نقطۂ نگاہ اور طریقۂ کار سائنسی ہونا چاہیے۔ سائنسی نقطۂ نگاہ ہی وہ نقطۂ نگاہ ہے جو مشکوک حقائق سے لطف اٹھا سکتا ہے۔ سائنسی طریقۂ کار کے ذریعے آدمی کسی شک کو واضح تلاش کے عمل میں تبدیل کر کے اس سے نتائج اخذ کر سکتا ہے۔ ہاں! شک کو یقین میں بدلنے کے لیے تجسس پسند اور غور و فکر کرنے والا ذہن درکار رہتا ہے۔ جب آدمی غور و فکر کا عادی ہوتا ہے اور اسے تلاش و تحقیق سے دلچسپی ہوتی ہے تو وہ سات پردوں میں چھپی سچائی کو اپنی

محنت اور کوشش سے بر سر عام لا کھڑا کرتا ہے۔

ایک کامیاب محقق میں مندرجہ ذیل خصوصیات کا ہونا ضروری ہے:

ا۔ایک اچھے محقق کو بلند اخلاق و کردار کا ہونا ضروری ہے۔ قاضی عبدالودود کا قول ہے ’’کسی ملک کے باشندوں کا معیار اخلاق پست ہو اور وہ کام سے جی چراتے ہوں تو وہاں بالعموم تحقیق کا معیار پست ہوگا۔‘‘

۲۔تحقیق محض ایک ادبی مشغلہ ہی نہیں بلکہ ایک طریقۂ زندگی ہے۔ یہ ایک ایسے ذہنی رویے کا نام ہے جہاں جھوٹ، مبالغہ،تعصب اور ایسی تمام چیزوں کا گذر ممکن ہی نہیں ہے جو صداقت پر پردہ ڈال سکتی ہیں۔ ایک محقق کو تمام مصلحتوں سے بے نیاز ہونا ضروری ہے کیوں کہ دوران تحقیق مصلحتیں مختلف صورتوں میں بھیس بدل بدل کر سامنے آتی ہیں۔ کبھی محقق کا ذاتی مفاد تحقیق کی راہ میں آڑے آتا ہے تو کبھی اس کے لواحقین کی ناراضگی کا خوف۔ محقق کے لیے لازم ہے کہ ان ساری مصلحتوں کو پس پشت ڈال کر پوری حق گوئی کا ثبوت دے۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ دوران تحقیق اپنے جذبات پر قابو رکھا جائے اور کسی طرح کے لسانی ، مذہبی یا مسلکی تعصب کو تحقیق کی راہ میں حائل نہ ہونے دیا جائے۔اس سلسلے میں محقق کو غیر جانب داری سے کام لینا چاہیے۔ تحقیق میں ذاتی پسند و ناپسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ محقق کو ہر وقت اس بات کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ دورانِ تحقیق اگر کوئی بات اس کے قائم کیے گئے مفروضے کے خلاف سامنے آتی ہے تو محقق کو چاہیے کہ اسے بلا تامل قبول کرے۔ ہٹ دھرمی اور ضد کو اپنے پاس بالکل پھٹکنے نہ دے۔اور اپنے کام میں کسی دنیاوی یا دینوی فائدے کی تلاش نہ کرے، نہ اپنی محنت کا صلہ چاہے۔ تحقیق خود اس جاں فشانی کا

صلہ ہے جو ایک محقق کو اپنے تحقیق کے ذریعے سرور وانبساط عطا کرتا ہے۔''

کسی بھی آدمی میں محنت اور جفاکشی کی عادت اس وقت تک نہیں آسکتی جب تک کہ اسے کسی کام سے جنون کی حد تک رغبت نہ پیدا ہو۔ تحقیق کے لیے فولادی ارادے کی ضرورت پڑتی ہے جب آدمی کے اندر کسی کام کے کرنے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور وہ اسے کرنے کا عزم کر لیتا ہے تو وہ راہ کی دشواریوں کی پرواہ نہیں کرتا اور بے خوف وخطر اس وادئ پرخار سے گذرتا اپنی منزل مقصود کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ رشید حسن خان نے اپنی کتاب 'ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ' میں محنت اور جاں فشانی کی مثال پیش کرتے ہوئے بندوق خاں کا واقعہ قلم بند کیا ہے۔ طوالت کے خوف سے اسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ البتہ عبدالرزاق قریشی کی کتاب 'مبادیات تحقیق' سے دو مثالیں درج کی جاتی ہیں:

''کیونڈش کی محنت وانہماک کی یہ حالت تھی کہ اس کا دوپہر کا کھانا ایک سوراخ کے ذریعے اس کے کمرے میں رکھ دیا جاتا تھا تاکہ اس کے کام میں خلل نہ پڑے''۔

دوسری مثال انھوں نے سر شیخ عبدالقادر کے حوالے سے حافظ محمود شیرانی کی پیش کی ہے جس سے ان کی محنت و جفاکشی اور سادگی و آرام سے بے نیازی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''گرمی کا موسم تھا اور دوپہر کے بعد کا وقت، وہ ایک ہلکا سا بنیان پہنے ہوئے تھے۔ اور کمر کے گرد صرف ایک چھوٹا سا تہہ بند باندھے بیٹھے تھے، پنکھا نہ دستی نہ بجلی کا، نہ گرمی سے بچنے کی فکر نہ پرواہ۔ کتابیں اور وہ۔ گرد و پیش فرامین اور سکے۔'' (۱۳)

ظاہر ہے اتنی محنت وہی شخص کرسکتا ہے جسے علم حاصل کرنے کا جنون کی حد تک شوق بھی ہو اور اس کا شوق تحقیق اسے ہر لحہ مہمیز بھی کرتا ہو۔ وہ تمام نفع وضرر سے بے نیاز ہو کر صرف اور صرف حقیقت اور سچائی کو اپنا نصب العین بنالے۔ عبدالرزاق قریشی لکھتے ہیں:

''تحقیق کے لیے ذاتی دل چسپی ضروری ہے۔ ذاتی دل چسپی کے بغیر

اعلیٰ درجے کی تحقیق نہیں ہوسکتی۔ تحقیق کا مادی معاوضہ کچھ نہیں ہے۔ اس کا بہترین معاوضہ وہ مسرت ہے جو محقق کو اپنی کامیابی پر ہوتی ہے۔ گیلیلیو طب کا پروفیسر تھا لیکن ریاضی اور علوم طبعی سے دل چسپی کی بنا پر اس نے طب کی معقول مشاہرہ کی پروفیسری چھوڑ دی۔ ہرشیل موسیقار تھا لیکن اسے علم نجوم سے دلچسپی ہوئی اور دوربین بنانے کا شوق ہوا اس لیے وہ موسیقی کو ترک کرکے تحقیق کی طرف مائل ہوا۔ جس کا نتیجہ یورینس سیارہ کی دریافت اور بڑے سائز کی دوربین کی ایجاد تھی۔ ایڈورڈ براؤن کو فارسی ادب سے لگاؤ پیدا ہوا تو انھوں نے طب کو خیر آباد کہا اور اپنی زندگی کا بیش تر حصہ فارسی ادب کی تحقیق میں گذارا اور اس میں وہ کمال حاصل کیا کہ ایران کے علمائے ادب نے اس کی استادی کو تسلیم کیا۔ (مولانا) شبلی نے وکالت کا نفع بخش پیشہ چھوڑ کر علم و ادب کی تحقیق کو اپنایا۔ ان کا شوق تحقیق انھیں مصر و شام و ترکی تک لے گیا۔ (مولانا) سید سلیمان ندوی نے کالج کی آرام دہ اور معقول تنخواہ کی ملازمت ترک کرکے ساری عمر دارالمصنفین کی علمی خانقاہ میں ایک معمولی مشاہرے پر گذار دی۔ ایران کے موجودہ دور کے ایک محقق آقای سعید نفیسی نے طبابت کو تحقیق ادب پر قربان کر دیا تھا۔'' (۱۴)

ایک اچھا محقق ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے مزاج میں استقلال اور صبر کا مادہ ہو۔ عجلت پسندی اور بے صبری تحقیق کو راس نہیں آتی۔ رشید حسن خان نے لکھا ہے'' فارسی کے معروف لغت 'بہارِ عجم' کے مؤلف ٹیک چند بہار نے اس کی جمع و ترتیب پر بیس سال صرف کیے تھے۔'' (۱۵) مولانا امتیاز علی خان عرشی نے حضرت عمر کے خطوط، خطبات اور حکیمانہ اقوال کو جمع کرنا شروع کیا۔ اس کی جمع و تدوین پر انھوں نے چالیس پینتالیس سال صرف کیے۔ پھر بھی وہ کام مکمل نہ ہوسکا۔ (مبادیات تحقیق، ص ۱۵) اس سے اس بات کا بھی ثبوت فراہم ہو جاتا ہے کہ تحقیق کا خاطر خواہ نتیجہ حاصل ہونا اس کی شرائط میں داخل نہیں

بلکہ محقق کو پوری محنت اور جاں فشانی و دیانت داری سے اپنی تحقیق کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہر دم کوشاں رہنا چاہیے۔ اگر کوئی نتیجہ برآمد ہوا تو ٹھیک ورنہ محقق کی علمی صلاحیت میں اضافہ تو ہوگا ہی۔ ایک بات اور یہ کہ محقق کو اپنی علمیت پر غرور نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے مزاج میں منکسر المزاجی کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر وہ کسی دوسرے کی تحریر سے استفادہ کرتا ہے تو اسے اس کے اعتراف میں شرمندگی نہیں محسوس کرنا چاہیے اور اگر کوئی شخص محقق کی غلطیوں پر گرفت کرے تو اسے بخوشی قبول کر کے اپنی اصلاح کر لینی چاہیے۔ ایسا نہ کرنا تحقیقی اصولوں کے مغائر ہے۔ ذہنی اعتبار سے محقق کا غیر مقلد ہونا از بس ضروری ہے جو انسان اپنی آزادانہ سوچ نہ رکھتا ہو وہ تحقیق کے میدان میں دو گام بھی نہیں چل سکتا۔ قدم قدم پر اسے مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ظاہر ہے ایسا شخص اپنے بزرگوں کی کہی ہوئی باتوں پر شک نہیں کر سکتا اور شک ہی وہ کلید ہے جس کے ذریعے تحقیق کے مقفل دروازے وا کیے جاتے ہیں۔ محسن الملک لکھتے ہیں:

> ”تحقیق کرنے والے کو ہر چیز کی تحقیقات کے لیے ضروری ہے کہ جو کچھ لوگوں سے سنا ہو یا جو کچھ اس نے خود سمجھ رکھا ہو اس سے اپنے دل و دماغ کو خالی کر لے اور کسی حقیقت اور صحت پر پہلے سے یقین نہ کرے، اس لیے کہ اگر وہ ایسا کرے گا تو یا تو تحقیق کرنے پر اس کی توجہ نہ ہوگی اس لیے کہ وہ اپنے خیالات کو یقین سمجھ کر اپنے آپ کو مستغنی سمجھے گا یا تحقیقات کرتے وقت اس کو توہمات اور خطرات ایسے پیدا ہوں گے کہ وہ اس تحقیق میں خلل ڈالیں گے۔ ایسی تحقیقات کرنے والے کو چاہیے کہ ان سب باتوں کو جو لوگوں سے سنی ہوں یا جو کچھ اس کے دل میں گذری ہوں پیش نظر رکھے اور بغیر پیدا کرے یقین کے کسی پر وہ ان کی تحقیق کرے تا کہ اس کو خود معلوم ہو کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔“(۱۶)

محقق کے لیے لازم ہے کہ وہ کسی بھی تحریر یا بیان پر فوراً اعتبار نہ کرے بلکہ اس پر غور و فکر کرے اور اس مفروضے کے خلاف مواد اکٹھا کرے پھر اس مواد کی روشنی میں اسے جانچے، پرکھے اور نتائج کا استخراج خود

کرے۔ بعدازاں اپنے تحقیقی نتائج کو پیش کرے۔

ایک اچھے محقق کے لیے ضروری ہے کہ وسیع المطالعہ ہو، اسے اپنے موضوع کے علاوہ دوسرے علوم و فنون سے بھی آگاہی ہو، مثلاً اردو کے محقق کو فارسی ادب کا کماحقہٗ علم ہونا ضروری ہوتا ہے کیوں کہ فارسی زبان ایک مدت تک ہندوستان کی سرکاری زبان رہی ہے اور پورے ملک میں علمی حیثیت سے بھی فارسی کا رواج تھا۔ اس لیے قدیم شعرا و ادبا عموماً فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ اس طرح ہمارا بیش تر علمی سرمایہ فارسی زبان میں موجود ہے جب تک ہمارے محققین کو فارسی زبان پر دسترس نہیں ہوگی، اس سرمایے کو استعمال میں نہیں لایا جاسکتا۔ اردو ادب پر فارسی زبان کے اثرات غالب ہیں اس لیے بھی فارسی زبان کا جاننا بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ عربی زبان کا علم بھی ایک محقق کے لیے مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ اگر کوئی محقق کسی مخصوص عہد پر کام کر رہا ہو تو اسے متعلقہ عہد کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، ادبی اور تاریخی حالات سے واقفیت ہونا ضروری ہے۔ اس طرح ادب اور اس کے ذیلی اصناف اور ان کے محاسن و معائب پر بھی محقق کی نظر ہونی چاہیے۔ قدیم شعرا کا مطالعہ کرنے کے لیے عروض، فلسفہ، تصوف، علم بلاغت وغیرہ کا جاننا نہایت ضروری ہے۔ نیز اس عہد کے دیگر شعرا کے کلام کے مطالعے سے اس خاص عہد کے رجحان شعر گوئی کا مطالعہ بھی ناگزیر ہوگا۔ ان سب کے علاوہ محقق کی زبان و اسلوب پر بھی گرفت ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اپنے تحقیقی نتائج کو شگفتہ اور عام فہم انداز میں پیش کر سکے۔ اگر محقق کو اپنی تحقیق کی پیش کش کا شعور نہ ہو تو اس کی تحقیق محض معلومات کا پلندہ بن کر رہ جائے گی۔ اس کے لیے تخلیقی ذہن، جمالیاتی حس اور تنقیدی نظر درکار ہوتی ہے۔ اس کے بغیر تحریر میں شگفتگی اور سادگی کا اجتماع ناممکن ہے۔

اوپر جن اوصاف کا ذکر کیا گیا وہ جس شخص میں جس قدر پائی جائیں وہ اسی قدر کامیاب محقق ہوسکتا ہے۔ ان تمام صفات کا مطالبہ ایک پختہ کار محقق سے کیا جانا چاہیے۔ البتہ نو واردان تحقیق میں کسی قدر کمی کے ساتھ ان اوصاف کو تلاش کرنا چاہیے۔ اگر نئے محقق میں تحقیق سے دل چسپی، حق گوئی اور بے تعصبی پائی جاتی ہے تو امید کی جاسکتی ہے کہ دیگر اوصاف رفتہ رفتہ از خود اس میں پیدا ہو جائیں گے۔

چوں کہ تحقیق کا عمل انسانی زندگی کے ہر شعبے میں ملتا ہے اس لیے نوعیت کے اعتبار سے ان کی مختلف

اقسام ہوسکتی ہیں تاہم طریقۂ کار کو نظر میں رکھتے ہوئے اسے دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔علمی تحقیق

۲۔عملی تحقیق

علمی تحقیق میں سارے علوم وفنون شامل ہیں۔ان کے طریقۂ کار کو دیکھتے ہوئے انھیں مختلف ذیلی اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جس کا ذکر یہاں مقصود نہیں، البتہ عملی تحقیق جس کا استعمال ادبی تحقیق میں ہوتا ہے اس کی مختلف اقسام کا ذکر ذیل کی سطور میں کیا جائے گا۔

ادبی تحقیق کی تشریح کرتے ہوئے گیان چند جین نے لکھا ہے کہ:

> ''ادبی تحقیق سائنس کی خالص تحقیق کی طرح غیر اطلاقی یا تصوری ہوتی ہے۔اس کا طریقۂ بیش تر تاریخی اور کم تر تجزیاتی ہوتا ہے، اکثر صورتوں میں دونوں طریق مل جاتے ہیں جن میں تاریخی عنصر قدرے زیادہ اور تجزیاتی قدرے کم ہوتا ہے۔''(۱۷)

اگر ہم اردو تحقیق کو اقسام میں تقسیم کرنا چاہیں تو ہمیں اس کے لیے بڑے بڑے زمرے بنانا ہوں گے جو ایک طرح سے موضوعات کے مجموعے ہوسکتے ہیں تاہم تفہیم مطلب کی غرض سے اسے مندرجہ ذیل اقسام میں تقسیم کرسکتے ہیں:

۱۔سوانحی یا تاریخی تحقیق: اس میں کسی ادیب اور اس کی تصانیف سے متعلق تحقیق کی جاتی ہے اس کا عہد، حالات زندگی، خاندانی پس منظر، علمی استعداد اور فکری وفنی امتیازات سے بحث کی جاتی ہے۔یا کسی صنف کے اہم تخلیق کاروں کی تخلیقات کا جائزہ لے کر اس زمانے کے اہم رجحانات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ ادبی تحریکات کا مطالعہ، اس کے اسباب ونتائج وغیرہ سے بحث کرنے کے لیے اسی قسم کی تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے۔

۲۔تنقیدی تحقیق: اس طرح کی تحقیق کا رجحان عام طور پر یونیورسٹیوں میں پایا جاتا ہے۔اس کے تحت معلوم حقائق کا معروضی انداز میں مطالعہ کیا جاتا ہے جسے تنقیدی جائزہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔اس کے لیے موضوعات بھی اسی طرح قائم کیے جاتے ہیں جیسے 'کیفی اعظمی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ'، 'پریم چند کے

ناولوں کا سماجی مطالعہ وغیرہ۔

۳۔تدوین متن: یہ تحقیق کی سب سے کارآمد قسم ہے اس میں کسی قدیم متن کو حاصل کیا جاتا ہے پھر اس کا مختلف زاویے سے مطالعہ کرکے اس کا لسانی تجزیہ کیا جاتا ہے۔مختلف معلوم نسخوں سے تقابل کے ذریعے متن کا تعین کیا جاتا ہے۔اور منشائے مصنف تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس طرح ایک نیا اور مستند متن حاصل کیا جاتا ہے۔تدوین متن اور اس کے طریقہ کار کی بحث آئندہ صفحات میں کی جائے گی۔

۴۔حوالہ جاتی تحقیق:اس طریقۂ کار میں وضاحتی فہرستیں،اشارے اور انسائیکلوپیڈیا وغیرہ تیار کیا جاتا ہے۔

۵۔ بین العلومی تحقیق: اس میں ادب اور کسی دوسرے مضمون مثلاً لسانیات، تاریخ ، سیاسیات، سماجیات ، معاشیات وغیرہ کے مشترک موضوعات پر تحقیق کی جاتی ہے۔تحقیق کی مندرجہ بالا اقسام کو اور بھی ذیلی قسموں میں تقسیم کرکے ان کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے،لیکن ادبی محقق کو جس قسم سے سب سے زیادہ سابقہ پڑتا ہے، وہ تدوین متن ہے۔اردو کی جامع تاریخ مرتب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے کلاسیکی متون کے مستند ایڈیشن ہمارے سامنے ہوں اور یہاں یہ حال ہے کہ مستند ایڈیشن تو دور کی بات ہے،اب تک کلاسیکی متون کا ایک بڑا حصہ اپنی تدوین کے انتظار میں لائبریریوں اور کتب خانوں میں پڑا ہے۔اب تک قدیم تحریروں کے جو متن زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں ان کا تحقیقی معیار اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ایسی حالت میں جو بھی ادبی تاریخ مرتب ہوگی ، وہ باوجود کوششوں کے نامکمل اور ناقص ہوگی اور اس کی بنیاد پر جو نتائج نکالے جائیں گے وہ انتہائی گمراہ کن ہوں گے۔اس لیے ہمارے ادبی محققین کو اس طرف فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

قدیم متون کی ترتیب جس محنت اور عرق ریزی کا تقاضا کرتی ہے وہ ہمارے یہاں تقریباً ناپید ہے۔ اول تو ان تحریروں کو بہت مشکل سے پڑھا جاسکتا ہے دوسرے یہ کہ مختلف ادوار میں مختلف خطوط رائج تھے، جیسے خط شکستہ، خط گلزار وغیرہ۔اب ان خطوط کے پڑھنے والے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔کلاسیکی متون کی ترتیب میں ایک دقت یہ بھی ہے کہ اکثر تحریروں میں فارسی اشعار اور ضرب الامثال وغیرہ کا استعمال ہوا ہے۔ فارسی سے عدم واقفیت کے سبب ہم اکثر ان اشعار وغیرہ کی قرات تک غلط کرتے ہیں۔صحیح سمجھنا تو دور کی بات ہے۔ایسی حالت میں ترتیب وتدوین کی دشواریوں کا صرف اندازہ ہی کیا جاسکتا ہے۔اگر اس طرف خاطر

خواہ توجہ نہ دی گئی تو اندیشہ ہے کہ مستقبل قریب میں ہمیں اپنے ماضی کے ادبی سرمایے کے ایک بڑے حصے سے محروم ہونا پڑے گا۔

ہمارے اسلاف کو اپنے اس ادبی سرمایے کی اہمیت کا احساس بہت پہلے سے تھا اسی غرض سے انھوں نے بہت سارے متون کو مرتب بھی کیا تھا مگر وسائل کی کمی اور ترتیب متن کے اصولوں سے عدم واقفیت کے سبب اکثر متن درجۂ استناد کو نہیں پہنچتے۔ بیسویں صدی کے ربع دوم سے اس طرف خاطر خواہ توجہ کی گئی ہے۔ نتیجتاً کئی ایسے متن سامنے آئے جن میں تحقیق و تدوین کے اصولوں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، خواجہ احمد فاروقی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، رشید حسن خان وغیرہ نے ترتیب متن میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں جن پر اردو ادب بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ ان بزرگوں نے اردو میں تحقیق کے رجحان کو عام کیا اور اردو تحقیق کی دنیا میں کئی نام ابھر کر سامنے آئے۔

تحقیق و تدوین کی دشواریوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اس فن سے متعلق کئی رسالے تحریر کیے گئے جن میں 'رہبر تحقیق' شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی اور ماہنامہ 'آج کل' دہلی کا اردو تحقیق نمبر خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ نیز اس فن سے متعلق کئی مستقل کتابیں بھی معرض وجود میں آئیں جن میں تحقیق و تدوین کے اصولوں سے بحث کی گئی ہے۔ اس ضمن میں 'مبادیات تحقیق' مؤلفہ عبدالرزاق قریشی 'متنی تنقید' از ڈاکٹر خلیق انجم، 'اردو میں اصول تحقیق و ترتیب متن' مؤلفہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، 'عمادۃ التحقیق' مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، 'تحقیق کا فن' از پروفیسر گیان چند جین، 'ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ' مصنفہ رشید حسن خان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تحقیق کے طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ تحقیقی مزاج رکھنے کے ساتھ ساتھ اسے تحقیق کے اصولوں کا علم بھی ہو۔ اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ہو اور اسے قدیم قراتوں کا علم بھی ہو۔ نیز مختلف ادوار میں تبدیل ہونے والی املائی صورتوں پر بھی اس کی نگاہ ہو۔ ہم ذیل میں تدوین متن کی راہ میں پیش آنے والی مختلف منزلوں کی نشان دہی کرتے ہیں:

متن کا انتخاب: تدوین متن کے سلسلے میں سب سے پہلا مرحلہ انتخاب متن کا ہے۔ ایک محقق جس متن کی تدوین کرنا چاہتا ہے، اسے سب سے پہلے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس کے اس کام سے اردو ادب میں کیا

اضافہ ہوسکتا ہے۔ نیز جس متن کو وہ ترتیب دینا چاہتا ہے، اس کی اور صاحب متن کی ادبی حیثیت کیا ہے۔ اور اس کے اس کام سے موجودہ متن اور مصنف کی حیثیت پر کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ جب محقق اس موضوع سے پوری طرح مطمئن ہو جائے جس پر وہ کام کرنا چاہتا ہے تو اسے معلوم کرنا چاہیے کہ مذکورہ موضوع پر مواد کہاں کہاں اور کس حالت میں ہے اس کے لیے اسے مختلف لائبریریوں اور ذاتی کتب خانوں سے رجوع کرنا چاہیے۔ نیز اپنے حلقۂ ارباب میں اس کام سے متعلق مشورہ کرنا چاہیے۔ بعض اوقات ہمیں اپنے کام کے متعلق مواد کا علم ایسے ذرائع سے ہو جاتا ہے جہاں سے اس سلسلے کی کوئی امید بھی نہیں ہوتی۔

جب موضوع سے متعلق بہت سارا مواد اکٹھا ہو جائے تو محقق اس سارے مواد پر پھر سے غور و فکر شروع کرے اور جب اسے یہ اطمینان حاصل ہو جائے کہ اب اسے کام شروع کر دینا چاہیے تب وہ نسخوں کا تقابلی مطالعہ شروع کرے۔ بعض اوقات ایک ہی متن کے متعدد نسخے دستیاب ہو جاتے ہیں جو بہت ساری الجھنوں کا سبب بنتے ہیں۔ ایسی صورت میں محقق تمام نسخوں کا موازنہ کر کے ایک نسخے کو اپنی تحقیق کی بنیاد بناتا ہے اور دوسرے تمام نسخے تقابل کے کام آتے ہیں۔ اول الذکر کو بنیادی نسخہ یا بنیادی ماخذ اور موخر الذکر کو ثانوی ماخذ قرار دیا جاتا ہے۔

مواد اکثر دو صورتوں میں حاصل ہوتا ہے، ایک تو مطبوعہ اور دوسرا قلمی یعنی ہاتھ کا لکھا ہوا۔ مطبوعہ مواد کی قرات اور تفہیم نسبتاً آسان ہوتی ہے، تاہم مختلف ایڈیشنوں میں ترمیم و تحریف اور حذف و اضافہ کا امکان بنا رہتا ہے، جو محقق کے لیے الجھن کا باعث ہوسکتا ہے۔ اس کے برعکس قلمی نسخوں کا معاملہ ذرا اور پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ یہ مصنف کے اپنے ہاتھوں کا لکھا ہوا بھی ہوسکتا ہے اور اس کے کسی قریبی دوست اور عزیز کے ہاتھ کا بھی ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اکثر نسخے ان منشیوں کے ہاتھ کے بھی ہو سکتے ہیں جنھیں اسی خدمت پر مامور کیا جاتا تھا۔ ایسی صورت میں محقق کو بہت حزم و احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے۔ کچھ نسخے ایسے بھی ہوتے ہیں جو خود مصنف کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے تو نہیں ہوتے مگر اس کی نگرانی میں تیار کیے ہوئے ہوتے ہیں یا اس کی نظر سے گذر چکے ہوتے ہیں اور ان پر مصنف کی اصلاحات و اضافے اور مصنف کا اپنا دستخط بھی موجود ہوتا ہے۔ ایسے نسخے کو بنیادی ماخذ کی حیثیت سے تسلیم کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ یہ کہ مصنف کے اپنے ہاتھوں کا لکھا

ہوا نسخہ موجود نہ ہو۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ موجود مواد مختلف حیثیتوں کا حامل ہوتا ہے۔ بعض تو بہت معتبر و مستند اور بعض ناقص ہوتے ہیں۔ محقق کو اپنی علمی وتنقیدی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ان نسخوں میں امتیاز کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے محقق کی ذراسی بے احتیاطی سے اس کی ساری کوششوں پر پانی پھر سکتا ہے۔ لہٰذا نئے محققین کو لازم ہے کہ وہ تحقیق وتدوین کے مسائل سے حتی المقدور آگاہی حاصل کریں۔ نیز اپنے اسلاف کے تحقیقی کارناموں پر بھی نگاہ رکھیں۔

تنقید متن: جب ہم کسی متن کی ترتیب وتدوین کے لیے بہت سارا مواد اکٹھا کر لیتے ہیں اور ایک ہی متن کے کئی نسخوں میں اختلاف متن کے سبب اصل متن تک پہنچنے میں محقق الجھنوں کا شکار ہوتا ہے تو ایسے میں محقق کی تنقیدی بصیرت اس کے لیے مشعل راہ کا کام دیتی ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ادبی تنقید اور متنی تنقید دو الگ چیزیں ہیں اور متنی نقاد یا محقق کو متنی تنقید ہی سے سروکار رہتا ہے۔ متنی نقاد یا محقق کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ موجودہ متن اپنی صحیح صورت اور مکمل صحت کے ساتھ منظر عام پر لایا جائے۔

متن جس قدر زیادہ قدیم ہوتا ہے اس کی تدوین میں اسی قدر دشواریاں پیش آتی ہیں۔ زیادہ قدیم ہونے کی صورت میں اختلاف نسخ، الحاق، سرقہ اور توارد وغیرہ کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لیے محقق کو ہر لمحہ محتاط رہنا پڑتا ہے۔ اسے اس عہد (جس عہد کے متعلق تحقیق کی جاتی ہے) کے پورے ادبی منظرنامے کا علم ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس زمانے کا املا نیز اس سے پہلے اور بعد کے طرز املا پر اس کی گہری نگاہ ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ اس زمانے کے سماجی، سیاسی، معاشی اور تاریخی پس منظر بھی کسی متن کی صحت کے تعین میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اس لیے محقق کے لیے لازم ہے کہ وہ ان ساری چیزوں کا گہرائی سے مطالعہ کرے۔ مصنف کے حالات زندگی پر بھی گہری نظر رکھنی ہوگی۔

تنقید متن کا مقصد کسی متن کو اس کی صحیح صورت میں دیکھنا ہے۔ ہمارے اسلاف کے ادبی کارنامے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہیں یا بہت سارے ادبی فن پارے جو مطبوعہ صورت میں ملتے تو ہیں لیکن طویل عرصہ گذر جانے کے باعث نیز مسلسل نقل در نقل کے سبب ان میں بہت کچھ حذف و اضافہ ہو چکا ہے۔ سہو کتابت کے سبب بھی

بہت ساری خامیاں ان متون میں راہ پا گئی ہیں۔ کچھ لوگوں نے کسی خاص مقصد کے تحت بھی کبھی کبھی متن میں تحریفات کی ہیں۔ متنی نقادان تمام باتوں کا معروضی اور موضوعی مطالعہ کرتا ہے اور اپنے علم کی بنیاد پر ان تمام امور کی نشان دہی کرتے ہوئے متن کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ تنقید متن کے سلسلے میں انھیں دونوں طرز مطالعہ سے کام لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''معروضی مطالعے میں آنے والے امور کو ہم دو عنوانات کے تحت رکھ سکتے ہیں۔ ا۔ متنی معارض۔ ۲۔ متنی مواقف۔ متنی معارض میں کسی نسخے کی ہیئت، اس کی تقطیع، سطر، تعداد، اوراق یا صفحات، خالی ورق یا صفحے (اگر ہوں)، کاغذ، قلم، روشنائی، رسم کتابت، تزئین، مہریں، دستخط جیسے امور موضوع گفتگو بنتے ہیں۔ نو دریافت متن کی صورت میں ان کی دریافت کی کہانی اور اس سے متعلق ضروری باتیں بھی جن میں افسانوی اندازِ فکر، جذباتی لب ولہجہ اور تاثراتی طرز گفتار سے امکانی طور پر بچنے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں آسکتی ہیں۔ متنی مواقف میں نسخہ کے مشمولات (اور شعری متون کی صورت میں مختلف اصناف سخن کا ذکر) اس موقع پر تعداد اشعار بھی اگر دے دی جائے تو بہتر ہے۔ غیر تصنیفی حواشی (اگر موجود ہوں) اصلاحات، قلم زد سطور یا منسوخ اشعار (بشرط یہ کہ ایسی کوئی صورت موجود ہو) نیز زمانۂ تالیف، تاریخ کتابت، تکملہ، خاتمہ، تتمہ، ترقیمہ، تعلیقات وقطعات وغیرہ میں سے جو بھی اس متن میں شامل ہوں، اس پر مناسب حدود کے ساتھ بحث وغیرہ امور آتے ہیں۔'' (۱۸)

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان اصطلاحات کا بھی اجمالی تعارف پیش کر دیا جائے جو تدوینِ متن کے سلسلے میں استعمال کی جاتی ہیں۔

ترمیم: نامعلوم اسباب کے تحت ہونے والی تبدیلیاں جن میں سہو نظر اور لغزش قلم کے علاوہ کاتب کی شعوری

اور غیر شعوری کوششوں کا بھی دخل ہوسکتا ہے۔

تعبیر: اگر مصنف اپنی تحریر یا تصنیف میں کوئی ایسی عبارت لکھ جاتا ہے جو مبہم اور غیر واضح ہوتی ہے جس سے تحریر کے مفہوم تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے۔ ایسے مواقع کبھی خود مصنف اور کبھی کاتب وغیرہ وضاحت کے لیے کچھ عبارتیں بڑھا دیتے ہیں۔ اسے تعبیر کہتے ہیں۔

تنسیخ: اس عبارت کو کہتے ہیں جسے مصنف جان بوجھ کر منسوخ کر دیتا ہے۔

تصحیح: خود صاحب متن اپنی خواہش اور مقصد کے مطابق عبارت میں کوئی تبدیلی کرے اسے تصحیح کہتے ہیں۔

تصحیف: اگر صاحب متن کے علاوہ کسی دوسرے شخص نے متن یا اجزائے متن میں دانستہ طور پر کوئی تبدیلی کی ہو تو اسے تصحیف کہیں گے۔

تکملہ: وہ ضمیمہ یا اجزائے متن ہیں جو متن کی تکمیل کے بعد اضافے کے طور پر شامل کیے گئے ہوں۔

خاتمہ: وہ اختتامی عبارت ہوتی ہے جو مصنف یا کاتب یا مرتب کتاب کے آخر میں سپرد قلم کرتا ہے۔ کچھ قدیم مطبوعہ کتب و رسائل میں خاتمے کے عنوان سے مرتبین و ناشرین کی عبارتیں بھی ملتی ہیں جو نسخے سے متعلق بعض امور کے بارے میں ہوتی ہیں۔

ترقیمہ: یہ نقل کرنے والے شخص کی عبارت ہوتی ہے، جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ نسخہ کب اور کہاں نقل کیا گیا، اور نقل کرنے والا کون تھا۔ وہ کون کون سے محرکات تھے جن کے سبب اس نے یہ کام انجام دیا۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ کسی ترقیمے میں ساری باتیں موجود ہوں۔

تعلیقات: وہ یادداشتیں ہوتی ہیں جو کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل کر دی جاتی ہیں۔

تخریج: تدوین کے دوران ایسے کلام یا عبارت کی نشان دہی کرتے ہوئے اسے اصل عبارت سے خارج کرنا، جن کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ یہ کلام یا عبارت مصنف کی نہیں بلکہ دوسروں کی ہیں جو کسی سبب موجودہ متن میں شام ہوگئی ہیں۔

متنی تنقید: جیسا کہ پچھلے صفحات میں عرض کیا گیا کہ کسی تحریر کو خواہ وہ کہیں سے حاصل ہو، متن کہلائے گی۔ تحریر کے دریافت ہو جانے کے بعد اگلا مرحلہ اس کے درست اور نادرست ہونے کا ہے۔ نیز یہ بھی جاننے کی ضرورت پڑتی ہے کہ دریافت شدہ تحریر کا نسخہ مستند ہے یا نہیں۔ عموماً قدیم تحریروں اور قلمی نسخوں میں تحریر کے مسخ

ہونے کا پورا پورا امکان رہتا ہے۔ نیز سرقے اور جعل سازیاں اور الحاقی تحریر کے بھی امکانات باقی رہتے ہیں۔ متنی نقاد کا کام ایسی تحریروں کا سائنٹفک مطالعہ کرنا اور مصنف کے اصل الفاظ تلاش کرنا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ متنی تنقید کا اصل مقصد حتی الامکان متن کو اصل روپ میں دوبارہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اصل روپ سے مراد متن کی وہ شکل ہے جو مصنف اپنی تحریر کو دینا چاہتا ہے۔ بقول ڈاکٹر خلیق انجم:

> ''جب ہم متن میں کوئی غلطی دیکھتے ہیں اور اس غلطی کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس عمل کو متنی تنقید کہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں متن کی غلطیاں دریافت کرنے اور ان غلطیوں کو درست کرنے کے فن کو متنی تنقید کہتے ہیں۔ اس فن کی بنیاد فہم وادراک اور عام سوجھ بوجھ پر ہے۔''(۱۹)

متنی تنقید کے فن کو سکہ بند اصولوں پر نہیں پرکھا جا سکتا۔ اس فن کے اصول وقت اور ضرورت کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔ کسی حتمی اصول کی بنیاد پر اگر کسی تحریر کو پرکھا جائے تو متن میں غلطیوں کے امکانات بڑھ جائیں گے کیوں کہ زبان کی لسانی پیچیدگیاں، اس کی صرفی ونحوی ساخت اور املا کی صورتیں مختلف ادوار میں بدلتی رہتی ہیں۔ نیز ہر فنکار کا اپنا جداگانہ اسلوب ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں کاتب سے بھی غلطیوں کے سرزد ہونے کا امکان ہر وقت بنا رہتا ہے۔ کبھی کبھی کاتب شعوری طور پر بھی اصل تحریر میں تبدیلی کر دیتا ہے جس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ کسی سکہ بند اصول پر کاربند ہو کر کوئی نقاد نہ تو ان غلطیوں کو دور کر سکتا ہے اور نہ ہی منصب تنقید سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ ہر تحریر کو درست کرنے کے لیے اسے اپنے فہم و ادراک اور شعور و وجدان کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کسی بھی متن کو درست کرنے کے تین مدارج ہوتے ہیں:

۱۔ تیاری اور مواد کی فراہمی
۲۔ متن کی تصحیح
۳۔ قیاسی تصحیح

اس سے پہلے کہ ہم متنی تنقید کے مذکورہ مدارج پر بحث کریں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ متنی تنقید کی ادب میں کیا اہمیت ہے۔

کسی متمدن اور ترقی یافتہ قوم کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اسے اپنے اسلاف کے کارناموں کا صحیح علم ہوتا ہے اور بسا اوقات وہ ان کارناموں سے استفادہ بھی کرتی ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ ''باتیں اگر دہرائی نہ جاتیں تو کب کی ختم ہوگئی ہوتیں۔'' انسانی زندگی کا کوئی کارنامہ ایسا نہیں ہے جو اپنے ماضی سے کوئی رشتہ نہ رکھتا ہو۔ دنیائے علم وفن کی ہر شاخ اپنے ماضی سے گہرا رشتہ رکھتی ہے۔ آئے دن کی ہر نئی ایجاد اپنے ماضی سے استفادے کی بنیاد پر ہی ظہور پذیر ہوتی ہے اور اپنے لیے مستقبل میں بھی ترقی کے دروازے کھولتی ہے۔ اگر ہم اپنے زمانے کی کسی بھی ایجاد پر غور کریں تو ہمیں اس میں کچھ ایسا ضرور ملے گا جو ہماری ماضی کی زندگی کا حصہ رہا ہے۔ انسانی زندگی کی ترقی کی رفتار اس وقت سے تیز ہونی شروع ہوئی جب اس نے اپنے خیالات و تجربات کو ضبط تحریر میں لانا شروع کیا۔ کاغذ اور مختلف چیزوں پر لکھی ہوئی تحریریں ہماری ماضی کی بازیافت کا اہم ترین حصہ ہیں۔ اسی کے ذریعے ہم انسانی تاریخ کے نشیب وفراز سے آگاہ ہوتے ہیں۔ یہیں سے متنی تنقید کی اہمیت شروع ہو جاتی ہے۔

بعض کم ظرف لوگ یہ کہتے ہیں کہ ماضی کی کسی تحریر میں ایک آدھ لفظ بدل جانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ انھیں شاید اس بات کی سنگینی کا اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ نقل در نقل سے متن کس حد تک بگڑ سکتا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی کتاب 'متنی تنقید' میں اس کی متعدد مثالیں دی ہیں۔ خوف طوالت سے اسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ البتہ چند اہم نکات یہاں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ تحریر کا وہ مفہوم نہ رہے جو مصنف کہنا چاہتا ہے۔

۲۔ تحریر کا وہ مفہوم نکلے جو مصنف کے عقائد کے خلاف ہو۔

۳۔ تحریر کا مفہوم الجھ جائے۔

۴۔ تحریر بے معنی ہو کر رہ جائے۔

۵۔ تحریر میں ایسی تبدیلی ہو جائے جو منشائے مصنف کے خلاف ہو۔

۶۔ تبدیل شدہ لفظ ایسا ہو جو مصنف کے عہد میں متروک ہو چکا ہو۔

۷۔ تحریر میں کوئی ایسا بھی لفظ شامل ہو سکتا ہے جو مصنف کے عہد کے بہت بعد رائج ہوا ہو۔

متنی تنقید کا پہلا مرحلہ انتخاب متن ہے۔یعنی نقاد سب سے پہلے یہ طے کرے کہ اسے کس تحریر کا تنقیدی ایڈیشن تیار کرنا ہے۔عبدالرزاق قریشی لکھتے ہیں:

''نوجوان محقق موضوع کا انتخاب کرنے سے پہلے اپنے آپ سے مندرجہ ذیل سوالات کرے تو یہ اس کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں:

ا۔کیا یہ موضوع اس لائق ہے کہ اس پر تحقیق کی جائے۔

۲۔کیا اس موضوع پر تحقیق مکمل ہو سکتی ہے۔

۳۔کیا اس موضوع پر میرے لیے تحقیق کرنا ممکن ہے۔

۴۔کیا اس موضوع پر میں تحقیق کر سکتا ہوں۔''(۲۰)

ڈاکٹر خلیق انجم کا خیال ہے کہ متنی نقاد کو اور اگر کوئی نگراں ہو تو دونوں کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ:

ا۔کیا طالب علم میں متن کا تنقیدی ایڈیشن کرنے کی قابلیت،مہارت اور استعداد ہے۔

۲۔کیا وہ قدیم زبان پر قدرت رکھتا ہے۔

۳۔اگر وہ شاعری کے متن کا تنقیدی ایڈیشن تیار کرنا چاہتا ہے تو کیا وہ موزوں طبع ہے اور ناموزوں مصرعوں کی نشان دہی کر سکتا ہے۔

۴۔یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ اس متن سے متعلق بنیادی مواد موجود ہے بھی یا نہیں۔

۵۔صرف کسی مخطوطے کے مل جانے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس کا تنقیدی ایڈیشن تیار کیا جائے۔ممکن ہے کہ تاریخ کے نقطۂ نظر سے اس مخطوطے کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو۔

۶۔یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ طالب علم مصنف کے عہد کے سیاسی،سماجی اور تاریخی واقعات سے واقف ہے یا نہیں۔

۷۔طالب علم اور اس کے نگراں کو یہ ضرور دیکھنا چاہیے کہ کیا اس متن کا تنقیدی ایڈیشن تیار کرنے سے ادبی تاریخ کو کوئی فائدہ پہنچے گا یا نہیں۔اور کیا تاریخ ادب اردو میں اس کے مصنف اور اس متن کی کوئی اہمیت ہے یا نہیں۔

متنی نقاد کو کسی متن کی تنقید کرنے سے پہلے کچھ تیاریاں کرنی پڑتی ہیں جنھیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

۱۔متنی نقاد کو لازم ہے کہ وہ مختلف عہد کے منتخب نسخوں کو پڑھے تا کہ اسے مختلف زمانے کی تحریروں کو پڑھنے پر عبور حاصل ہو سکے۔

۲۔متنی نقاد کو اس عہد کی ادبی تاریخ پر پورا عبور ہونا چاہیے۔جس عہد کے متن کا وہ تنقیدی ایڈیشن تیار کرنا چاہتا ہے۔

۳۔اس عہد کی ادبی تاریخ پر پورا عبور ہونا چاہیے جس سے تنقیدی ایڈیشن تیار کرتے وقت الحاقی کلام اور تحریف وغیرہ کی نشان دہی کرنے میں آسانی ہو۔

جب متنی نقاد کسی متن کا تنقیدی ایڈیشن تیار کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے سب سے پہلے اس متن کے تمام معلوم نسخوں تک رسائی حاصل کرنا چاہیے۔اس کے علاوہ اس کتاب پر اور اس کے مصنف کے حالات اور فن پر جس قدر مضامین دوسروں نے تحریر کیے ہوں ان سب کا علم حاصل کرنا متنی نقاد کے لیے ضروری ہے۔ جب تک متنی نقاد تمام ممکنہ نسخے اور مصنف کے حالات کے بارے میں معلومات نہ حاصل کر لے اسے کام شروع نہیں کرنا چاہیے۔مواد کی فراہمی کے سلسلے میں اسے ان لائبریریوں کے کیٹلاگ دیکھنے جانا چاہیے جن کے کیٹلاگ چھپ چکے ہیں۔دوسری صورت میں اسے خود لائبریریوں تک جانا چاہیے، جن کے کیٹلاگ نہیں چھپے ہیں مگر وہاں نقاد کے موضوع سے متعلق مواد ملنے کی امید ہو۔سہولت کے مطابق ان لائبریروں کے چکر بھی لگانا چاہیے جہاں مواد ملنے کے امکانات کم ہوں۔کیوں کہ بعض اوقات وہاں ہمارے کام کا ایسا مواد مل جاتا ہے جس کی ہمیں پہلے سے توقع نہیں ہوتی ہے۔

بعض ایسے ادبی گھرانوں سے بھی تعلقات قائم کرنا چاہیے جہاں قدیم زمانے کے مخطوطات و مطبوعات ملنے کی امید ہو کیوں کہ اکثر ہمارا ادبی ورثہ، وراثتاً ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہتا ہے۔مصنف کے دوست، رشتہ دار، شاگرد اور ان سب کی اولاد سے متنی نقاد کا ملنا بہت ضروری ہوتا ہے۔عام طور پر ان کے پاس مصنف سے متعلق بہت سی دستاویز ہوتی ہیں یا انھیں مصنف کے بارے میں بہت سی ایسی معلومات ہوتی ہیں جن کا ذکر تحریری طور پر کہیں نہیں ملتا۔

ایک سے زیادہ نسخوں کی موجودگی میں نسخوں کی درجہ بندی کرنی ہوگی۔ایک نسخے کو بنیادی نسخہ مان کر

باقی نسخوں کا بنیادی نسخے سے تقابل کیا جائے گا۔نسخوں کی درجہ بندی اور تقابل کے طریقے پر تفصیلی بحث ڈاکٹر خلیق انجم،تنویر احمد علوی،عبدالرزاق قریشی اور گیان چند جین نے اپنی کتابوں میں کی ہے۔

تحقیق متن: تدوین متن کے سلسلے میں اگلا مرحلہ تحقیق متن کا آتا ہے۔اس میں مندرجہ ذیل امور اساسی اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۔متن کے حدود کا تعین کرنا۔

۲۔الحاق واضافات کی نشان دہی کرنا۔اس کے ذیل میں تصرفات اور غلط انتساب کا مطالعہ بھی آجاتا ہے۔

۳۔اگر متن ناتمام ہو اور اس کے باقی حصوں کے موجود ہونے کے شواہد ملتے ہوں تو متن کے گم شدہ حصوں کی بازیافت کرنا۔

۴۔متنی حقائق کی جستجو اور چھان بین۔

ترتیب متن کے نقطۂ نظر سے متنی ہیئت کی دو بہت ہی واضح صورتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ایک منضبط متن کی صورت میں اور دوسری منتشر متن کی صورت میں۔منضبط متن اس متن کو کہتے ہیں جس کی ہیئت کا تعین فی الجملہ ممکن ہو۔اس کی ایک صورت تو یہ ہوسکتی ہے کہ جو متن ہمیں دستیاب ہوا ہے اس میں مصنف نے خود تقسیم ابواب،فہرست مطالب،تشریح مضامین، اصناف وابیات کی نشان دہی اور اس نوعیت کی دوسری وضاحتیں کر دی ہوں۔دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ مصنف نے ایسا کچھ نہ کیا ہو مگر موجودہ متن کو دیکھ کر مذکورہ باتوں کا تعین کیا جاسکے،اور اس کے ذریعے مصنف کے دائرۂ کار اور سبب تصنیف کا پتہ لگایا جاسکے۔ اس کے برعکس منتشر متن ایسے متن کو کہا جاتا ہے جس کے مختلف اجزا یا آثار تمام وکمال صورت میں اپنے اصل کے ساتھ موجود نہ ہوں اور منتشر حالت میں ادھر ادھر پائے جاتے ہوں۔اکثر اشعار کے مجموعوں اور کبھی کبھی قصص وحکایات کے ساتھ بھی یہ صورت موجود ہوتی ہے۔بہت قدیم نسخوں میں یہ صورت زیادہ پائی جاتی ہے جن کے اوراق دست برد زمانہ کے ہاتھوں یا تو ضائع ہو چکے ہوتے ہیں یا پھر مختلف جگہوں پر جستہ جستہ پائے جاتے ہیں۔انھیں تلاش کرنا اور ترتیب دینا اکثر اوقات ناممکن ہوتا ہے۔

منضبط متن بھی کبھی مکمل حالت میں ہوتا ہے اور کبھی نامکمل۔نامکمل حالت کبھی متن کی عدم تکمیل کی

طرف اشارہ کرتی ہے (جس کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں) اور کبھی غیر موجود حصے کے ضائع ہو جانے کی۔ اول الذکر کی مثال میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے مفتی صدرالدین آزردہ کے تذکرے کو پیش کیا ہے جس کا واحد قلمی مخطوطہ ردیف نون پر ختم ہو جاتا ہے اور اس کی کوئی دوسری روایت بھی موجود نہیں ہے۔ ایسی صورت میں امکان ہے کہ خود مسودہ تکمیل سے محروم رہا ہو۔ عدم تکمیل کی ایک دوسری مثال حیدر بخش حیدری کے 'تذکرۂ گلشن ہند' سے دی جا سکتی ہے جو آج بھی برٹش میوزیم میں اپنی خستہ حالت میں موجود ہے۔ اس میں سوز کے ترجمے کے بعد کی مندرجہ ذیل سطور (جو خاتمہ کے طور پر درج کتاب ہے) ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اپنی کتاب میں درج کی ہے:

> ''احوال مولف اس احقر نے موافق اپنی محنت و مشقت کے چھ سات برس میں ان بزرگوں کے نام مع اشعار و تخلص جمع کیے اور کئی جز بخوبی تمام لکھے۔ افسوس یہ ہے کہ وہ تمام جز حرف 'ش' سے لے کر تا حرف 'ی' خدا جانے کیا ہوئے، اس واسطے نوبت تحریر 'ی' حرف تک نہ پہنچی۔ ان شاءاللہ اگر زمانہ اس صورت سے قدرے رفاقت کرتا ہے تو یہ خاکسار پھر نئے سرے سے احوال ان شعرا کا خاطر خواہ لکھتا ہے۔'' (۲۱)

عام حالات میں بعض مصنف یا شاعر ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے رشحات قلم خود ان کی بے توجہی کے سبب دست برد زمانہ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے کلام ذوق کو پیش کیا ہے۔ موجودہ زمانے میں اقبال سہیل کا کلام اس کی نمایاں مثال ہے۔ ایسے میں دستیاب متن کی حیثیت مکمل متن کی نہ ہو کر حاصل شدہ متن کی ہوتی ہے۔ ایک مرتب متن کا فرض ہے کہ وہ کسی متن کو تحقیقی طور پر ترتیب دیتے وقت ان باتوں کا خاص خیال رکھے کہ دستیاب متن حاصل شدہ متن ہے یا صاحب متن کا انتخاب شدہ متن ہے۔ نیز متن کے غیر موجود حصے کی دستیابی کی صورت میں اس کی کیا حیثیت ہوگی۔ تحقیقی ترتیب کے لیے مرتب متن کو ان سارے امور کا خیال رکھنا ہوگا۔

عام حالتوں میں یہ فیصلہ کہ کسی متن کی صحیح حدود کیا ہونی چاہیے۔ دستیاب متن کے کسی معتبر نسخے کو سامنے رکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ متن کے تحقیقی تعین کے لیے مختلف قلمی اور مطبوعہ نسخوں کا

تقابلی مطالعہ ضروری ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مصنف کے قلمی نسخے، جسے بنیادی نسخے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے، کے علاوہ دوسرے نسخوں پر کلی طور پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ایسے تمام نسخوں میں حذف و اضافہ اور الحاق وغیرہ کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

الحاق کے مختلف و متنوع اسباب ہو سکتے ہیں۔ کبھی تو نام یا تخلص کی یکسانیت سے ایک شاعر کا کلام دوسرے سے منسوب ہو جاتا ہے اور کبھی تصانیف کی ہم نامی یا ہم آہنگی اس کا سبب ہوتی ہے۔ ایسا اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی غیر معروف شاعر کا کلام اسی تخلص کے کسی معروف شاعر سے منسوب ہو جاتا ہے۔ فکری یکسانیت بھی اکثر اس کا سبب ہوتی ہے۔ دوسرے شعرا کے بہت سارے اشعار صرف فکری مماثلت کے سبب اقبال سے منسوب کر دیئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مشہور شعر ہے ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اس شعر کو عام طور پر اقبال سے منسوب کیا جاتا ہے جب کہ یہ شعر جعفر علی خاں اثرؔ کی ایک نظم کا آخری شعر ہے۔ صرف تخلص کی مماثلت کے سبب غلط انتساب کی ایک بڑی مثال 'خالق باری' ہے، جو ایک مدت تک حضرت امیر خسرو سے منسوب رہی اور آج بھی بہت سارے لوگ اسے امیر خسرو کی تصنیف مانتے ہیں، جب کہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ امیر خسرو کی نہیں بلکہ عہد جہانگیر کے شاعر ضیاء الدین خسرو کی تصنیف ہے۔ غلط انتساب اور الحاق کی یہ صورتیں نظری فروگزاشتوں یا تسامح کے نتیجے میں پیش آ سکتی ہیں۔ ایسا یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ایک سے زیادہ کتب یا رسائل ایک ہی مجلد میں ہوں تو اس کا امکان رہتا ہے کہ نقل کرنے والا کسی تصنیف کو دوسرے مصنف سے منسوب کر دے۔ یہ اس صورت میں بھی ممکن ہے جب کہ سرورق یا امتیاز پیدا کرنے والی کوئی دوسری صورت موجود نہ ہو۔

الحاق کی ایک صورت سرقہ یا تصرف بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی متعدد اور متنوع مثالیں علم و ادب کی تاریخ میں مل جاتی ہیں۔ ابھی ۲۰۰۵ء کا واقعہ ہے۔ اعظم گڈھ میں ایک بڑے بزرگ شاعر ہادیؔ اعظمی رہتے ہیں۔ ان کے کلام کا قلمی نسخہ چوری ہو گیا۔ بات اخبارات کے ذریعے مشتہر کر دی گئی۔ بعد میں یہ نسخہ ایک جعلی شاعر

کے پاس سے برآمد کرلیا گیا۔

اس کے برعکس الحاق کے سلسلے میں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ کوئی شخص خود اپنی مرضی سے اپنی تصنیف دوسرے کسی فرد کے نام سے منسوب کر دیتا ہے۔کبھی اس کا مقصد خوشنودیٔ مزاج یا علمی وادبی نذرانہ پیش کرنا ہوتا ہے اور کبھی اس کے ذریعے کسی فرقے کے معتقدات کی تشہیر ہوتی ہے۔اسلاف پرستی بھی اس کا ایک بڑا سبب ہے۔کبھی کبھی بعض لوگ اپنے کلام کو مقبول عام دیکھنے کے جذبے کے تحت اپنے کلام کو مشاہیر کے نام سے منسوب کر دیتے ہیں۔اکثر اوقات یہ کام حصول زر کی خاطر بھی انجام دیا جاتا ہے۔شعری بخششوں کی ایک دوسری نوعیت کی مثال مصحفی کے سلسلے میں مولانا محمد حسین آزاد نے پیش کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''سن رسیدہ لوگوں کی زبانی سنا کہ دو تین تختیاں پاس دھری رہتی تھیں۔ جب مشاعرہ قریب ہوتا تو ان پر اور مختلف کاغذوں پر طرح مشاعرہ میں شعر لکھنے شروع کرتے تھے اور برابر لکھتے جاتے تھے۔لکھنؤ شہر تھا۔ عین مشاعرہ کے دن لوگ آتے...جہاں تک کسی کا شوق مدد کرتا، وہ دیتا۔یہ اس میں سے ۹/۱۱/۲۱ شعر کی غزل نکال کر حوالہ کر دیتے۔ان کے نام کا مقطع کر دیتے تھے۔''(۲۲)

اس سے مختلف نوعیت کی مثالیں بھی ادبیات کی تاریخ میں مل جاتی ہیں۔اس ضمن میں میر آثر کی مثنوی 'خواب وخیال' کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔جس میں خود مولف کے اپنے بیان کے مطابق سلسلۂ غزلیات میں خواجہ میر دردؔ کے عطا فرمودہ تقریباً دوسو اشعار موجود ہیں۔معاصرین کے کلام میں اس طرح کے خلط ملط کی اور بہت ساری مثالیں مل سکتی ہیں۔

متنی روایت کے اخذ واستنباط پر تحقیقی گفتگو کرنے کے لیے متن کے عہد اور اس سے قبل کی پوری ادبی و تہذیبی روایات کا علم ہونا نہایت ضروری ہے۔اس کی ایک مثال 'مذہب عشق' یا قصۂ گل بکاؤلی سے پیش کی جاسکتی ہے۔جس کے مرتب خلیل الرحمٰن داؤدی نے اس کے مختلف اجزائے ترکیبی کے مآخذ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

''۱۔تاج الملوک کوگل بکاؤلی کی مہم سے باز رکھنے کے لیے دلبر بیسوا اسے برہمن اور شیر کی حکایت سناتی ہے۔ یہ حکایت پنچ تنتر کے دکنی نسخے سے ماخوذ ہے۔اس کہانی کو دیا شنکرنسیم نے گلزارنسیم میں بیان نہیں کیا ہے۔

۲۔تاج الملوک نے اپنے چاروں بھائیوں کو دلبر بیسوا کی قید سے رہائی دلائی لیکن وہ بھائی بعد میں اس سے غداری کرتے ہیں۔ یہ حصہ الف لیلیٰ سے لیا گیا ہے۔الف لیلیٰ میں شہزادہ خداداد کے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی کیا گیا ہے۔

۳۔ پھول یا کسی اور چیز کے آنکھوں میں لگانے کے بعد بصارت کی واپسی کا تصور حضرت یعقوب کے قصے میں میں موجود ہے۔

۴۔ایک لڑکی دیو سے جنس تبدیل کر کے مرد بن جاتی ہے۔ یہ مہا بھارت کے ادھرگ پرب سے ماخوذ ہے۔ جنس بدلنے کی مثالیں بیتال پچیسی کی چودھویں کہانی کے سلسلے میں دریافت کی جا چکی ہیں۔

۵۔اس داستان میں جو طلسم ہے، وہ ان طلسمات سے مختلف نہیں ہے جو داستان امیر حمزہ اور بوستان خیال میں مذکور ہیں۔

۶۔اس داستان میں راجہ اندر کی محفل اس اندر سبھا سے مختلف نہیں ہے جس کا ذکر سنسکرت کی قدیم کتابوں میں ملتا ہے۔

۷۔کامروپ میں انسان کو جانور بنا دینے کی روایت اس داستان سے پہلے موجود تھی۔

ان داخلی شہادتوں کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ اس داستان کی اصل ہندوستان ہے، لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ یہ کتاب کسی سنسکرت یا برج بھاشا کی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے۔ (مذہب عشق، ص ۲۷۔۲۵ بحوالہ اردو میں اصول تحقیق وترتیب متن ص ۱۰۵۔۱۰۴) تحقیقی روایت سے متعلق ایک نہایت اہم مسئلہ کسی نسخے کے اصلی یا جعلی ہونے کا ہے۔اس کی ایک دلچسپ مثال مالک رام نے 'آج کل' کے تحقیق نمبر میں پیش کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

> '' پچھلے دنوں قاضی عبدالودود صاحب نے ایک جعلی متن سے متعلق
> بتایا۔ بہار کی پرانی خانقاہ عمادیہ کی تولیت اور سجادہ نشینی سے متعلق کچھ

اختلاف پیدا ہو گیا۔ بنائے اختلاف یہ تھی کہ ایک فریق کا دعویٰ یہ تھا کہ دوسرے فریق کے معتقدات فاسد اور بانی خانقاہ کے عقائد سے مختلف ہیں، اس لیے وہ تولیت کے حق دار نہیں۔ اس پر تمنا عمادی مجیبی پھلواری کہیں سے ایک رسالہ دریافت کر کے لائے، جس کا عنوان تھا 'سیدھا راستہ'۔ دعویٰ یہ کیا گیا کہ یہ دستاویز خود عماد الدین قلندر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اس سے ایک فریق کے عقائد کی تائید ہوتی تھی اور دوسرے کی تغلیط اور غالباً اسی بنا پر تولیت کا فیصلہ ہو گیا۔

اس رسالے کی علمی اور ادبی حیثیت یہ تھی کہ اس پر تاریخ ربیع الاول ۱۰۸۱ھ درج تھی۔ جو جولائی ۱۶۷۰ء کے مطابق ہے۔ اس طرح یہ تحریر شمالی ہند کی سب سے قدیم اردو نثر قرار پاتی ہے۔ کربل کتھا بھی اس کے بعد کی چیز ہے۔ یہ رسالہ ایسی چالاکی سے مرتب کیا گیا تھا اور اس کی زبان بہار کی پرانی بول چال کے اس حد تک مطابق تھی کہ بڑے بڑے صاحب نظر اس سے دھوکا کھا گئے۔ چنانچہ اس کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر قاضی عبدالودود صاحب نے اسے اپنے رسالے معیار کی اشاعت مارچ ۱۹۲۶ء میں شائع کر دیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تحریر جعلی ہے اور اس کا جعل صرف ایک لفظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے ترقیمے کی فارسی عبارت ملاحظہ ہو: 'الحمدللہ کہ این رسالہ در مدت دو روز حسب فرمائش اہل خانہ خود در زبان مروجہ دیار خود نوشتہ کہ مردمان و زنان ناخواندہ را در زبان مادری ایشاں ذریعہ معلومات ضروریہ دینیہ گردد و برائے من ذخیرۂ آخرت شود'۔ اگرچہ یہ پوری عبارت ہی اکھڑی اکھڑی سی ہے لیکن اس میں کلیدی الفاظ 'زبان مادری' کے ہیں۔ یہ ترجمہ ہے انگریزی کی ترکیب 'مدر ٹنگ' کا جو اس ملک میں انگریزی تعلیم عام ہونے کے بعد رائج ہوئی۔ دور اورنگ زیب میں اس کے

استعمال کا کیا امکان ہے۔''(۲۳)

متنی حقائق اور چھان بین کے سلسلے میں اس نوعیت کی اور بھی مثالیں مل سکتی ہیں۔ اصل سوال حقائق کی چھان بین کا ہے اور اس کا سارا انحصار مرتب متن پر ہوتا ہے۔ رہی بات تحقیق کے اصولوں کی تو اصول تحقیق پر مبنی کتابوں کو پڑھ کر ان کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے اور سب سے بہتر تو یہ ہے کہ اب تک جو معیاری متن مرتب ہو کر ہمارے سامنے آ سکے ہیں ان کے مطالعہ سے تحقیق کے بہت سارے مسائل از خود سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ اس ضمن میں رشید حسن خان، مولانا عرشی، مالک رام اور دوسرے مرتبین کی کتابیں مشعل راہ کا کام دے سکتی ہیں۔

تصحیح متن: کسی متن کی ترتیب و تدوین کا سب سے اہم مرحلہ جو سب سے زیادہ دقت نظر اور انضباط فکر و خیال کا تقاضا کرتا ہے وہ متن کی تصحیح ہے۔ یہاں کسی استاد کی اصلاح کی ضرورت نہیں، بلکہ مصنف کے دریائے فکر میں غوطہ خوری کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہاں کسی متن کو خوب سے خوب تر بنانے کی خواہش میں ذاتی یا مروجہ متن کے معیار کے مطابق کسی متن یا اس کی روایت کو بدلا نہیں جاتا بلکہ بدلے ہوئے متن یا کسی غلطی کے سبب دائرۂ تحریر میں آ جانے والی کسی روایت کو اس کی اپنی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

تصحیح متن کا فریضہ انجام دینے والے کے لیے لازم ہے کہ وہ مصنف کے منھ میں اپنی زبان رکھنے کی کوشش نہ کرے۔ بلکہ مصنف کے معیار زبان و ادب اور اس عہد کی ادبی و لسانی صورت حال کے مطالعے کی روشنی میں متن کو اس کی اصلی شکل میں پیش کرے۔ اگر چہ وہ متن موجودہ زمانے کے ادبی و لسانی مزاج کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ مرتب متن کے لیے لازم ہے کہ وہ امکانی سطح پر تحقیق و تفحص کی راہ سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ اکثر متون میں غیر شعوری طور پر مصنف اس طرح کی فروگزاشتوں اور لغزشوں کو خود درست کر دیتا ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یا تو تحریر پر نظر ثانی کی نوبت ہی نہیں آتی یا نظر ثانی کے وقت بھی نظر چوک جاتی ہے اور لکھنے والے کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا اور غلطی نظر ثانی کے باوجود موجود رہتی ہے۔

اکثر غلطیاں کاتب حضرات کی کرم فرمائیوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ کاتب اکثر اپنی کم علمی کی بنیاد پر غلطیاں کرتا رہتا ہے۔ بارہا تو ایسا ہوتا ہے کہ مصنف کی کوئی عبارت کاتب کی سمجھ میں نہیں آتی اور وہ اس عبارت کی جگہ اپنی طرف سے کوئی عبارت لکھ دیتا ہے جس کے سبب منشائے مصنف خبط ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نظری غلطیاں بھی متن کو مسخ کر دیتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی مسودے کو نقل کرتے ہوئے ایک ہی سطر کو دوبارہ لکھ جاتے ہیں یا سہو نظر کے سبب کوئی سطر لکھنے سے رہ جاتی ہے۔ اس طرح دونوں صورتوں میں متن میں نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ املا کے مسائل بھی ترتیب متن میں بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی کاتب کوئی ایسا املا دے جاتا ہے جو مصنف اور اس دور کے مروجہ املا کے لحاظ سے غلط ہوتا ہے۔ کبھی کسی لفظ یا عبارت کی اصلاح و درستگی کے وقت دوسری صورت تو لکھ دی جاتی ہے لیکن پہلی صورت یا اس کا کوئی حصہ قلم زد ہونے سے رہ جاتا ہے اور اس طور پر صحت کے ساتھ عدم صحت یا نا درستگی کی صورت بھی موجود رہتی ہے۔

یہ اور اسی نوعیت کی بعض دوسری تحریری غلطیاں اس قدر عام ہیں کہ ان کے لیے کسی سند یا شہادت کی ضرورت نہیں پڑتی لیکن اس طرح کی غلطیوں کے تصفیہ کے لیے بہت احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے۔ ممکن ہے جسے ہم غلطی سمجھ رہے ہوں وہ دراصل غلطی نہ ہو بلکہ اس زمانے کا عام مزاج ہی یہی ہو اور ہمارا قیاس ہمیں دھوکا دے رہا ہو۔ کسی مخطوطہ، قلمی نسخہ یا قدیم مطبوعہ روایت میں شامل کسی متن یا حصۂ متن، لفظ یا عبارت کی صحت و عدم صحت کے سلسلے میں کسی حتمی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے خارجی و داخلی وسائل کی قطعی و قابل اطمینان شہادت درکار ہوتی ہے۔ اس کے لیے مصنف کی زبان، اس کی صرفی و نحوی ساخت، اس کے عہد کے تلفظ، ادبی محاورے و شعری جوازات کو سمجھنا ہوتا ہے کہ مصنف کے اپنے زمانۂ زندگی، اس کے علمی و ادبی ماحول میں کس بات کو کس طرح پر کہنے کا رواج تھا۔ اور خود اس کا اپنا لسانی حلقہ، ذاتی علمی معیار اور ادبی مقام کیا تھا۔

کسی نسخہ کے زمانۂ تحریر اور زمانۂ کتابت سے اس کے متن کی خواندگی اور تصحیح کے متعدد مسائل وابستہ ہوتے ہیں۔ بیش تر نسخوں کے اسالیب تحریر اپنے زمانے کے انداز نگارش کی بہت سی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ اسی کے ساتھ کسی تحریر کی اپنی انفرادی خصوصیات اور ممتاز پہلوؤں کو بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ ان امتیازات اور خصائص کو جانے بغیر کسی روایت کی قرأت، اس کی صحت و سقم سے آگاہی اور اس کے

خوب وناخوب سے متعلق کسی نتیجے پر پہنچنے میں غلطی ہوجانے کا امکان بنا رہتا ہے۔اور جب تک کسی نسخے کی صحت کے ساتھ خواندگی ممکن نہ ہواس کی تصحیح یا صحت متن کی تصدیق کے لیے کسی فیصلے پر پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔ صحت قرأت، متن کی تصحیح کے لیے ایک ایسی اساسی ضرورت اور بنیادی شرط ہے جس سے کسی طرح صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

کسی متن کا تحقیقی مطالعہ پورے انہاک اور یکسوئی کا مطالبہ کرتا ہے۔سرسری مطالعہ ترتیب متن کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے ۔اغلاط کتابت یا تبدیلیٔ روایت کے متعدد ومتنوع صورتیں اسی سرسری مطالعے یا ذہنی کاہلی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔کاتب یا تو کسی لفظ ،کلمہ یا روایت کی صحیح صورت سے ناواقف ہوتا ہے یا بسا اوقات صحت تک پہنچنے یا اس کو جاننے کی ضروری سعی وکاوش کے بغیر جس لفظ یا جس روایت کو وہ اپنے طور پر صحیح سمجھتا ہے اس کے اندراج کے بعد آگے بڑھ جاتا ہے۔یہ اعتباری فیصلہ لفظ کی کسی ظاہری ہیئت کی نقل محض سے جس کی طرف کاتب کا ذہن منتقل ہوجاتا ہے کسی معنی میں مختلف نہیں ہوتا۔پروفیسر گیان چند جین نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''عبارت کی نقل میں کاتبوں نے بڑی غلطیاں کی ہیں۔یہ اکثر تو اس زبان کو نہ جاننے کے سبب ہوتی ہیں جس کی وہ عبارتیں ہیں۔کبھی اس میں سہو وتساہل کو بہت کچھ دخل ہوتا ہے۔کبھی کاتب یا نقل بردار اسے اپنے لب ولہجے اور تلفظ کا پابند کردیتا ہے۔ایسا کبھی دانستہ کیا جاتا ہے کبھی نادانستہ۔اور اس ضمن میں اسے یہ خیال بھی نہیں رہتا کہ اس متن کی تصنیف وتالیف کے مقام اور زمانے کے اعتبار سے اس کی اور اصل متن کی زبان میں جو فرق ہے وہ اس صورت میں بالکل نظرانداز ہوگیا ہے''۔(۲۴)

ایک مصنف اپنے زمانۂ زندگی میں اگر اسے موقع ملتا ہے اور اس موضوع سے اس کی دل چسپی قائم رہتی ہے تو وہ اپنے کسی متن کو برابر زیرنظر رکھتا ہے اور اس طرح اصلاح واضافہ اور ترمیم کے عمل سے گزر کر کوئی متن ایک روایت سے دوسری روایت کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔کبھی کبھی کسی فرمائش یا وقتی ضرورت کے

پیش نظر بھی تبدیلیِ روایت عمل میں آتی ہے۔ بہت سے قصیدوں، تحسینی عبارتوں اور کتب ورسائل کے قدیم متون میں اس کی ضرورت اس لیے بھی پیش آتی ہے کہ انداز بیان اور مذاق سخن میں تیز رفتار تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، جس کا اثر براہ راست ادبی زبان پر پڑتا ہے۔ طریق فکر اور اسلوب ادا کے علاوہ زمان و مکان کے فرق کے ساتھ مسائل و مباحث بھی بسا اوقات بدل جاتے ہیں۔ اس لیے ایک روایت اپنی قابل ترجیح صورت میں دوسری روایت کو منسوخ قرار دے دیتی ہے۔

ماحصل اس تمام گفتگو کا یہ ہے کہ کسی متن یا روایت کی تصحیح کے لیے اس علم وفن اور اس زبان پر دسترس رکھنا ضروری ہے جس سے وہ مخطوطہ یا کتاب یا مسودہ متعلق ہے۔ قدیم متون کی تصحیح کے سلسلے میں زبان میں عہد بہ عہد جو تغیرات ہوئے ہیں، جو اصلاحات عمل میں آئی ہیں، جن لسانی حلقوں کے مابین اس زبان کو نشو ونما پانے کا موقع ملا ہے اور اس کے طرز املا میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں، ان کا احتیاط سے مطالعہ کرنا اور تحقیقی طور پر سمجھنا ضروری ہے۔ زبان اور طرز املا کی تبدیلیاں اور کسی لفظ میں شامل حروف کے ہجا کا خلط ملط ہو جانا اکثر اختلاف نسخ کا باعث بنتا ہے۔ مصنف کی اپنی روایتوں میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے لیکن زیادہ تر اختلاف کا باعث ایسی غلطیاں ہوتی ہیں جو کتابت کی لغزشوں اور لفظوں کی قرأت میں سہو وخطا سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگر بہ نگاہ غور دیکھا جائے تو یہ اختلاف اختلاف بھی نہیں ہوتا بلکہ سہو کتابت سے پیدا شدہ ایک صورت حال ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک نسخے میں کسی موقع پر (سے) ہے اور دوسرے میں (ہے) ہے۔ بظاہر یہ دونوں الگ الگ صورتیں ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک شوشہ زائد مل جانے سے ایسی صورت پیدا ہوگئی ہے۔

اسی طرح 'زور' معمولی سی تبدیلی سے 'اور' پڑھا جا سکتا ہے۔ اور کوئی ایسا کاتب جو نقل کرتے ہوئے احتیاط سے کام نہ لے، یا نوک قلم زود نگاری کی صورت میں درمیانی حروف کے بجائے آخری حروف کو چھو جائے تو اسے 'زور' کے بجائے 'زرد' بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے دیوان ممنون کے قلمی نسخے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ دیوان کے قلمی نسخوں میں ''ہے زور رنگ تیرے کشتوں کی گفتگو کا'' یوں بھی لکھا ہے'' ہے اور رنگ تیرے کشتوں کی گفتگو کا'' ایک نسخہ میں ''ہے زرد رنگ'' بھی لکھا ہوا ہے۔ اسی طرح 'نے' کو

نقطہ کی عدم موجودگی میں 'لے' بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ یا 'کسے' کو 'کتے' اور 'کتنے' اور 'کتتے' بھی پڑھ سکتے ہیں۔ یا اگر 'رکھا' کہیں تشدید کے ساتھ لکھا گیا ہو ہو تو تشدید کو دو نقطے سمجھ کر 'رکھتا' بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

اس طرح صوری مماثلت کے باعث بھی بعض اوقات الفاظ ایک دوسرے کی جگہ لے لیتے ہیں۔ قدیم نسخوں میں 'نیں' بمعنی 'نے' لکھا گیا ہے، جسے غلطی سے بعض کاتبوں نے 'میں' پڑھ لیا ہے۔ ایسا ہی التباس مینے (میں نے) اور مجے (مجھے) کی صورت میں ہوا ہے۔ کبھی کبھی حروف کی تقدیم و تاخیر بھی عجیب سی صورت حال پیدا کر دیتی ہے۔ جیسے رواں کو واؤ کی تقدیم کے ساتھ وراں بھی بنا دیا گیا۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی کاتبوں نے قدیم اور متروک الفاظ کی جگہ اس سے ملتا جلتا کوئی دوسرا لفظ رکھ دیا ہے۔ کبھی کبھی تحریر یصاف نہ ہونے کی صورت میں یا نسخوں کے کرم خوردہ ہونے کے سبب بعض لفظوں کو ان سے ملتے جلتے الفاظ کی شکل میں پڑھ لیا جاتا ہے۔ جیسے محبس کو مجلس پڑھ لیا جائے۔ مگر اس کے مقابلے میں تابع کو طابع لکھنا اور الف کو علف تحریر کرنا سہو سماعت اور لغزش کتابت کے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے۔

مرتب متن تمام دستیاب نسخوں کی مدد سے جو متن تیار کرتا ہے اسے ہم مصنف کے متن سے قریب ترین تصور کریں گے لیکن بات یہیں مکمل نہیں ہوتی۔ ابتدا میں ہم نے کہیں لکھا ہے کہ مرتب متن کا اصل مقصد اس متن کی بازیافت ہے جو مصنف اپنی تحریر کو دینا چاہتا تھا۔ فرض کیجیے، مرتب متن نے تصحیح متن کے لیے اس متن کا بھی استعمال کیا ہے جو خود مصنف کا دستخطی نسخہ ہے یا اس کی نگرانی میں لکھا گیا ہے اور مصنف نے خود اس نسخے پر نظر ثانی کی ہے۔ اتنی حک و اصلاح کے باوجود ہمارے تیار کیے ہوئے متن میں بعض قرأتیں ایسی رہ جاتی ہیں جو مشکوک ہوتی ہیں۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم نے ان قرأتوں کو جوں کا توں رہنے دیں، عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ ہمیں مصنف کا جو دستخطی نسخہ ملتا ہے، وہ پہلا مسودہ نہیں ہوتا۔ مصنف کا اپنا اصل مسودہ جو غیر مرتب اور خام حالت میں ہوتا ہے اور جس میں ترمیم و تنسیخ اور حذف و اضافے ہوتے ہیں، مصنف اسے خود ضائع کر دیتا ہے۔ گویا مرتب متن کو جو دستخطی نسخہ حاصل ہوتا ہے وہ بھی نقل در نقل ہوتا ہے۔ اس لیے خود مصنف سے بھی ان غلطیوں کا احتمال ہے جو متنی نقاد یا کاتب سے سرزد ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی کتاب 'متنی تنقید' میں امتیاز علی خاں عرشی کے حوالے سے دیوان غالب کے نسخۂ لاہور میں اس طرح کی غلطیوں کی نشان

دہی کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''اندرونی شہادت ثابت کرتی ہے کہ اسے اول سے آخر تک مرزا صاحب نے پڑھا ہے اور اکثر جگہ کاتب کی اصلاح بھی کی ہے۔ تاہم بہت سی خطی غلطیاں اب بھی موجود ہیں مثلاً:

ا۔ 'کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا خیال' یہاں حوادث کا یہ حال ہونا چاہیے۔

۲۔ 'نہ سنو گر برا کہے کوئی نہ کہو گر برا کہے کوئی' دوسرے مصرعے میں ردیف کرے کوئی ہونی چاہیے۔

۳۔ 'رہ گیا خط چھاتی پر کھلا' یہ مصرع یوں ہونا چاہیے: رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

۴۔ 'شاہ آگے دھرا ہے آئینہ' مصرعہ یوں ہے: 'شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ''(۲۵)

یہ نسخہ غالب کی نگرانی میں ان کے خاص کاتب نواب فخر الدین محمد خاں دہلوی کا لکھا ہوا ہے اور پھر غالب نے نظر ثانی بھی کی ہے۔ اس کے باوجود اوپر دی گئی غلطیوں کے علاوہ بھی بہت سی خطی غلطیاں موجود ہیں۔ اب فرض کریں دیوان غالب کا صرف ایک ایسا نسخہ ملتا ہے جس کا غالب سے تعلق رہا ہے اور وہ نسخۂ لاہور ہے۔ ایسی صورت میں جو متن تیار ہوگا، اس میں وہ تمام غلطیاں رہ جائیں گی جو نسخۂ لاہور میں ہیں۔ اب ہمارے سامنے دو راستے ہیں ایک تو یہ کہ جو متن تیار ہوگا، اس کو آخری سمجھ کر بعض بے معنی شعروں میں مطلب ڈالنے کی کوشش کریں۔ جن مصرعوں میں الفاظ کا حذف یا اضافہ ہوا ہے ان کے آگے سوالیہ نشان لگا کر حاشیہ دے دیں کہ مصنف نے اسی طرح لکھا تھا۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم وہ متن حاصل کرنے کی کوشش کریں جو مصنف کے ذہن میں تھا اور جو وہ لکھنا چاہتا تھا۔ ہمیں یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم جن لوگوں کے لیے یہ متن تیار کر رہے ہیں ان میں مشکل سے ایک فیصد لوگ ہمارے حاشیوں میں دلچسپی رکھتے ہیں اور باقی صرف اس مصنف کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے دوسرا طریقہ اگرچہ مشکل اور دقت طلب ہے لیکن

مفید ہے اوراس کے لیے ہمیں قیاسی تصحیح کا کا سہارا لینا پڑے گا۔

جو متن ہم مرتب کرنا چاہتے ہیں اگر اس کے بہت سے نسخے ملتے ہیں تو عام طور پر تنقیدی ایڈیشن کی مشکوک قرأتوں کا مسئلہ انتخاب کے ذریعے حل ہو جاتا ہے۔ لیکن اصل مشکل اس وقت ہوتی ہے جب ہم ایسا متن مرتب کر رہے ہوں جس کا صرف ایک نسخہ ملتا ہو، ایسے نسخے میں قیاسی تصحیح کی تعداد اچھی خاصی ہوتی ہے۔ جب ایسی صورت حال ہو تو ہمیں ہر لمحہ یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ہمارے تنقیدی ایڈیشن میں کوئی قرأت ایسی نہ آنے پائے جو مصنف کے اصل مفہوم کو بدل دے یا عبارت کو بے معنی کر دے۔

اگرچہ قیاسی تصحیح کا کام بہت مشکل ہے۔ اس کے لیے مرتب کی علمی صلاحیت اور مصنف کے زمانے کی زبان اور اسلوب پر گہری نگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ مرتب کی تنقیدی صلاحیتوں کا صائب ہونا ضروری ہے۔ مذکورہ صفات کے ساتھ اگر کوئی مرتب متن اس کام کا بیڑا اٹھاتا ہے اور پوری لگن اور دلچسپی کے ساتھ اس کام کو انجام دینے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے لیے یہ کام قدرے آسان ہو جاتا ہے۔ بشرط یہ کہ اس نے مصنف کے عہد کی زبان، اس کا طرز بیان، بعض لفظوں کے بارے میں مصنف کی اپنی پسند ناپسند، اس زمانے کا خاصی ادبی رجحان اور مصنف کے انداز فکر کا گہرا مطالعہ کیا ہو۔

حواشی

۱۔ پروفیسر کلب عابد، عماد التحقیق، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۷۸ء، ص ۱۴

۲۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، تحقیق و تنقید، مشمولہ ادبی و لسانی تحقیق، مرتبہ عبدالستار دلوی، بمبئی ۱۹۸۴ء، ص ۱۱۷

۳۔ قاضی عبدالودود، اصولِ تحقیق، مشمولہ ادبی و لسانی تحقیق، مرتبہ عبدالستار دلوی، بمبئی ۱۹۸۴ء، ص ۷۷

۴۔ ڈاکٹر گیان چند جین، تحقیق کا فن، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۹

۵۔ عندلیب شادانی۔ ادبی و لسانی تحقیق مرتبہ عبدالستار دلوی، بمبئی، ۱۹۸۴ء ص ۸۹

۶۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، نئی تنقید، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی باردوم، ۱۹۹۴ء، ص ۶۶

۷ ڈاکٹر جمیل جالبی، ادبی تحقیق، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۴ء، ص ۱۱

۸۔ شان الحق حقی، آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، دہلی ۲۰۰۸ء، ص ۱۴۲۸

۹۔ عبدالرزاق قریشی، مبادیات تحقیق، ادبی پبلشرز، بمبئی، ۱۹۶۸ء، ص ۲

۱۰۔ ڈاکٹر گیان چند جین، تحقیق کا فن، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۹

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۰

۱۲۔ عبدالرزاق قریشی، مبادیات تحقیق، ص ۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۴

۱۴۔ ایضاً، ص، ۱۳۔۱۲

۱۵۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، اتر پردیش اردو اکادمی ۲۰۰۵ء، ص ۵۲

۱۶۔ ڈاکٹر گیان چند جین، تحقیق کا فن، ص ۵۵

۱۷۔ ایضاً، ۲۴

۱۸۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، اصول تحقیق و ترتیب متن، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۹ء، ص، ۵۴۔۵۳

۱۹۔ خلیق انجم، متنی تنقید، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ص ۷۹

۲۰۔عبدالرزاق قریشی،مبادیات تحقیق،ص۳۲۔۳۱
۲۱۔ڈاکٹر تنویر احمد علوی،اصول تحقیق و ترتیب متن،ص۱۰۵۔۱۰۴
۲۲۔محمد حسین آزاد،آب حیات،اتر پردیش اردو اکادمی، ۲۰۰۳ء،ص۳۰۰۔۲۹۹
۲۳۔ڈاکٹر گیان چند جین،تحقیق کے مسائل مشمولہ نوائے ادب،بمبئی،جنوری ۱۹۶۷ء،ص۳۸
۲۴۔ڈاکٹر گیان چند جین،تحقیق کا فن،ص،۹۸
۲۵۔خلیق انجم،متنی تنقید،ص۸۶

(ب) تحقیق کے ابتدائی نقوش (تذکروں میں تحقیقی عناصر)

(ب) تحقیق کے ابتدائی نقوش (تذکروں میں تحقیقی عناصر)

یوں تو اردو میں باقاعدہ تحقیق کی داغ بیل سرسید، شبلی، حالی اور محمد حسین آزاد کی تحریروں سے پڑتی ہے اور اسے سائنٹفک رخ حافظ محمود خاں شیرانی کی تحقیقات سے ملتا ہے۔ تاہم تحقیق کے ابتدائی نقوش ہمیں تذکروں ہی سے ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس لیے تذکرے ہماری ادبی تحقیق کے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہمیں اپنی ادبی تاریخ کی گمشدہ کڑیوں کا سراغ انھیں تذکروں سے ملتا ہے۔ چاہے وہ شعرا کے حالات ہوں یا ادبی کارنامے۔ البتہ موضوع اور مواد کے اعتبار سے ہر تذکرے کی نوعیت جداگانہ ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ہمیں بیش تر تذکروں میں تحقیقی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ہاں یہ بات بہت واضح ہے کہ تحقیق جس حزم و احتیاط کا تقاضا کرتی ہے، یہ تذکرے اس سے خالی ہیں۔

یہاں اس بات سے قطع نظر کہ اردو شعرا کا سب سے پہلا تذکرہ کس نے لکھا اور اور اس کا تاریخی ارتقا کس طرح ہوا۔ ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ تذکرہ کی مخصوص فنی ہیئت کیا ہے اور ان کی تالیف و ترتیب کے مقاصد اور محرکات کیا تھے۔ تاکہ ہم یہ دیکھ سکیں کہ تذکرے اپنی مخصوص فنی ہیئت میں کتنا تحقیقی مواد فراہم کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں تذکروں کے بنیادی عناصر کا احاطہ کرتے ہوئے ڈاکٹر حنیف نقوی لکھتے ہیں:

> ’’مروجہ اصطلاحی معنی کی روشنی میں صرف وہی کتابیں تذکرے کی تعریف میں آتی ہیں جن میں شعرا کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے پیش کیے گئے ہوں۔ دوسرے الفاظ میں یہ دو عناصر حالات اور منتخب کلام اس صنف ادب کے لیے ناگزیر ہیں۔ جس کی مربوط اور متوازن آمیزش کے بغیر کسی تصنیف کو تذکروں کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ حالات کے تحت تذکرہ نگار شعرا کے نام اور تخلص، وطن اور جائے قیام، علمی و فنی استعداد، شاگردی کے روابط، مزاج و طبیعت کی افتاد، تصنیفی و تالیفی کارناموں کی نوعیت اور کلام کے معیار و مذاق کے متعلق ضروری معلومات فراہم کرتا ہے۔ نمونۂ کلام کے ذیل میں عام

طور پر متفرق غزلوں کے منتخب اشعار اور کبھی کبھی دوسرے اصناف سے
بھی اقتباس پیش کیے جاتے ہیں۔''(۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ کی ایک مخصوص فنی ہیئت ہے اور اس کے مطابق اس کی کچھ حدود بھی ہیں۔ اسے ایک طرف تو بیاض کی مجمل نگاری اور دوسری جانب تاریخ کی مفصل بیانی سے بچنے کی ضرورت ہے۔ اسے اپنے محدود دائرے میں بہت سے شاعروں کو ان کی زندگی کے ضروری حالات و کوائف اور منتخب کلام کے ساتھ پیش کرنا ہوتا ہے، اس لیے اسے بڑے اعتدال اور توازن سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے یہ ایک مرکب 'نوع تصنیف' ہے اور اس میں سوانحی قاموس، تاریخ ادب اور تنقید کے سہ گانہ عناصر مجتمع ہوتے ہیں۔ اس لیے تذکروں پر کسی قسم کی گفتگو کرنے سے پہلے اس کے فنی اور ہیئتی حدود کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

جب ہم تذکروں کی ترتیب و تالیف میں کارفرما محرکات و مقاصد پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیچھے بقائے نام کی آرزو، اہل ہنر وارباب کمال کی قدر شناسی، اپنے سرپرستوں کی خوشنودی، دوستوں کی فرمائش، تفریح طبع، شعرا کے کلام کا انتخاب، ادبی گروہ بندی اور اپنے ذوقِ تحقیق و تنقید کی تشفی جیسے مختلف عوامل کارفرما نظر آتے ہیں۔ تذکرہ نگار کا مقصد کوئی باقاعدہ تنقیدی، تاریخی یا تحقیقی کارنامہ انجام دینا نہیں ہوتا۔ اس لیے ان پر تنقید کرنے سے پہلے ان کے اسباب تالیف کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ تذکروں میں کچھ خوبیاں اور خامیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو قدر مشترک کا درجہ رکھتی ہیں۔ تاہم ان کی انفرادی خصوصیات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وضاحت درج ذیل مثالوں سے بآسانی ہو جائے گی۔ میؔر نے اپنے تذکرہ کی وجہ تالیف یہ بیان کی ہے:

''کتابے تا حال تصنیف نہ شدہ کہ احوالِ شاعران ایں فن بصفحۂ
روزگار بماند۔''(۲)

مصحفی نے 'ریاض الفصحاء' دوستوں کی خاطر کا لحاظ کرتے ہوئے لکھا۔ لکھتے ہیں:

''ایں شغل کہ بپاسِ دوستاں در پیش گرفتم''(۳)

جب ہم تذکروں میں تحقیقی عناصر کی بات کرتے ہیں تو سب سے پلے ہماری نظر ان کے انداز ترتیب

پر جاتی ہے۔ تذکروں کی ترتیب عام طور پر حروف تہجی کے اعتبار سے کی جاتی ہے جس میں شعرا کے تخلص کے حرف اول کی رعایت سے ہر حرف کے تحت شروع ہونے والے ناموں کو ترتیب وار رکھا جاتا ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ کسی شاعر کے حالات معلوم کرنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ چونکہ تذکرہ نگار کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ اس کے تذکرے میں زیادہ سے زیادہ شاعروں کو جگہ مل سکے، اس لیے وہ اہم اور غیر اہم کی تفریق میں نہیں پڑتا اور جتنے شعرا کے حالات اور کلام اسے دستیاب ہوتے ہیں، انھیں حروف تہجی کے مطابق ترتیب دے دیتا ہے۔ تذکروں کی اس جامعیت اور قاموسی خوبی سے ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ بہت سے شاعروں کے حالات و کلام یکجا ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اس انداز ترتیب سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ کون سا شاعر تاریخی اور فنی حیثیت سے مقدم ہے اور کون سا مؤخر۔ اس ترتیب کے مطابق داغؔ کا ذکر میرؔ سے پہلے کیا جائے گا جب کہ فنی اور زمانی دونوں اعتبار سے میرؔ مقدم ہیں۔ مگر اس نقص کے باوجود ان تذکروں کی تاریخی اور تحقیقی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اگر چہ اکثر تذکروں کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق عمل میں آتی ہے تاہم کہیں کہیں اس اصول سے بے اعتنائی کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں مثلاً میرؔ کا تذکرہ 'نکات الشعرا' میں۔ جس میں بقول محمود الٰہی:

> ''انھوں نے نہ تو شعرا کی تقسیم طبقات کے لحاظ سے کی اور نہ ان کا ذکر حروف ابجد کی ترتیب سے کی۔ شعرائے دکن کا ذکر یکایک ایک مختصر سی تمہید کے ساتھ وسط کتاب میں آجاتا ہے اور اس کے بعد تمہید کے بغیر شمالی ہند کے شعرا جگہ پاتے ہیں۔'' (۴)

اس طرح میرؔ کے تذکرے میں دردؔ کا ذکر شاہ حاتمؔ سے پہلے اور ولیؔ کا ذکر تو اس کے بھی بعد کیا جاتا ہے۔ دوسری مثال 'گلشن گفتار' (۱۱۶۵ھ) کی ہے جس میں یہی بے ترتیبی پائی جاتی ہے۔ یعنی اس کی ترتیب نہ تو حروف تہجی کے مطابق ہے اور نہ ہی شاعر کی ادبی حیثیت اور تاریخی تقدم کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

کچھ تذکرے ایسے ہیں جن میں تذکرہ نگاری کی عام روایت سے ہٹ کر تاریخی شعور کارفرما نظر آتا ہے اور ان کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق نہ ہو کر طبقات کے لحاظ سے عمل میں آئی ہے۔ ان میں شعرا کو ان کے عہد یا ادبی حیثیت کے مطابق مختلف طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نام قائمؔ

چاند پوری کا ہے جنھوں نے اپنے تذکرہ 'مخزنِ نکات' میں شعرا کو تین طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا طبقہ متقدمین کا ہے جس میں انھوں نے سب سے پہلے سعدیؔ شیرازی کا ذکر کیا ہے اس کے بعد امیر خسروؔ کا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں سعدیؔ شیرازی پہلا شاعر ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہاں قائمؔ سے زبردست سہو ہوا ہے۔ اس نے ملا سعدیؔ دکنی کو سعدیؔ شیرازی سمجھ لیا ہے۔ دوسرا طبقہ شعرائے متوسطین سے تعلق رکھتا ہے اور تیسرے طبقے میں متاخرین یا معاصرین شعرا کا حال بیان کیا گیا ہے۔ قائم نے ہر طبقے کے آغاز میں اس دور کی ادبی ولسانی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ طبقہ دوم کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''در ذکر کلام سخنوران متوسطین برشناسائے اسلوب سخن مخفی ومحجب نیست کہ از عہد عبداللہ قطب شاہ گرفتہ تا زمانۂ بہادر شاہ کسانے کہ شعرائے ریختہ اند نسق کلام اینہاں بسیار مربوط ومعقول است۔ ہر چند کہ اگر الفاظ غیر مانوس گوشِ ما مردم مستعمل ایشاں است، لیکن چوں موافق زبانِ دکھنی است درست است۔'' (۵)

مخزن نکات کی اس طبقاتی تقسیم پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مسیح الزماں لکھتے ہیں:

'' ادوار مقرر کر کے ان کی خصوصیات بیان کرنا تذکرے میں تاریخ ادب کی طرف قدم بڑھانا ہے، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ بعد کے تذکرہ نگاروں نے قائمؔ کے اشارے سے فائدہ نہیں اٹھایا ورنہ آبِ حیات سے کہیں پہلے ہماری تاریخ ادب وجود میں آ جاتی۔'' (۶)

ڈاکٹر مسیح الزماں کا یہ قول کہ '' بعد کے تذکرہ نگاروں نے قائمؔ کے اشارے سے فائدہ نہیں اٹھایا'' درست نہیں کیوں کہ بعض تذکروں میں اس روایت کو اپنانے اور اسے فروغ دینے کا عمل موجود ہے۔ ان تذکروں میں طبقات الشعرا (قدرت اللہ شوق)، تذکرہ شعرائے اردو (میر حسنؔ) اور طبقات شعرائے ہند (کریم الدین) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تینوں تذکرے 'مخزنِ نکات' اور 'آب حیات' کے درمیان کی بہت اہم کڑیاں ہیں، جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

قدرت اللہ شوقؔ نے اپنے تذکرہ 'طبقات الشعرا' کو چار طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ طبقۂ اول میں ریختہ

کی ایجاد اور دکنی شعرا کا حال بیان کیا ہے۔اس میں حضرت امیر خسرؔو کوفن ریختہ کا موجد قرار دیا ہے۔ دوسرا طبقہ ایہام گوشعرا سے متعلق ہے۔جس میں آبرؔو، ناجؔی، حاتؔم، یکرنگؔ اوران کے معاصرین شعرا کوشامل کیا ہے۔ایہام گوئی کے رواج کے بارے میں شوق لکھتے ہیں:

''بعد از طبقۂ شاعرانِ دکن کہ معاصرولی بودندرواج ایہام بسیار شد''(۷)

طبقۂ سوم میں متاخرین شعرا کوجگہ دی گئی ہے جن میں مرزا مظہر جان جاناں، سراج الدین علی خان آرزؔو، قزلباش امیدؔ، اشرف علی فغاںؔ، یقیںؔ اوران کے معاصرین شامل ہیں۔مرزا مظہر جانِ جاناں کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ جس نے سب سے پہلے ایہام گوئی ترک کی وہ مرزا مظہر جان جاناں ہی ہیں۔

طبقۂ چہارم کو چار مقالات میں تقسیم کیا ہے۔پہلے مقالے میں بعض تازہ گوشعرا کوشامل کیا ہے، جن کا ادبی مرتبہ قدرے بلند تھا۔دوسرے مقالے میں سلاطین وامرا، شہزادوں ومنصب داروں کو رکھا ہے۔تیسرے مقالے میں افغان امرا (شعرا) کوجگہ دی ہے۔اس طرح شوقؔ نے یہ تقسیم دو بنیادوں پر کی ہے۔یعنی پہلے تین طبقات کی تقسیم زمانی اعتبار سے کی ہے۔جب کہ چوتھے طبقے میں پانچ مقالات کے تحت حفظ مراتب کا خیال رکھا ہے اس میں عہدہ، ذات، ادبی حیثیت، علاقہ اور تذکرہ نگار سے تعلقات وغیرہ کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اگر شوقؔ کی اس تقسیم پر غور کریں تو ہمیں ان کی تقسیم میں من جملہ دیگر عوامل کے ادبی رجحان بھی کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔پہلا طبقہ دکنی شعرا سے متعلق ہے۔اس کے بعد ایہام گوشعرا کو طبقۂ دوم میں جگہ دی گئی ہے بعد ازاں تیسرے طبقے میں ایہام گوئی ترک کرنے والے شعرا کو جگہ دینا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کے ذہن میں لسانی اور ادبی تبدیلیوں کا احساس ضرور تھا۔یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ قدرت اللہ شوقؔ نے ہندوستان وایران کے سلاطینِ اولیا کے تراجم پر مشتمل ایک کتاب 'تاریخ جام جہاں' لکھی ہے۔جس میں ۳۹ طبقات قائم کیے۔اسی کتاب کے تکملہ کے طور پر 'تکملۃ الشعرائے جام جمشید' بھی لکھی۔یہ فارسی شعرا کا تذکرہ ہے۔اس میں بھی دو مقالے ہیں۔ مقالہ اول در ذکر شعرائے عرب، مقالۂ دوم در ذکر شعرائے عجم وغیرہ۔(۸)

مخزن نکات اور طبقات الشعرا دونوں کو حروف تہجی کے مطابق ترتیب نہ دیے جانے کی وجہ سے کسی

شاعر کے حالات معلوم کرنے میں بہت دشواری ہوتی ہے۔اس نقص کو میر حسنؔ نے تذکرہ شعرائے ارود میں دور کر دیا۔انھوں نے اولاً اپنے تذکرے کو تین طبقات میں تقسیم کیا اور ہر حرف کے تحت آنے والے شعرا کو متقدمین، متوسطین اور متاخرین میں تقسیم کیا ہے۔میر حسنؔ کے متقدمین میں دکنی شعرا کو رکھا ہے۔متوسطین میں فرخ سیر کے زمانۂ اواخر اور محمد شاہ کے زمانۂ اوائل کے شعرا کو شامل کیا ہے۔اور طبقۂ متاخرین میں مابعد کے شعرا کا حال مندرج ہے۔میر حسنؔ کی اس طبقاتی تقسیم میں زمانہ کا لحاظ تو رکھا گیا ہے مگر ان کے یہاں بدلتے ہوئے ادبی رجحان کا کوئی شعور نہیں ملتا۔اس لیے سوائے حروف تہجی کی ترتیب کے اور کوئی جدت میر حسنؔ نہیں پیدا کر سکے۔

تذکرے سے تاریخ ادب کی طرف غیر شعوری اقدام کی یہ کوشش زیادہ منظّم اور شعوری طور پر مولوی کریم الدین کے 'طبقات شعرائے ہند' میں نظر آتی ہے۔اگر چہ کریم الدین کا تذکرہ گارساں دتاسی کی 'تاریخ ادب' کا ترجمہ ہے مگر اس میں کریم الدین نے بہت سے اضافے بھی کیے ہیں۔گارساں دتاسی کی تاریخ ادب (۱۸۳۹) گرچہ حروف تہجی کے اعتبار سے ہی مرتب کی گئی ہے اور چاہتے ہوئے بھی وہ تاریخی ترتیب برقرار نہیں رکھ سکا۔لیکن اس نے مقدمے میں ادبی تاریخ کا خاکہ ضرور پیش کر دیا۔کریم الدین نے اسے نہ صرف عملی جامہ پہنایا بلکہ اسے بہتر ترمیم اور اضافے کے ساتھ قبول کیا۔انھوں نے اپنے تذکرے کو قسم اول اور قسم دوم میں تقسیم کیا ہے۔قسم دوم کو چار طبقات اور تکملہ میں منقسم کیا ہے۔کریم الدین کی اس تقسیم پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر محمود الٰہی فرماتے ہیں:

> ''کریم الدین نے 'طبقات الشعرا' کو جس نہج پر تقسیم کیا ہے وہ تذکرہ نگاری کی پرانی روش سے کسی حد تک مختلف ہے۔یہ تقسیم کسی ایک مؤرخ کا نتیجۂ فکر ہو سکتا ہے۔ایک روایتی تذکرہ نگار کا نہیں۔'' (۹)

تذکروں میں عام طور پر کتاب کے شروع میں دیباچے یا مقدمے لکھنے کا رواج رہا ہے۔اس کے علاوہ تذکروں کے آخر میں تقریظیں اور تتمے لکھے جاتے تھے لیکن زیادہ رواج دیباچوں اور مقدموں کے لکھنے کا ہی رہا ہے۔ان دیباچوں میں حمد و نعت اور منقبت کے علاوہ تذکرہ کی وجہ تالیف، مصنف کے حالات زندگی، شعری و فنی نظریات اور اردو زبان کی ابتدا و ارتقا سے متعلق معلومات بیان کی جاتی ہیں۔عام طور پر تذکرہ نگار

اپنے مقدمے میں اپنی تصنیف کے سبب تالیف پر روشنی ڈالتا ہے جس سے اس تذکرہ کی قدر و قیمت متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ میر تقی میرؔ اپنے تذکرہ کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پوشیدہ نماند کہ درفنِ ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی برزبان اردوئے معلیٰ شاہ جہان آباد کتابے تا حال تصنیف نہ شدہ کہ احوال شاعران ایں فن بصفحۂ روزگار بماند۔" بناء علیہ ایں تذکرہ کہ مسمیٰ بہ نکات الشعرا است نگاشتہ می شود۔"(۱۰)

میر کے ہم عصر تذکرہ نگار قیام الدین قائم نے بھی اپنے تذکرے کی تالیف کی یہی وجہ بیان کی ہے۔ ان کے لفظوں میں:

"تاالیٰ الآن در ذکر و بیانِ اشعار واحوال وشعرائے ریختہ کتابے تصنیف نگردید۔ بایں زماں ہیچ انسانے از ماجرائے شوق افزائے سخن ورانِ ایں فن سطرے نہ رسانیدہ۔ بنابریں ایں حقیر مولف محمد قیام الدین قائم بعد کوشش تام و سعی تمام دواوین ایں اعزہ فراہم آوردہ۔ پارہ پارہ ابیات از ہر کدام برسبیلِ یادگار درذیل ایں بیاض کہ بہ 'مخزن نکات' موسوم است بقید قلم در آوردہ، برائے امتیاز طرز کلام طبقات علیحدہ کہ تفصیل آں پیش تر است ترکیب دادہ۔"(۱۱)

مصحفی نے اپنا تذکرہ 'ریاض الفصحا' 'بپاسِ خاطرِ دوستاں' تحریر کیا تھا۔ کریم الدین کا مقصد یہ تھا کہ وہ شعرائے ہند کا ایک ایسا تذکرہ تالیف کرنا چاہتے تھے۔ جس میں زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے شعرا کا حال بیان کیا جائے۔

تذکروں کے دیباچوں میں سبب تالیف اور طریقۂ کار کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی تذکرہ نگار اپنے بارے میں بھی چند ضروری معلومات فراہم کر دیتا ہے۔ جس سے اس کے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ اس کی تصنیفات و تالیفات، شعری و ادبی خدمات اور ہم عصروں سے اس کے تعلقات کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً 'گلستانِ سخن' کے دیباچے میں مرزا قادر بخش صابر نے احوال مصنف

اور سبب تالیف کے نام سے ایک الگ عنوان قائم کیا ہے جس میں انھوں نے اپنے بارے میں ضروری معلومات فراہم کر دی ہے۔ ان معلومات میں مبالغہ ہوسکتا ہے مگر انھیں کلیتاً نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اکثر ان دیباچوں اور مقدموں میں عروضی وفنی مباحث، شعری ولسانی مسائل، زبان کی ابتدا اور ارتقا جیسے موضوعات پر بھی مواد فراہم کر دیا جاتا ہے۔ اگر چہ ایسے تذکروں کی تعداد بہت کم ہے جن کے مقدمہ میں مذکورہ موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہو۔ لیکن ان معدودے چند تذکروں سے بھی ایک اچھی روایت قائم ہوئی۔ جس نے آگے چل کر تاریخ ادب، لسانیات اور تنقید کی صورت میں تناور درخت کی شکل اختیار کی۔ یہ صحیح ہے کہ ان موضوعات کی ماہیت سے متعلق مفید کام مغرب میں ہوئے مگر جہاں تک اردو کا تعلق ہے۔ ان کے ابتدائی نقوش ہمیں تذکروں میں ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں 'دستور الفصاحت' (سید احمد علی یکتاؔ) گلستانِ سخن (مرزا قادر بخش صابر) انتخاب دواوین (امام بخش صہبائی) مجموعۂ نغز (قاسم) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں کا اجمالی تعارف پیش کر دیا جائے۔

'دستور الفصاحت' قواعدِ عروض وقافیہ اور معانی وبیان سے متعلق ایک جامع تصنیف ہے اس لیے اسے تذکرہ کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن مصنف نے قواعد بیان کرتے وقت جن شعرا کے اشعار سے مثالیں پیش کی ہیں ان کے احوال سے متعلق کتاب کے خاتمے میں ایک باب علیحدہ سے قائم کیا ہے۔ اس لیے کم از کم اس باب کو تو تذکروں کی ضمن میں رکھا ہی جا سکتا ہے۔ یہ کتاب سات حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلا حصہ مقدمہ ہے جس میں زبان اردو کا مصدر اور اس کی پیدائش کے اسباب، زبان کے مراکز اور تہجی سے بحث کی ہے۔ اس کے بعد پانچ ابواب میں قواعد زبان، عروض وبلاغت اور بیان وبدیع پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

'مجموعۂ نغز' کے مقدمے میں قاسم نے اولاً شعر گوئی کی ابتدا پر روشنی ڈالی ہے اور اس سلسلے میں جو مذہبی روایات ہیں ان کو بیان کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ تذکرہ ہمیں کوئی نئی معلومات فراہم نہیں کرتا۔ اس کے بعد انھوں نے عربی اور فارسی میں شعر گوئی کی تاریخ بیان کی ہے۔ اور ساتھ ہی انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ شاعری ایک فن شریف ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں اہل حکومت وثروت نے شعرا کی بڑی قدردانی کی ہے۔ انھوں نے تاریخ اسلام کے متعدد بادشاہ وخلفا کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ لیکن فی زمانہ انھیں فن کی

ناقدری اور شعرا کی کثرت پر بڑا افسوس بھی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''از حال زماں چہ طرازم واز قال و مقال ایں دوراں چہ برنگارم ہر سو کہ می نگرم بینم و بہ (طرف) کہ گوش خرامی کنم زمزمۂ شعری شوم وطرفہ اینست کہ باہمانا اہلیہا ہر یک دم از ملک الشعامی زند وخود را ہمہ بلکہ برتر از دانیانِ ایں فن می شمرد...ومع ہٰذا قدر دانی ہم بدرجہ رسید کہ اگر خاقانی ہزاراں ہزار قصائد حکیمانہ بہ گونا گوں صنائع و بدائع در مدح کسے سر انجام دہد دامے در حصۂ آں بدونہ رسد بلکہ موردِ تحسین موقع آفرین نہ گردد۔''(۱۲)

اس طرح امام بخش صہبائی نے انتخاب دواوین (۱۸۴۳) کے مقدمے میں شعر کی تعریف اور اس کی تاریخ، وزن و قافیہ، ردیف و عروض اور دوسرے محاسن کلام پر مجملاً عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ساتھ ہی ہر صنف سخن کے مخصوص اوزان اور اس میں شہرت رکھنے والے شعرا کا کلام بھی دیا ہے۔ کریم الدین نے اپنے تذکرے کے شروع میں ایک دیباچہ اور مقدمہ تحریر کیا ہے۔ اس میں شعر و ادب کی ترقی اور اردو زبان کی ابتدا پر مجملاً لکھا ہے۔ یہ تذکرہ اگرچہ گارساں دتاسی کی تاریخ ادب کا ترجمہ ہے مگر کریم الدین نے اس میں بہت سے اضافے بھی کیے ہیں۔ جس سے اسے ایک مستقل تصنیف کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ کریم الدین نے اپنے تذکرے میں گارساں دتاسی کی تاریخ ادب ہندوی و ہندوستانی کا مقدمہ بھی شامل کرلیا تھا جس میں انھوں نے کچھ اضافے اپنی جانب سے بھی کیے ہیں۔ ان اضافوں میں تذکرہ نگاری کے اصول وقواعد پر ان کا یہ نظریہ بھی شامل ہے کہ:

> ''کتب تذکرہ اور طبقات چونکہ شاخیں فن تاریخ کی ہیں الیے اکثر اہلِ علم و فضل نے بہ لحاظ تکمیل فن تواریخ کے اس فن کی کتابیں ہر ایک زبان مروجہ جس کو یہ خیال پیرامون خاطر ہوا ہے۔ تصنیف کی ہیں...مگر افسوس کسی نے اس کو شاخ تاریخ نہ رکھا۔''(۱۳)

انھوں نے آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے:

''تاریخ اس کو کہتے ہیں جس میں واقعات یا حالات زمانہ اس طور پر لکھے جائیں کہ اس سے یہ معلوم ہو سکے کہ فلاں زمانہ میں یہ حادثہ یا واقعہ گزرا، بخلاف تذکرہ کے کہ اس میں خاص قسم کے لوگوں کا حال لکھا جاتا ہے۔ مثلاً تذکرۃ الشعرا یا تذکرہ انبیا وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ خاص ہے اور تاریخ عام کہ وہ تذکروں کو بھی مشتمل ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تذکرہ ایک قسم کی تاریخ ہے۔ بشرطیکہ اس میں ہر ایک شخص کے زمانے کا بھی حوالہ ہو۔ اور اگر صرف حال ہی ہو اور تاریخ کسی کی دریافت نہ ہو سکے اور نہ مصنف کے بیان سے واضح ہو کہ کس زمانے کا یہ حال بیان کرتا ہے تو اس صورت میں داخل تاریخ نہ ہوگا بلکہ ایک قسم علیحدہ مقابل تاریخ کے ہوں گے اور اس صورت میں نسبت تضاد کی ہوگی۔'' (۱۴)

پروفیسر محمود الٰہی لکھتے ہیں:

''اس مقدمہ پر انھوں نے جو اضافہ کیا ہے وہ اردو میں اپنے طرز کی پہلی آواز ہے جو تذکرہ نگاری کے مروجہ روش کے خلاف صدائے احتجاج بھی ہے اور ایک نئے انداز کی تذکرہ نگاری کے لیے دعوت فکر بھی۔'' (۱۵)

چونکہ کریم الدین عربی اور انگریزی دونوں کے علمی سرمایہ سے واقف ہیں اس لیے ان کے یہاں تذکروں کو تاریخ بنانے کی شعوری کوشش نظر آتی ہے۔ یہ الگ بحث ہے کہ وہ خود اپنے ساختہ اصولوں پر کتنے کامیاب ہوئے۔ لیکن تذکرہ نگاری کی عام روش کے خلاف ان کی صدائے احتجاج کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

علمی و فنی مباحث کے نقطۂ نظر سے تذکرہ گلستانِ سخن (۱۲۷۱ھ) مؤلفہ مرزا قادر بخش صابر کا مقدمہ بھی بہت اہم ہے۔ یہ مقدمہ اپنی نوعیت کا واحد مقدمہ ہے جس میں مختلف موضوعات پر اس شرح و بسط کے ساتھ

روشنی ڈالی گئی ہے۔اس مقدمہ میں تذکرہ کے سبب تالیف اور احوال مصنف کے بعد ایک بسیط مقدمہ بھی ہے۔ جسے تبصرہ کا نام دیا گیا ہے۔اس تبصرے کو ایک مقدمہ اور تین مقاصد میں تقسیم کیا گیا ہے۔اس میں حرف کی تعریف،مختلف زبانوں میں حروف تہجی کی کیفیت،الفاظ کی تشکیل و ایجاد،الفاظ و معنی کا رشتہ اور زبان کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مقدمہ نگار وسیع العلم ہے۔مثلاً حروف کی تعریف ملاحظہ فرمائیں:

''حرف ایک کیفیت کا نام ہے، وابستہ ہے ایک اور کیفیت سے اور یہ کیفیت ہوا کے ساتھ قائم ہے کہ ایک عنصر ہے عناصر چہارگانہ میں سے۔ جب وہ سخت چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ کرے اور اس حالت کو عربی میں قلع کہتے ہیں یا ایک دوسرے پر ماریں اس حالت کو قرع کہتے ہیں تو بالضرور ان دونوں کے درمیان جو ہوا ہے پانی کی طرح متموج ہو جائے گی اور اس تموج سے آواز پیدا ہوگی۔مطلق آواز کو اور کیفیتیں عارض ہوتی ہیں کہ ایک کو دوسری سے ممتاز کر دیتی ہے جیسے زیر و بم اور غنہ یا گرانی،گلو سے بہم پہنچانا اور ایک اور کیفیت خاص بواسطہ مخارج کے اجزا ہوا کی تقطیع سے آواز کو عارض ہوتی ہے جیسے دو زیر یا دو بم یا دو غنہ یا دو آواز کا گلوئے گراں سے حاصل ہونا، اس کیفیت خاص کا نام حرف ہے۔''(۱۶)

اس طرح مصنف کے پیش نظر تذکرہ کے مقدمہ میں ادبی اور لسانی موضوعات پر بڑی تحقیق و تفتیش اور محنت سے لکھا ہے۔لیکن اسی کے ساتھ بعض غیر ضروری مباحث بھی ان کے یہاں در آئے ہیں، جن کا شعر و ادب سے گہرا تعلق نہیں ہے مثلاً زبان کی ابتدا سے متعلق لکھنے سے پہلے مقدمے کے طور پر ہندوؤں، مجوسیوں، ایرانیوں اور مسلمانوں میں ابتدائے آفرینش سے متعلق مختلف مذہبی نظریات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔اس کے بعد لکھا ہے کہ ابتداً تمام انسانوں کی زبان ایک تھی۔لیکن بعد میں نقل مکانی اور بعد زمانی سے ان میں فرق رونما ہونے لگے اور رفتہ رفتہ نئی زبانیں وجود میں آنے لگیں۔اپنے دعوے کی تصدیق کے

لیے تذکرہ نگار نے مختلف زبانوں کے الفاظ میں تقابل کر کے ان میں یکسانیت دکھانے کی کوشش کی ہے۔اس طرح یہ مقدمہ اردو میں لسانیات کے ابتدائی مباحث سے متعلق بہت اہم ہے۔آ گے چل کر یہی روایت محمد حسین آزاد کے یہاں 'آب حیات' اور خصوصاً 'سخندانِ فارس' میں ذرا تفصیل کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے۔ اس طویل مقدمہ کے بعد اپنے تبصرہ کے مقصد اول کے تحت دہلی کو اردو کا مولد اور معیار قرار دیا گیا ہے۔بعدۂ فصاحت اور اس کے لوازم اور لفظوں کے اشتقاق سے بحث کی گئی ہے۔تبصرے کے دوسرے مقصد کے ضمن میں شاعری کی تعریف اور تاریخ، عروضی، فنی مسائل اور علم قافیہ وغیرہ پر ایک تحقیقی مقالہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ فن عروض پر ایک علاحدہ تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔مقصد سوم میں اصناف سخن کا تعارف مع امثال دیا گیا ہے۔

اس طرح مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ تذکروں میں شعرا کے حالات اور انتخاب اشعار کے علاوہ مقدموں، دیباچوں یا خاتموں میں جن موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے وہ مشرقی شعریات کے بنیادی اصول ہیں۔آج جدید تنقید چاہے کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے مگر جب تک ہمارے یہاں مشرقیت کے آثار باقی ہیں، تذکروں میں پیش کردہ ان فنی امور کی اہمیت باقی رہے گی۔اس حیثیت سے تذکروں کے یہ مقدمے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

کسی محقق کے تحقیقی شعور کا پتہ اس بات سے بھی لگایا جاتا ہے کہ وہ اپنی تصنیف یا تالیف کا سالِ تصنیف تا سالِ اشاعت تحریر کرتا ہے یا نہیں۔اکثر کتابوں پر آج بھی دیکھا جاتا ہے کہ سنہ اشاعت ندارد ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر تذکروں پر نظر ڈالیں تو اکثر ہمیں تذکروں کے صحیح سالِ تصنیف کا پتہ نہیں چلتا مثلاً میر تقی میرؔ نے اپنے تذکرے پر سالِ تصنیف تحریر نہیں کیا۔یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ وہ مخلص کا ذکر کرتے ہوئے ایک جملہ ایسا لکھ گئے جس سے تذکرے کے سنِ تصنیف کا تعین ہو سکا۔انھوں نے مخلص کے بارے میں لکھا تھا کہ قریب سال ہوا مخلص کا انتقال ہو گیا''۔آج مخلص کا سن وفات متفقہ طور پر ۱۱۶۴ھ تسلیم کیا جاتا ہے۔اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ تذکرہ 'نکات الشعرا' ۱۱۶۵ھ کے قریب لکھا گیا۔یہ ایک استثنائی صورت حال ہے۔ویسے عام طور پر تذکرہ نگار اپنے تذکرے کے سنِ تالیف سے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور تحریر کرتے تھے۔کبھی

قطعات تاریخ کی شکل میں تو کبھی صاف طور پر سنِ تالیف درج کر کے۔ اس سے ہمیں کبھی آغازِ تذکرہ کا علم ہو جاتا ہے تو کبھی اس کی تاریخ اختتام کا علم ہوتا ہے۔ بہت کم تذکرے ایسے ہیں جنھوں نے اپنے آغاز تالیف اور انجامِ تصنیف دونوں سن لکھے ہوں۔

اس کے علاوہ چوں کہ اس دور میں طباعت کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا اس لیے قلمی نسخے میں حک و اضافہ کا عمل جاری رہتا تھا۔ اس لیے تذکروں کے زمانی تعین میں خارجی اور داخلی شہادتوں پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً 'گلزارِ ابراہیم' کے دیباچے میں ابراہیم نے اپنے تذکرے کی تاریخ اختتام ۱۱۹۸ھ لکھی ہے لیکن کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بعد میں بھی اضافہ کرتے رہے۔ نیز یہ کہ اس سے کئی سال پہلے انھوں نے اسے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے یہ ایک کام بہت اچھا کیا کہ اکثر شاعروں کے احوال لکھتے وقت انھوں نے یہ صراحت بھی کر دی کہ ان کا ذکر فلاں سن میں لکھا جا رہا ہے۔

'گلستانِ سخن کو مرزا قادر بخش کی تصنیف قرار دیا جاتا ہے لیکن اس سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کچھ لوگ اسے امام بخش صہبائی کا تذکرہ خیال کرتے ہیں۔ تذکرہ اور خاص طور پر مقدمہ کی زبان و بیان اور اس میں پیش کردہ مواد کے پیش نظر یہ عین ممکن ہے کہ اس گلشن کی آبیاری میں امام بخش صہبائی ہی کا خونِ جگر صرف ہوا ہو۔ اس کے علاوہ غالبؔ، عبدالغفور نساخؔ اور لالہ سری رام اسے امام بخش صہبائی سے منسوب کرتے ہیں۔ قاضی عبدالودود صاحب کا بھی یہی خیال ہے۔ (تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے 'گلستانِ سخن'، مقالہ قاضی عبدالودود مشمولہ دلی کالج میگزین، قدیم دلی کالج نمبر ۱۹۵۳ء ری پرنٹ ۱۹۸۴ء، ص ۹۲_۹۳)

تذکروں کی ترتیب و تالیف اور اس کے طریقۂ کار پر روشنی ڈالنے کے بعد اب ہم اس میں پیش کیے جانے والے مواد پر بھی ایک نظر ڈالتے ہیں تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ تذکرہ نگاروں نے شاعر کے احوال اور انتخاب کلام کو پیش کرنے میں کس حد تک تحقیق و تفتیش سے کام لیا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ اردو میں تذکرہ نگاری فارسی کے توسط سے شروع ہوئی اور فارسی میں اس کا رواج عربی کے زیرِ اثر ہوا اور بقول محمود الٰہی:

''عربی فارسی زبانیں کبھی تحقیقی کارناموں سے خالی نہیں ہوئیں۔ ان زبانوں میں تحقیق کی ایک عظیم الشان اور زندہ روایت ملتی ہے۔ عقل

اور مذہب کی تطبیق ، مذہبی اصول و مسائل کی تدوین اور روایات کی چھان بین کے سلسلے میں ان زبانوں میں بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔علم اسماء الرجال کا دائرہ اگر چہ مذہب تک محدود رہا ہے لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ قدما کھرے کھوٹے کی تفریق میں ایک عمر صرف کر دیتے تھے۔زبان و ادب کے موضوع پر بھی ان زبانوں میں کم ذخیرہ موجود نہیں۔لیکن ان کا تعلق زیادہ تر قواعد و معانی و بیان وغیرہ کے مباحث سے ہے۔لیکن تاریخ نویسی بالخصوص ادبی تاریخ نویسی میں تحقیقی نقطۂ نظر عربی میں ملتا ہے لیکن فارسی میں اس کی مایوس کن حد تک کمی تھی۔'' (۱۷)

اس لیے جب فارسی کے زیرِ اثر شعرائے اردو کے تذکرے لکھے گئے تو ان میں بھی تحقیق سے بے اعتنائی کا سلسلہ چلتا رہا۔ بلکہ وہ فارسی تذکروں سے بھی آگے بڑھ گئے۔

یہ معلوم ہے کہ تذکروں میں بالعموم شاعر کے مختصر حالات ، شاعری پر تبصرہ اور منتخب کلام پیش کیا جاتا ہے۔شاعر کے حالات بیان کرتے وقت تذکرہ نگار شاعر کا نام، تخلص، والد کا نام، جائے پیدائش، سن ولادت و وفات، تعلیم و تربیت، جائے بود و باش، اصلاح سخن (استادی و شاگردی)، سیرت و شخصیت، رنگِ طبیعت اور سرمایۂ شاعری وغیرہ کا ذکر کرتا ہے۔لیکن یہ صورت بہت کم تذکروں اور مخصوص شاعروں کے بارے میں ہی دیکھنے کو ملتی ہے ورنہ اکثر تذکروں میں شاعروں کے حالات بہت ہی مختصر بیان کیے جاتے ہیں، جن سے ان کے بارے میں ابتدائی معلومات بھی حاصل نہیں ہوتی۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ تذکرہ نویسی کا فن مختصر نویسی کا متقاضی ہے لیکن اس کے باوجود تذکرہ نگار سے یہ توقع ضرور کی جاتی ہے کہ وہ شاعر کے بارے میں ابتدائی معلومات تو فراہم کر ہی دے۔تذکروں میں اختصار بہت زیادہ ہوتا ہے اور اسی اختصار کی وجہ سے اردو کے اکثر ناقدین و محققین نے ان سے سخت تنقید کی ہے اور ان کی افادیت پر سوالیہ نشان لگایا ہے۔قاضی عبدالودود نے میرؔ کے تذکرہ 'نکات الشعرا' کے متعلق لکھا ہے کہ ''میرؔ نے شعرا کے جو حالات قلم بند کیے ہیں وہ سادہ عبارت میں تحریر ہو تو پانچ چھ صفحوں میں آ جائیں گے۔'' (۱۸)

قاضی عبدالودود کے درج بالا بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکروں کی مختصر نویسی کس حد تک پہنچی ہوئی ہے لیکن اس اختصار کی کچھ وجوہات بھی ہیں۔ جن میں حصول معلومات میں دشواری، تذکرہ نگار کی سہل پسندی، معاصرانہ چشمکیں اور صاحب تذکرہ سے شاعر کے تعلقات کی نوعیت جیسے اسباب بنیادی نوعیت کے حامل ہیں۔ تاہم کچھ تذکرے ایسے بھی ہیں جن میں بالعموم شعرا کے حالات ذرا تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ ان میں عمدۂ منتخبہ، خوش معرکۂ زیبا، مجموعۂ نغز، گلزار ابراہیم، گلشن ہند اور طبقات شعرائے ہند کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں وضاحت کے لیے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

گزار ابراہیم میں کچھ شاعروں کے حالات تفصیل کے ساتھ نظر آتے ہیں مثلاً احمدؔی، انتظارؔ، حیدرؔ دکنی، رندؔ دہلوی، ذکیؔ دہلوی وغیرہ کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں۔ جن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب تذکرہ کو ان شعرا کے متعلق ذاتی معلومات تھیں۔

عمدۂ منتخبہ جو اردو کا جامع ترین تذکرہ ہے، جس میں سرور نے زیادہ سے زیادہ شعرا کو جگہ دینے کی کوشش کی ہے، اس لیے اکثر شعرا کے بیان میں ایجاز واختصار سے کام لیا گیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس ایجاز واختصار میں زیرِ بحث شاعر کے بارے میں تذکرہ نگار کی معلومات محدود ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ اس دور میں اتنے زیادہ شاعروں کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا لیکن اس کے باوجود تذکرے میں بہت سے ایسے شعرا شامل ہیں جن کے حالات ذرا تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ اگر ان میں منتخب شعرا کا حال الگ سے ترتیب دے دیا جائے تو یہ نیم ادبی تاریخ کی صورت اختیار کرلے گا۔

عمدۂ منتخبہ کے بعد اردو کا ضخیم ترین تذکرہ مجموعۂ نغز ہے۔ اس میں قاسم نے حتی الوسع شاعروں کے بارے میں وہ تمام تفصیلات پیش کردی ہیں جن کی مدد سے ہم ان کی سیرت، شخصیت اور تخلیقی پسِ منظر کا کسی حد تک پتہ لگا سکتے ہیں۔ ویسے ان کے یہاں اکثر شاعروں کے ذکر میں مفصل بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ یہاں صرف ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ جس سے قاسم کے تخلیقی اور تاریخی رجحان کا بخوبی اندازہ ہوجائے گا۔ حاتم کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ’’تخلص بزرگے است بہ شیخ ظہورالدین موسوم وبزرگیش بہر کس معلوم
> (بہ) شاعری مشہور عالم المعروف بہ شاہ حاتم وے از سکنۂ شاہ جہان

آباد۔ صانھا اللہ عن الشر والفساد بود دراوایل حال بہ سپاہ گری ایام
بسرمی بردودر آخر ہا بہدایت سعادۃِ ازلی ورہ نمونی مشیت لم یزلی
وتعلقات دنیوی راخیر آباد گفتہمشت خاک خود بہ دامان اہلِ دل بربست
وبریاضت درویشانہ درپیوست درایامے کہ بہ سرکار دولت مدارنواب
معلے القاب عمدۃ الملک امیر خان بہادر عفی اللہ عنہ ملازم بود وارتکاب
منہیات بدرجہ اعلیٰ می نمود گاہ گاہ بتکیۂ میر بادل علی مرحوم بہ جوار فائض
الانوار نقش قدم رسول علیہ (کذا) مبدائ النفوس والعقول میرفت ومیر
مغفور کہ فقیر آزاد متشرع ودرویش خدایا دمتورع واز مریدان خاص
حضرت شاہ محمد امین سہرودیکہ عقب دیوار پائیں قا[ضی حمید]الدین
ناگوری قدس اللہ تعالیٰ اسرار ہما مجردانہ خفتہ است بوددرمی خوردتا رفتہ
[ر]فتہ ارادہ ارادۃ بدلش جا گرفت وبعد اظہار مافی الضمیر عزقبول
پذیرفت اما حسب ظاہرامور معروفات وممنوع از منہیات نگشت در
عرض پنج شش ماہ بہ عطاے تسبیح ومسلے وکلام اللہ وخرقہ و(ماینا
سبہا) بے آنکہ مکلّف بعمل شرائع گردد بمرور وتدریج سرفراز گشت در
آخر ہمہ ورقے کہ [بر]اں استغفارے کہ از اوراد خاصہ حضرات
سہروردبود ر[و]ح اللہ تعالیٰ ارواحھم باورسید وبخواندن
حالتے [یدست]داد کہ در [حین میل مباشرۃ زنا]حرکتے از قویٰ
شہوانیدر خود نمی یافتو ہنگام ارادہ شرب مدام بمجرد رسیدن بوے ام
الخبائث [بمشا]م تہوع وقے دست میدادتا بالمرہ حرف عمل منہیات از
صفحہ خاطر عاطرش حق گردید وبہ صلاح وفلاح دنیوی واخروی وارسید بہر
حال بسیار آزادانہ زندگی می نمود وخیلے خوش مزاج وخلیق بوددرآخرہائے
روز مدام بہ تکیہ شاہ تسلیم کہ برشاہ راہ راج گھاٹ زیر دیوار قلعۂ مبارک
واقع است تشریف ارزانی میداشت وبرخلاف و[ضع]

آزا[د]اں نیمہ می پوشید و بسیار با[نظافت] وطہارة[می]زیست وگرد مسکرات نمیگشت وبصوم وصلو[ۃ] (وسا]ئرِشرعیا تسخت مقید بود امادستار چہ آزادانہ برکلاہ می بست ووچو[بک]باریک ورومال کہ شعارآزادان است [باخویش]میداشت بالجملہ درویشے بود نیک دین صاحب یقینو شاعرے بود باتمکین ازطبقۂ دویمین دیوانے ضخیم بگفتار قدیم مشتمل انواع سخن دارد ودیوانکے خورد کہ دیوان زادی اش نام کردہ وآں ہم پنج ہزار بیت تخمیناً خواہد بود[بطر]زطبقۂ سوئمیں ازو یادگار است وشعر فارسی ہم می گفت تلامذہ بسیار داشت در دیباچہ دیوان نام[چہل]وپنج کس از[شاگردا]نخود برشتۂ تحریرکشیدہ سر برآند شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودا ہم دراں سلک مسلک است از انصاف گستریش چہ برطرازم[استاد]سراپا درائت ہدائت اللہ خاں ہدا[ئت]عفی اللہ عنہ می فرمودند کہ بارہا از زبان نصفت بیان آں استاد دوراں شنیدہ ان کہ ایں مصرعہ میخواند۔ع

رتبہ شاگردی من نیست استادمرا

وی گفت حقا کہ ایں درحق استادی من وشاگردی مرزاست۔(۱۹)

اسی طرح خوش معرکۂ زیبا میں بھی کچھ شاعروں کے حالات پر تفصیل سے روشنی پڑتی ہے۔حالانکہ عام طور پر اس تذکرے میں شعرا کے حالاتِ زندگی کی تفصیلات نہیں ملتی تاہم بعض شعرا کے سلسلے میں تذکرہ نگار نے اتنی تفصیل سے کام لیا ہے کہ اس سے زیادہ تفصیلات شعرائے اردو کے کسی دوسرے تذکرے میں نہیں ملتی۔

جن شعرا کے تفصیلی حالات اس تذکرے میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ان میں سوؔدا، سید میر جان ذکرؔ، جسونت سنگھ پروانہ، مصحفؔی ومیر انیسؔ وغیرہ کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ان شعرا کے حالات میں انھوں نے بعض نئی معلومات بھی فراہم کردی ہیں اور شعرا کے متعلق بہت سے ایسے واقعات تفصیل سے لکھ

دیئے ہیں جن سے ان کی سیرت وشخصیت پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ان میں زیادہ تر واقعات ان کے معاصرین سے متعلق ہیں۔جن میں کچھ ان کے ذاتی مشاہدے سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض انھوں نے دوسروں سے لیے ہیں۔انھوں نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے راوی کا نام ضرور دے دیا ہے۔''تیغ بر گردن راوی'' مثلاً ایک واقعہ میرؔ کی رعونت اور غرور سے متعلق مرزا افضل نے سبقت کے حوالے سے لکھا ہے۔اس طرح کے اور بہت سے قصے متعدد شاعروں کے متعلق ناصر نے اپنے تذکرے میں بیان کیے ہیں اور بقول مشفق خواجہ،آزاد نے 'آب حیات' میں قصہ گوئی کا جو انداز اختیار کیا ہے اس کے ابتدائی نقوش 'خوش معرکۂ زیبا' ہی میں ملتے ہیں اور کوئی تعجب نہیں کہ آزاد نے یہ انداز ناصرؔ کی پیروی میں ہی اختیار کیا ہو۔(۲۰)

اس کے علاوہ 'گلشن ہند،طبقات شعرائے ہند میں اور دیگر تذکروں میں بھی اس قسم کے تفصیلی حالات دیکھے جاسکتے ہیں۔طوالت کے خوف سے ہم ان سے قطع نظر کرتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ اگر تذکرہ نگاروں کو موجودہ سہولیات فراہم ہوتیں اور وہ عمومیت کے بجائے تخصیص سے کام لیتے تو اور بہتر کارنامہ انجام دے سکتے تھے۔'آب حیات' کی قدر و قیمت اصل میں اس کے مفصل بیانات کی وجہ سے ہے۔مگر 'آب حیات' کا کینوس تذکروں سے کہیں چھوٹا ہے۔

تحقیق کی تعریف کرتے ہوئے محققین اس بات پر متفق ہیں کہ تحقیق حق کی دریافت کا عمل ہے اور یہ عمل اس وقت نتیجہ خیز ثابت ہوسکتا ہے جب کہ اس میں غیر جانب داری سے کام لیا گیا ہو۔اگر تذکروں پر ایک نظر ڈالی جائے تو ان میں جا بہ جا جانب داری کا عمل جاری وساری نظر آتا ہے ۔ یہ جانب داری کبھی معاصرانہ چشمکوں کا نتیجہ ہوتی ہے تو کبھی ادبی گروہ بندیاں اس کو جنم دیتی ہیں اور کبھی ذاتی تعلقات اس راہ میں حائل ہوتا نظر آتا ہے۔تحقیق کے نقطۂ نظر سے یہ رجحان بہت نقصان دہ ہے۔اس سے حقیقت کا چہرہ تعصب کی چادر میں چھپ جاتا ہے۔مثلاً میرؔ نے اپنے تذکرہ کے سبب تالیف میں لکھا ہے کہ اب تک اردو شعرا کا کوئی تذکرہ نہیں لکھا گیا۔ان کا یہ دعویٰ تسلیم بھی کیا گیا۔لیکن تذکروں کے مطالعے کے دوران محسوس ہوتا ہے کہ وہ موافقین کو نواز رہے ہیں اور مخالفین سے جم کر انتقام لے رہے ہیں۔انھوں نے یقینؔ کی شبیہ خراب کرنے کی غرض سے اس غلط فہمی کا بیج بو دیا کہ یقین کا کلام خود ان کا کلام نہیں بلکہ ان کے پیر و مرشد مرزا

مظہر جان جاناں کا عطیہ ہے۔ چونکہ نکات الشعرا کی تالیف کے زمانے میں یقیںؔ کی شہرت ہندوستان گیر سطح پر تھی (جیسا کہ گلشن گفتار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے) واضح ہو کہ اس تذکرے میں یقیںؔ کا ذکر ایک 'شاعر متین' کی حیثیت سے کیا گیا ہے اور مثال کے طور پر ان کی تین غزلیں درج کی گئی ہیں جب کہ اس تذکرے میں میرؔ کا ذکر مفقود ہے۔ بعض دوسرے معاصر تذکرہ نگار بھی یقیںؔ کے مداح نظر آتے ہیں۔ ان حالات میں یقیںؔ سے متعلق میرؔ کا بیان نہ صرف مشتبہ بلکہ مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ 'گلشن گفتار' میں میرؔ کا ذکر نہ ہونا اور یقیںؔ کی مداحی بھی معاصرانہ چشمک اور تعصب پرستی کی واضح دلیل ہے۔

میرؔ کی انھیں ناانصافیوں سے مجبور ہو کر ہی گردیزیؔ (متوفی ۱۲۱۴ھ/۱۸۰۰۔۱۷۹۹ء) نے ایک تذکرہ لکھنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اگرچہ گردیزیؔ نے کھلے طور پر میرؔ کا نام نہیں لیا لیکن بین السطور سے یہی لگتا ہے کہ وہ اسی غزل کا جواب لکھ رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

> ''از ملاحظہ تذکرہ ہائے اخوان زماں کہ مشتمل بر اسامی ریختہ گویان عہد محرر ساختہ اند و علت غائی تالیف شان خردہ گیری ہمسران و ستم ظریفی با معاصرانست در اظہار مافی نفس الامر بایجاز پرداختہ بلکہ از جہت عدم اعتنا و قلت تتبع کرد۔ ذکر اکثر نازک خیالیان رنگیں نگار از قلم انداختہ مع ہذا در تصحیح اخبار و تحقیق احوال اعزہ اغلاط صریح بکار بردہ خطاہائے نمایاں کردہ اند۔'' (۲۱)

لیکن گردیزیؔ اپنے بلند بانگ دعویٰ کے باوجود خود بھی جانب داری کا شکار ہو گئے اور میرؔ کے حالات میں صرف دو سطریں لکھ کر ان کا ایک معمولی شعر نقل کر دیا۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن سے جانب داری اور تعصب جھلکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جن تذکرہ نگاروں کا عناد یا عقیدت سے رشتہ نہیں ہے وہاں عموماً توازن برقرار رہتا ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال طبقات شعرائے ہند کے طبقۂ چہارم میں نظر آتی ہے (جس میں معاصرین کا حال لکھا ہے) کریم الدین نے یہاں ایک مبصر یا شاہد کی حیثیت سے بے لاگ رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس طرح کی مثالیں دوسرے تذکروں میں بھی تلاش کی جا سکتی ہیں۔

تذکرہ نگاری کا ایک محرک یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے معاصر و ماقبل شعرا کے کلام کا انتخاب مرتب

ہوجاتا ہے چنانچہ اکثر تذکروں کی ترتیب انتخاب کلام کے لیے ہی وجود میں آئی۔ تذکرہ دراصل بیاض کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ مثال کے طور پر 'مخزن نکات' جس کا آغاز ۱۱۵۷ھ کے قریب ایک بیاض کی شکل میں ہوا تھا۔ حالات کی تکمیل کے بعد ۱۱۶۸ھ میں اس نے تذکرے کی شکل اختیار کر لی۔ اسی طرح شاہ محمد کمال نے 'مجمع الانتخاب' (زمانۂ تصنیف وترتیب ۱۲۱۲ھ تا ۱۲۵۴ھ) کی بنیاد ہی انتخاب کلام پر رکھی ہے۔ شاہ کمال کو شعرا کا کلام اور دواوین جمع کرنے کا شوق تھا۔ نتیجتاً ان کے پاس دواوین کا ایک وافر ذخیرہ جمع ہوگیا۔ کمال نے اپنے پاس موجود کلام اور دواوین سے شعرا کا کلام منتخب کر کے اس میں حالات کا اضافہ کر دیا اور اسے تذکرے کی شکل عطا کر دی۔ اس طرح تذکروں میں انتخاب کلام پر ہی زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہمارا بہت سارا ادبی سرمایہ ان تذکروں کے صفحات میں محفوظ ہوگیا جس سے ہماری ادبی تاریخ کی منتشر کڑیوں کو بآسانی مرتب کیا جاسکتا ہے۔ ان انتخابات میں اس دور کی ادبی اور تہذیبی تاریخ اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ سانس لیتی نظر آتی ہے۔ ان تذکروں اور ان میں پیش کردہ انتخابات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کس زمانے میں کتنے لوگ شعر کہہ رہے ہیں۔ کس نوعیت کے شعر کہہ رہے ہیں اور ان کے فراہم کردہ اشعار میں اجتماعی یا انفرادی سطح پر کیا تہذیبی رویہ اور تاریخی تاثر موجود ہے۔ نئے بدلتے ہوئے معاشرے میں کس گروہ اور کس طبقے کا ذہنی عمل یا ردعمل کیا ہے۔ معاشرے میں افراد کا کردار کن عوامل سے تشکیل پذیر ہو رہا ہے۔

انتخاب کلام کے لیے تذکرہ نگار کو بڑی محنت سے کام لینا پڑتا ہے۔ تذکرہ لکھنے سے قبل وہ شعرا کا کلام حاصل کرنے میں مصروف ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ قائم کہتے ہیں: ''بعد کوشش تام وسعی تمام دواوین ایں اعزہ فراہم کردو پارۂ ابیات از ہر کدام بر سبیل یادگار در ذیل بیاض کہ بہ 'مخزن نکات' موسوم است بقید قلم آوردہ۔'' (۲۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ نگار کی پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسے زیرِ بحث شاعروں کے دواوین فراہم ہوجائیں۔ اس کے بعد وہ 'پارۂ ابیات از کدام' حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے لیے اسے اپنی اور دوسروں کی بیاض، ماقبل تذکروں، اپنے دور کے اہل ذوق اور خود کی یادداشت پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے اس

کے بعد اسے شاعر کے حفظ مراتب کا خیال رکھتے ہوئے کلام کا انتخاب پیش کرنا ہوتا ہے۔ اگر کلام بہت تھوڑا ہوتا ہے تو وہ پورا کلام تذکرے میں شامل کر دیتا ہے۔ کلام کے انتخاب میں دیانت داری کے اصول کو پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ وہی صورت حال ہوگی جس کا ذکر جانب داری اور تعصب پرستی کے ضمن میں گزر چکا ہے۔

تحقیق ادب میں انتساب کلام بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ غلط انتساب سے تحقیق و تنقید دونوں گمراہیوں میں بھٹک جاتی ہے۔ اس لحاظ سے اگر تذکروں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ جب تذکرہ نگار شاعر کے دیوان سے براہ راست انتخاب کرتا ہے اس وقت غلط انتساب کا خطرہ کم رہتا ہے۔ مگر دوسرے مآخذ سے کلام منتخب کرنے میں یہ خطرہ بڑھ جاتا ہے کیونکہ اکثر تذکرہ نگار روایت کا بیان یا اشعار کا انتساب بغیر تحقیق کے کر دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں تذکروں کے پیش کردہ اشعار کو بغیر تحقیق کے قبول کر لینا خطرے سے خالی نہیں تاہم یہ تذکرے ان شاعروں کے حق میں تو بقول ڈاکٹر تنویر احمد علوی 'نعمت غیر مترقبہ' ہیں:

> ''جن کے بارے میں یہ جاننا مشکل ہے کہ وہ صاحب دیوان تھے یا نہیں اور جن کا کلام ان تذکروں کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتا ان کے کلام تک رسائی کا واحد ذریعہ اکثر صورتوں میں تذکروں کا مطالعہ ہی ہوسکتا ہے۔'' (۲۳)

کریم الدین نے اپنے تذکرے میں اس بات کا فسوس کیا تھا کہ اب تک کسی نے تذکرے کو تاریخ کی شاخ متصور نہیں کیا۔ اس بیان میں اتنی صداقت موجود ہے کہ اول تو عام تذکروں کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق عمل میں آتی ہے جس میں سوانح یا دور کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ دوسرے شعرا کے احوال میں تاریخوں اور سنین کا التزام نہیں ملتا لیکن ان سب کے باوجود کچھ تذکرے ایسے بھی ہیں جن میں تاریخی شعور کارفرما نظر آتا ہے۔ کچھ تذکرہ نگاروں نے تو اپنے تذکروں میں اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ زیرِ بحث شاعر کے احوال میں سنین کے حوالے ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو ظہور واقعات کا تعین ہی ہو جائے۔ ان تذکروں میں اسد علی خان تمنا اورنگ آبادی کا تذکرہ 'گل عجائب'، خلیل کا 'گلزارِ ابراہیم'، مرزا علی لطف کے 'گلشنِ ہند' اور

'طبقاتِ شعرائے ہند' قابلِ ذکر ہیں۔ 'گلِ عجائب' میں جہاں اکثر شعرا کے حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں وہیں اکثر وبیش تر تاریخوں اور سنوں کے حوالے بھی نظر آتے ہیں مثلاً موسوی خان جرأت کا تعارف صاحبِ گلِ عجائب اس انداز سے کراتے ہیں:

'' ولادت خان جرأت درسنہ ثمان وثمانین والف درشہر مذکور واقع گردید... بتاریخ ششم شعبان سنہ خمس وسعبین ومایۃ الف دراورنگ آباد عندلیب حیاتش بغزل خوانی ممات مائل گردید۔ میر غلام علی ارشد کہ ذکرش بالا گذشت تاریخ وفاتش چنیں یافتہ ۔ بسیر جاودانی کرد جرأت ۔'' (۲۴)

درگاہ قلی خان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' نواب موتمن الدولہ خاں دوراں سالار جنگ درگاہ قلی خان بہادر درگاہ خلف الصدق خاندان قلی خاں، بست ونہم رجب سنہ اثنین و عشرین ومائۃ الف متولد شد ودر عمر چاردہ سالگی نواب آصف جاہ غفران پناہ منصب و جاگیر سرفراز فرمود...غرہ رجب ۱۱۷۹ھ از صوبہ داری معزول شدہ پنجم ذی الحجہ سنہ الیہ ازانجا مرگنۂ نظام آبادسی کروہی خجستہ بنیاد واقع است و جاگیراو بود رفت۔ وہژدہم جمادی الاول ۱۱۸۰ھ بمرض سرسام بجنت شتافت ۔'' (۲۵)

اس کے علاوہ دوسرے تذکروں میں بھی اس طرح کی مثالیں تلاش کی جاسکتی ہیں ۔ ان امثال کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ کچھ تذکرے ایسے ضرور ہیں کہ جن کا تاریخی وتحقیقی شعور اپنے زمانہ کے لحاظ سے بہت ترقی یافتہ تھا۔ اگر تذکرہ نگار تمنا اورنگ آبادی کی قائم کردہ اس روایت سے فائدہ اٹھاتے تو اس سے ادبی تاریخ نگاری میں بہت مدد مل سکتی تھی ۔ تذکروں میں جو مواد پیش کیا جاتا ہے اس کی اہمیت اس بات پر منحصر ہے کہ اس میں صداقت ہے یا نہیں ۔ اس لیے اب ہمیں یہ بات جاننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ تذکروں کی روایتوں میں کتنی صداقت ہے اور صاحب تذکرہ نے یہ روایت کہاں سے اخذ کی ۔ اس سلسلے میں یہ بات

ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ یہ تذکرے عہد مخصوص کی پیداوار ہیں۔ جب یہ مرتب ہوئے تو آج کی طرح نہ تو ادبی تحقیق کا رواج تھا اور نہ آج کی طرح وسائل کی فراوانی۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ہمیں دو قسم کے تذکرہ نگار نظر آئیں گے اول وہ جنھوں نے ذاتی تحقیق و تفتیش کی اور استفادے کی صورت میں دیانت داری سے کام لیتے ہوئے اپنے ماخذ کی نشان دہی کردی ہے۔ دوسری قسم ان تذکرہ نگاروں کی ہے جنھوں نے بغیر تنقید و تنقیح ماقبل تذکروں میں پیش کردہ مواد سے بغیر حوالہ دیے خوشہ چینی کی حد تک استفادہ کیا ہے۔ اس لیے ایسے تذکروں کی تحقیق ادب میں کوئی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ البتہ ان تذکروں کی اہمیت سے انکار کرنا درست نہ ہوگا جن میں ذاتی معلومات یا تحقیق و تفتیش سے کام لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں 'تذکرہ گلزار ابراہیم'، 'تذکرۂ ہندی'، 'ریاض الفصحا'، 'شمیم سخن'، 'چمنستانِ شعرا'، 'تذکرۂ بے جگر' اور 'مجموعۂ نغز' کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ یہاں اس سلسلے میں 'گلزارِ ابراہیم' سے ایک مثال کافی ہوگی۔ علی ابراہیم خلیل انگریزی سرکار میں ملازم تھے۔ اس لیے انھیں جہاں ایک طرف فراہمیٔ مواد کے اچھے مواقع حاصل تھے وہیں دوسری جانب وہ مغربی اندازِ تحقیق سے کچھ حد تک واقف بھی ہو گئے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اپنے تذکرے میں شعرا کے حالات لکھتے وقت معتمد اور مستند ذرائع سے معلومات حاصل کیں اور انھوں نے دوسرے تذکرہ نگاروں کی طرح صرف سنی سنائی باتوں ہی کو قبول نہیں کیا بلکہ ذاتی تحقیق و تفحص سے بھی کام لیا۔ اس طرح ہم عصر شعرا کے بارے میں براہِ راست اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور لکھتے ہیں کہ:

> ''کئی ایسے شاعر ہیں جو ان کے عزیز تھے۔ بعض عزیزوں کے دوست تھے۔ بعض بچپن کے ملاقاتی تھے۔ بعض ان کے ماتحت دفتروں میں ملازم تھے اور بعضوں کے مقدمے اور کارروائیاں انھیں کے ہاتھوں سرانجام پائی تھیں۔''(۲۶)

ایسے شعرا جن سے خلیلؔ ذاتی طور پر واقف تھے بڑی مقدار میں تھے اور جن سے ان کی واقفیت نہیں تھی ان کے حالات بڑی محنت سے جمع کیے۔ ان سے خط و کتابت کی، استفسارات کیے اور جو شعرا وفات پا چکے تھے ان کے عزیزوں اور وارثین سے ان کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ خلیلؔ نے بعض جگہ زیر بحث شاعر کے حالات میں کچھ شاعر کی تحریریں جو اس نے اپنے حالات سے متعلق لکھ کر بھیجی تھیں کو من و عن نقل کر دیا

ہے۔اس سے اس تذکرے کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تذکرہ نگار کوصحت روایت کا احساس تھا اور ایسے ماحول میں جہاں مبالغہ زندگی کا ایک جزو لازم بن گیا ہو اور روایت پرستی ہی اصل تحقیق ٹھہرے وہاں اس قسم کی چند مثالیں بھی کرشمے سے کم نہیں۔اس لیے تذکروں پر عمومی انداز میں تبصرہ کرنے سے پہلے ان کی انفرادی خصوصیات اور ان کے پس منظر وغیرہ کو ضرور دھیان میں رکھا جانا چاہیے۔

مندرجہ بالا مباحث کی روشنی میں یہ بات وضح ہوجاتی ہے کہ شعرائے اردو کے متعلق مرتب شدہ تذکرے اگرچہ موجودہ تحقیقی معیار کے حامل نہیں ہیں یعنی ان تذکروں میں پیش کردہ مواد اور صاحب تذکرہ کے تمام تر بیانات کو کلی طور پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔تاہم اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ بعدازاں انھی تذکروں کی بنیاد پر ہماری ادبی تاریخ وتحقیق کی بلند وبالا عمارت تعمیر ہوسکی۔ہم اس جانب اشارہ کرچکے ہیں کہ بیش تر تذکرے فارسی تذکرہ نگاری کی عام روایت کے امین اور پاسدار رہے ہیں اور چونکہ فارسی تذکرے میں تحقیق سے بے اعتنائی کی روایت چلی آرہی تھی۔اس لیے اس روایت کو اردو تذکرہ نگاروں نے نہ صرف اپنایا بلکہ اس کے فروغ میں بھی حصہ لیا۔اگرچہ ان کے سامنے عربی روایات بھی تھیں جہاں اسماء الرجال اور طبقات کی تدوین، تاریخ، سیرت اور سوانح لکھتے وقت تحقیق وتفتیش اور روایت و درایت کے اصولوں کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔لیکن افسوس کہ عام تذکرہ نگار تحقیق کی اس مشرقی روایت سے استفادہ نہ کرسکے بلکہ اس سے چشم پوشی کے مرتکب ہوئے۔اس پر حصول معلومات کی دشواریاں، ذاتی عصبیت اور تذکرہ نگار کی سہل انگاری مستزاد۔ پھر تذکروں سے بلند تحقیقی معیار کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے۔ان حالات میں تذکرہ نگاروں نے جو کچھ کیا وہ مزاج اور اپنے عہد کے رواج کے مطابق کیا۔اس طرح انھوں نے آنے والے محققین کے لیے تاریخ ادب کی عمارت تعمیر کرنے کے لیے خام مواد اور زمین ہموار کی ہے۔

ڈاکٹر حنیف نقوی نے اس سلسلے میں بڑی صائب رائے دی ہے:

> ''تذکرے تاریخ ادب کا ایک جزو بھی ہیں اور ان کی بنیاد بھی۔انھوں نے بلا استثنا تمام مؤرخین کے لیے تحقیق وتلاش کی ظلمتوں میں چراغِ راہ کا کام دیا ہے۔ان کے متفق علیہ بیانات سے حقائق کے عرفان اور

واقعات کی تعمیر میں مدد ملتی ہے اور اختلافی مباحث نے ارباب نظر کے ذوق تجسس کو بیدار کر کے تحقیقی شعور کی پرورش اور نشو ونما کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ چنانچہ آج بھی کوئی مؤرخ ان مآخذ کی جانب رجوع کیے بغیر اپنی تاریخ کے مکمل اور مستند ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ تذکروں کا یہی وہ بنیادی کردار ہے جو ہر صائب الرائے شخص کو ان کے لازوال تاریخی اہمیت کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔'' (۲۷)

حواشی

۱۔حنیف نقوی۔شعرائے اردو کے تذکرے،اتر پردیش اردو اکیڈمی،لکھنؤ،۱۹۹۸،ص۲

۲۔میر تقی میر،نکات الشعرا،مرتبہ محمود الٰہی،اتر پردیش اردو اکیڈمی،لکھنؤ،۱۹۸۴،ص۲۳

۳۔مصحفی،ریاض الفصحا،مرتبہ عبدالحق،اتر پردیش اردو اکیڈمی،لکھنؤ،۱۹۸۵،ص۱۴

۴۔میر تقی میر،نکات الشعرا،مرتبہ محمود الٰہی،اتر پردیش اردو اکیڈمی،لکھنؤ،۱۹۸۴،ص۱۵

۵۔قیام الدین قائم،مخزن نکات،اتر پردیش اردو اکیڈمی،لکھنؤ،۱۹۸۵،ص۱۰

۶۔ڈاکٹر مسیح الزماں،اردو تنقید کی تاریخ،اتر پردیش اردو اکیڈمی،لکھنؤ،دوسرا ایڈیشن،۱۹۸۷،ص۹۹

۷۔نثار احمد فاروقی،تین تذکرے،مکتبہ برہان،دہلی،۱۹۶۸،ص۱۴۷

۸۔نثار احمد فاروقی،تین تذکرے،مکتبہ برہان،دہلی،۱۹۶۸،ص۱۴۸

۹۔کریم الدین،طبقات شعرائے ہند،مرتبہ محمود الٰہی،اتر پردیش اردو اکیڈمی،لکھنؤ،۱۹۸۴،ص ژ۔ز

۱۰۔میر تقی میر،نکات الشعرا،مرتبہ محمود الٰہی،،ص۲۳

۱۱۔قیام الدین قائم،مخزن نکات،اتر پردیش اردو اکیڈمی،لکھنؤ،۱۹۸۴،ص۹

۱۲۔قدرت اللہ قاسم،مجموعۂ نغز،مرتبہ محمود شیرانی،ترقی اردو بیورو،نئی دہلی،۱۹۷۳،ص۱۷۔۱۶

۱۳۔کریم الدین،طبقات شعرائے ہند،مرتبہ محمود الٰہی،ص۲

۱۴۔کریم الدین،طبقات شعرائے ہند،مرتبہ محمود الٰہی،ص۱۴

۱۵۔کریم الدین،طبقات شعرائے ہند،مرتبہ محمود الٰہی،ص ز

۱۶۔مرزا قادر بخش صابر،گلستان سخن،اتر پردیش اردو اکیڈمی،لکھنؤ۱۹۸۲،ص۲۰

۱۷۔کریم الدین،طبقات شعرائے ہند،مرتبہ محمود الٰہی،ص ض

۱۸۔قاضی عبدالودود(مرتب)،عبدالحق بحیثیت محقق،خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری،۱۹۹۵

۱۹۔قدرت اللہ قاسم،مجموعۂ نغز،مرتبہ محمود شیرانی،ص ۱۸۰۔۱۷۹

۲۰۔مشفق خواجہ،تحقیق نامہ،مکتبہ جامعہ،نئی دہلی،۲۰۱۱،ص۲۳۲

۲۱۔فتح علی گردیزی،تذکرہ ریختہ گویاں،مرتبہ اکبر حیدری،اتر پردیش اردو اکیڈمی،لکھنؤ،۱۹۹۵،ص۳۰
۲۲۔قیام الدین قائم،مخزن نکات،اتر پردیش اردو اکیڈمی،لکھنؤ،۱۹۸۴،ص۹
۲۳۔شش ماہی ابلاغ،پٹنہ،۱۹۸۱
۲۴۔تمنا اورنگ آبادی،گل عجائب،مرتبہ عبدالحق،اتر پردیش اردو اکیڈمی،۱۹۸۵،ص۵۵
۲۵۔تمنا اورنگ آبادی،گل عجائب،مرتبہ عبدالحق،ص۵۹۔۵۸
۲۶۔محی الدین قادری زور(مرتبہ)،گلزار ابراہیم،علی گڑھ،۱۹۳۴،ص۳۴۔۳۳
۲۷۔حنیف نقوی،شعرائے اردو کے تذکرے،اتر پردیش اردو اکیڈمی،لکھنؤ،۱۹۹۸،ص۲۶

(ج)

تحقیق کے ارتقائی مراحل

(سرسید، الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، گارساں دتاسی، مولوی عبدالحق)

(ج) تحقیق کے ارتقائی مراحل (ابتدائی محققین)

سرسید احمد خان:

سرسید احمد خان (پیدائش ۱۷؍اکتوبر ۱۸۱۷ء، وفات ۲۷؍مارچ ۱۸۹۸) جامع الکمالات شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت مصلح، مفکر، ماہر تعلیم، صحافی، مؤرخ، صاحب اسلوب اور محقق تھے۔ انھوں نے جہاں اردو ادب کو ایک نیا انداز اور اسلوب عطا کیا وہیں ان کے تحقیقی کارناموں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہر محقق اور صاحب علم داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ انھوں نے ایسے وقت میں اردو تحقیق کی طرف توجہ کیا جب اردو میں دور دور تک تحقیق کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ سرسید کی اس اولیت کا اعتراف کرتے ہوئے الیاس اعظمی نے لکھا ہے کہ:

> ''متنی تحقیق وتدوین کا اردو میں غالباً یہ (تصحیح آئین اکبری) پہلا کام تھا اس لحاظ سے سرسید کو ایک بڑے اور دیدہ ور محقق کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔''(۱)

سرسید احمد خان کے وہ تصنیفی اور تالیفی کارنامے جو تحقیقی نوعیت کے حامل ہیں یا جن میں تحقیقی رجحانات پائے جاتے ہیں۔ ذیل میں ان کا مختصراً جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

سرسید احمد خان کی تالیف کردہ فارسی کتاب جامِ جم کا موضوع تاریخی ہے۔ یہ کتاب اس وقت تالیف کی گئی جب اردو زبان کا زیادہ بول بالا نہیں تھا۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ اردو تیزی سے پھیل رہی تھی اور فارسی کا چلن عام تھا۔ اس لیے انھوں نے اس کتاب کو فارسی میں لکھا۔ یہ کتاب بڑی تحقیق وتدقیق کے ساتھ تقریباً سات مہینے میں مکمل کی گئی۔ اس کتاب میں ۴۳؍مسلم حکمرانوں کا حال سترہ خانوں میں نقشوں اور جدولوں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ ان نقشوں میں بادشاہوں کا حال بہت مختصر مگر جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ہر بادشاہ سے متعلق ان جدولوں میں نام فرماں روا، نام پدر، نام مادر، قوم، سال ولادت، محل جلوس، عمر بوقت

جلوس، سال جلوس، تاریخ جلوس، مدت سلطنت، سکہ، مدت عمر، سال وفات، تاریخ وفات، لقب بعد وفات، مدفن اور کیفیت سے متعلق معلومات افزا باتیں پیش کی گئی ہیں۔ ان بادشاہوں کے حالات جمع کرنے میں انھوں نے نہایت عرق ریزی اور محققانہ بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔

تدوین تاریخ فیروز شاہی: مولانا ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں ان آٹھ بادشاہوں کا حال مذکور ہے جو سلطان ناصر الدین محمود کے بعد تخت نشین ہوئے۔ اس کے علاوہ ان واقعات کا بھی ذکر ہے جو فیروز شاہ کی تخت نشینی کے چھٹے سال تک واقع ہوئے۔ اس میں پیش ہونے والے اکثر واقعات مولانا ضیاء الدین برنی کے دیکھنے ہوئے یا اپنے بزرگوں سے سنے ہوئے ہیں۔ ضیا الدین برنی اور اس کی کتاب تاریخ فیروز شاہی کے بارے میں مولانا الطاف حسین حالی کی رائے نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''یہ ایک نہایت معتبر اور مستند تاریخ ہے جس کا مصنف ضیاء الدین برنی برن (بلند شہر) کا رہنے والا ہے۔ بہت بڑا فاضل اور راست بیانی میں ضرب المثل ہے۔''(۲)

یہ کتاب ہندوستان کے اسلامی عہد کی فارسی تاریخوں میں نہایت مستند اور معتبر سمجھی جاتی ہے۔ تاریخ فیروز شاہی کے جو قلمی نسخے مختلف جگہوں پر اور مختلف اشخاص کے پاس موجود تھے وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے سکریٹری نے ۱۸۶۱ء میں اس کتاب کی تصحیح کی ذمہ داری سرسید احمد خان کو سونپی۔ کافی جدوجہد کے بعد چار مختلف نسخے ملے۔ انھوں نے ان نسخوں کا باہم موازنہ، مقابلہ اور ہر نسخے کے متن پر غور وفکر کرنے کے بعد ایک صحیح ترین اور مکمل نسخہ مرتب کیا۔ اور اس پر ایک سیر حاصل دیباچہ لکھا۔ دیباچہ میں انھوں نے اپنی محنت ومشقت اور طریق کار کو اس طرح بیان کیا ہے:

> ''تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی کی بہت کم یاب کتاب ہے۔ بہت تلاش کے اور تجسس سے مجھ کو ایک نسخہ بہم پہنچا تھا۔ اس کے مقابلے اور صحت میں مجھ کو بہت دقت اٹھانی پڑی۔ ایک ناقص نسخہ کتب خانہ شاہ دہلی سے مجھے میسر ہوا تھا اور ایک نسخہ جو مسٹر ایلیٹ صاحب بہادر نے بہم پہنچایا تھا۔ وہ میں نے لیا اور ایک نسخہ ایڈورڈ طامس صاحب بہادر کے

پاس تھا وہ بھی میں نے لیا اور ایک نسخہ بنارس سے آیا۔ ان چار نسخوں
سے میں نے اپنی کتاب کا موازنہ کیا اور جہاں تک ممکن تھا اس کو صحیح
کرنے کی کوشش کی۔'' (۳)

سرسید کی اس محنت اور کوشش کو بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے ۱۸۶۳ء میں شائع کیا۔ اس ایڈیشن سے سیکڑوں محققین نے فائدہ اٹھایا ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہی سے متعلق تین کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ایک ضیا برنی کی تاریخ فیروز شاہی ہے۔ دوسری کتاب اس نام کی شمس سراج عفیف کی ہے، جب کہ تیسری کتاب 'فتوحات فیروز شاہی' کے نام سے مشہور ہے جو خود فیروز شاہ کی لکھی ہوئی ہے۔ سرسید احمد خاں نے جس تاریخی کتاب کے متن کی تصحیح کی ہے وہ مولانا ضیاء الدین برنی کی کتاب 'تاریخ فیروز شاہی' ہے۔

سرسید احمد خان کا ایک اور نا قابل فراموش کارنامہ 'آئین اکبری' کی تصحیح ہے۔ علامہ ابوالفضل کی یہ فارسی کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی ترتیب و تدوین سرسید نے اس وقت کی جب وہ دہلی میں منصف تھے۔ دہلی کے ایک مشہور تاجر حاجی قطب الدین کی فرمائش پر انھوں نے آئینِ اکبری کی تصحیح کا کام شروع کیا۔ یہ کتاب زبان و بیان کے اعتبار سے فارسی زبان کی دیگر تصانیف سے مختلف تھی۔ اس کے مضامین ایسے تھے کہ پڑھنے سے جی گھبراتا تھا دوسرے یہ کہ کاتبوں کی کرم فرمائیوں سے آئین اکبری کے اکثر نسخے مسخ ہو گئے تھے۔ اس کی تصحیح ایک محنت طلب اور جاں فشانی کا کام تھا مگر سرسید چوں کہ اس کام کی اہمیت اور افادیت سے بخوبی واقف تھے اس لیے انھوں نے اس مشکل کام کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے آئین اکبری کے کئی نسخوں کی مدد سے موازنہ کر کے صحیح اور مستند متن ترتیب دیا اور اکبر کے عہد میں آئین کے متعلق مستعمل اور علامہ ابوالفضل کی اختراع کردہ اصطلاحات کی شرح کے ساتھ عربی، فارسی، ترکی، ہندی اور سنسکرت کے غریب الفاظ کی بھی جا بہ جا شرح کی۔ تمام نسخوں میں خالی جدولوں کو اور ان جدولوں کو جن میں ابوالفضل سے غلطیاں سرزد ہوئی تھیں انھیں دیگر کتابوں سے تحقیق کر کے درست کیا۔ نیز کچھ جدولوں اور خانوں کا اضافہ بھی کیا۔ سکوں سے متعلق مفصل جانکاری پیش کی۔ تصحیح آئین اکبری میں سکوں اور مغل زیورات کے بیان کے وقت حاشیے لکھے۔ اکبری سکوں اور زیورات کی تصویریں دیں۔ ٹکسالی ترازوئے آبی، ترازوئے ہوائی، شکار

اور حملے اکبر کی آتش پرستی اور آئین شکوہ سلطنت اور دیگر چیزوں کی ادھوری اور غیر واضح تصویریں جو آئین اکبری میں تھیں، انھیں دہلی کے مشہور اور ماہر مصوروں سے بنوا کر اس کتاب میں شامل کیا۔ اس زمانے کے اوزان ونقود کی، اس زمانے کے اوزان ونقود سے مطابقت دکھلائی۔

علامہ ابوالفضل نے 'آئین اکبری' کو زبان فارسی میں تین جلدوں میں لکھا تھا۔ سرسید احمد خان نے اسے مرتب کیا۔ اس کی پہلی اور تیسری جلد مطبوعہ شکل میں کہیں کہیں دستیاب ہے۔ البتہ اس کی دوسری جلد غدر کی نذر ہوگئی۔ انھوں نے دوسری جلد کے ساتھ ایک طویل دیباچہ بھی چھپنے کے لیے بھیجا تھا۔ اس سلسلے میں مولانا حالؔی رقم طراز ہیں:

> ''اور ایک لمبا دیباچہ جو گویا آئین اکبری پر ایک مفصل ریویو تھا، تحریر کر کے دوسری جلد کے ساتھ دلی میں چھپنے کو بھیجا، لیکن افسوس کہ یہ جلد ابھی چھپنے نہ پائی تھی کہ غدر ہو گیا اور اسکے جس قدر فرمے چھپ چکے تھے وہ اور تمام مسودہ اور دیباچہ سب تلف ہو گئے۔'' (۴)

اردو تحقیق کی دنیا میں سرسید کو بقائے دوام دلانے کے لیے ان کی معرکۃ الآرا کتاب 'آثار الصنادید' ہی کافی ہے۔ ان کی یہ تصنیف ڈیڑھ برس کی انتہائی محنت کا نتیجہ ہے۔ چار ابواب پر مشتمل یہ ناقابلِ فراموش کارنامہ انجام دینے کا خیال انھیں اس وقت پیدا ہوا جب وہ دہلی میں منصف تھے۔ اس کتاب کی تیاری میں انھوں نے سخت محنت اور دلچسپی سے کام لیا۔ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود تعطیل کے دنوں میں شہر کے باہر کی عمارتوں کی تحقیق وتفتیش کرنے کے لیے دہلی سے باہر نکل جایا کرتے تھے۔ عام طور پر ان کے ساتھ ان کے دوست مولانا امام بخش صہبائی ہوا کرتے تھے۔ ان کی جفاکشی اور لگن کو ڈاکٹر مشتاق احمد نے اس طرح تفصیل سے لکھا ہے:

> ''آخری سانس لے رہی مغلوں کی دہلی کے آثار قدیمہ کی تاریخ لکھنے کے درپے ہوئے تو دہلی کے قدیم کھنڈروں میں بھٹکتے پھرے۔ عمارتوں کے کتبوں کا چربہ اتارا اور ان کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کیں۔۔۔ قطب مینار کے بعض کتبے زیادہ بلند ہونے کے سبب

نہیں پڑھے جاسکتے تھے اوراس مرد خدا نے اپنی عمر کی پرواہ کیے بغیر ان
کتبوں کو قریب سے پڑھا اوران کا چربہ اتارا۔ سیکڑوں تاریخی کتابوں کا
مطالعہ کیا اور اپنی نادر تصنیف 'آثارالصنادید' مکمل کرڈالی۔''(۵)

دہلی سے باہر بھی بہت سی عمارتیں ایسی تھیں جو ٹوٹ پھوٹ کر تقریباً کھنڈر ہوگئی تھیں۔ان عمارتوں کے کتبوں کا پڑھنا اوران سے ضروری معلومات حاصل کرنا دشوار تھا۔کچھ عمارتیں تو ایسی بھی تھیں جن کے ضروری حصے معدوم ہو چکے تھے اور جو حصے باقی تھے ان سے استفادہ کرنا مشکل تھا۔لمبی اور چوڑی عمارتوں کی پیمائش اوران کے کتبوں کو من وعن اصل خط میں پیش کرنا خستہ و بوسیدہ مقام کی تصویریں کھنچوانا اور تقریباً سوا سو عمارتوں کی تحقیق کرنا یہ سب سرسید احمد خان ہی کے بس کی بات تھی۔انھوں نے 'آثارالصنادید' کی تکمیل کے لیےتن من دھن سب کچھ تج دیا۔وہ خود کہتے ہیں:

''قطب صاحب کی لاٹھ کے بعض کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب
پڑھے نہ جاسکتے تھے،ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں
ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوالیا جاتا تھا۔اور میں خود اوپر چڑھ کر چھینکے
میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربہ اتارتا تھا۔جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو
مولانا صہبائی فرط محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے
مارے ان کا رنگ متغیر ہوجاتا تھا۔''(٦)

سرسید کی یہ تاریخی اور تحقیقی کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔اس کتاب کے دو ایڈیشن انھیں کی زندگی میں شائع ہوئے۔انگریزی اور فرانسیسی میں ان کے ترجمے بھی ہوئے۔پہلا ایڈیشن ۲۱ ستمبر ۱۸۴۶ء کو مکمل ہوا اور ۱۸۴۷ء میں چھپ کر شائع ہوا۔پہلے ایڈیشن میں جو خامیاں رہ گئی تھیں،انھیں درست کرکے از سرنو مرتب کیا اور یہ ۱۸۵۴ء میں چھپ کر تیار ہو گیا تھا۔بدقسمتی سے اس کے تمام نسخے غدر کی نذر ہو گئے۔چار ابواب پر مشتمل اس کتاب کے پہلے باب میں دہلی کی عمل داریوں کے مختصر حالات لکھے گئے ہیں۔اوراس میں تیس عمارتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔جو کہ ۴۲ صفحات کو محیط ہے۔دوسرے باب میں دلی کے قلعوں کے بننے اور شہر کے آباد ہونے کا حال مذکور ہوا ہے۔تیسرا باب

بادشاہ اور امیروں کی متفرق بنائی ہوئی عمارتوں کے لیے مخصوص ہے۔ جب کہ چوتھے باب میں دہلی اور دہلی کے لوگوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس باب میں دہلی کے ۱۱۸ مشاہیر کا حال قلم بند کیا گیا ہے۔ آخر میں غالب کی فارسی نثر میں تقریظ، مولانا امام بخش صہبائی کی فارسی میں ریویو اور مولانا صدرالدین خان بہادر کی منظوم فارسی تقریظ شامل ہے۔ 'آثار الصنادید' میں جن لوگوں اور جن چیزوں کا تذکرہ سرسید نے کیا ہے۔ اپنے لفظوں میں اس پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

> ''اس نسخۂ دلکشا کو زیورِ تمام سے آراستہ کر کر اس مناسبت سے صنادید روزگار کے آثار اور اعیان مملکت ہند کے احوال و اطوار پر مشتمل ہے۔''(۷)

اردو تحقیق کے ضمن میں سرسید کا یہ کام اتنا بلند ہے کہ اگر سرسید کے دوسرے کام نظر انداز بھی کر دیئے جائیں تو بھی ان کی محققانہ عظمت میں ذرہ برابر کمی واقع نہ ہوگی۔ اردو تحقیق کے دربار میں انھیں بقائے دوام دلانے کے لیے ان کا یہ کارنامہ کافی ہے۔

حالی (۱۸۳۷تا۱۹۱۴):

اردو ادب میں حالی کا نام ایک انقلابی شخصیت کی غمازی کرتا ہے اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ حالی کا مقدمہ اردو تنقید میں بائبل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ جدید شاعری کی داغ بیل ڈالنے والوں میں بھی حالی پیش پیش رہے۔ نثر میں انھوں نے جو اسلوب اختیار کیا وہ اردو نثر کا معیار قرار پایا۔ انھوں نے اردو میں ادبی سوانح نگاری کی بنیاد ڈال کر اردو میں ادبی تحقیق کا سنگ بنیاد رکھا۔

حالی نے تین ادبی شخصیات کی سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ ان میں سے دو کا تعلق اردو ادب سے اور ایک کا تعلق فارسی ادب سے ہے۔ حالی کی تحریر کردہ ان سوانح عمریوں کی تحقیقی اہمیت پر روشنی ڈالنے سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ حالی سرسید تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ اس لیے ان کا کوئی بھی کام مقصدیت سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ کیوں کہ اس وقت سب سے اہم کام قوم میں شکست خوردگی اور احساس کمتری کو دور کرنا تھا۔ اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں کام یہ تھا کہ اپنے اسلاف میں سے چند نامور

لوگوں کی سوانح تمام خدوخال کے ساتھ قوم کے سامنے پیش کی جائیں۔اس مقصد کے پیش نظر حالی نے مذکورہ لوگوں کی سوانح عمریاں لکھیں۔ اس طرح بظاہر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان سوانح عمریوں کے لکھنے کا مقصد بذاتہٖ کوئی علمی وادبی تحقیق نہیں تھا۔مندرجہ ذیل اقتباس سے یہ بات اور واضح ہوجاتی ہے۔حالی لکھتے ہیں:

> ''بایوگرافی ان بزرگوں کی ایک لازوال یادگار ہے جنھوں نے اپنی نمایاں کوششوں سے دنیا میں کمالات اور نیکیاں پھیلائیں اور جو انسان کی آئندہ نسلوں کے لیے اپنی مساعی جمیلہ کے عمدہ کارنامے چھوڑ گئے ہیں۔خصوصاً جو قومیں کہ علمی ترقیات کے بعد پستی اور تنزل کے درجے کو پہنچ جاتی ہیں ان کے لیے بایوگرافی ایک تازیانہ ہے جو ان کو خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے۔کہ جب وہ اپنے اکابر واسلاف کی زندگی کے حالات اور ان کے کمالات دریافت کرتے ہیں تو ان کی غیرت کی رگ حرکت میں آتی ہے اور اپنی کھوئی ہوئی عزت اور برتری حاصل کرنے کا خیال ان کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔''(۸)

حالی نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے سب سے پہلے فارسی کے مشہور شاعر شیخ شرف الدین سعدیؔ کے حالات اور شاعری پر مشتمل ایک سوانح عمری 'حیات سعدیؔ' کے نام سے لکھی۔اس کے بعد اردو فارسی کے ایک مایۂ ناز شاعر مرزا غالبؔ سے متعلق 'یادگار غالب' لکھی جسے انھوں نے ۱۸۹۷ء میں پہلی مرتبہ نامی پریس کانپور سے چھپوا کر شائع کیا جو ۴۴۰ صفحات پر مشتمل تھی۔اس کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے حالی نے لکھا ہے:

> ''اصل مقصود اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اس عجیب وغریب ملکہ کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خدائے تعالیٰ نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا۔''(۹)

اس طرح مرزا غالب کی شاعرانہ عظمت کو واضح کرنے کے لیے حالی کے ذہن میں مرزا غالبؔ کے حالات زندگی لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔انھوں نے دلی کے قیام کے دوران مرزا کی تصانیف کو ان کے احباب سے حاصل کیا اور جہاں سے جس قدر حالات مل سکے انھیں جمع کرتے رہے۔(۱۰)

اس کے بعد یہ کام معرض التوا میں پڑ گیا۔ بعد میں اپنے دوستوں کے اصرار پر انھوں نے اسے دوبارہ شروع کیا تو اور مواد کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انھوں نے دلی کے کچھ بزرگوں سے خط و کتابت کر کے کتابیں اور مرزا کے حالات فراہم کیے اور اسے خوش سلیقگی سے ترتیب دے دیا۔ اس کا پہلا حصہ مرزا غالب کی سوانح سے متعلق ہے۔ دوسرا حصہ مرزا کے کلام پر تبصرہ اور اس کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ تحقیقی نوعیت کا ہے لیکن حالی نے سوانحی پہلو پر اتنا زور نہیں دیا جتنا کہ تنقیدِ کلام پر۔ انھوں نے خود ہی اپنے دیباچہ میں اس امر کا انکشاف کر دیا تھا۔ ''جس قدر واقعات ان کی لائف کے متعلق اس کتاب میں مذکور ہیں ان کو استقرائی سمجھنا چاہیے۔''(۱۱)

اس کے باوجود ان سے یہ شکایت ضرور رہتی ہے کہ اگر وہ چاہتے تو اس سے زیادہ مواد فراہم کر سکتے تھے۔ انھیں جو کچھ آسانی سے دستیاب ہو سکا اسے ترتیب دے دیا۔ اگر ہم 'حیات جاوید' پر نظر ڈالیں تو ہمیں 'یادگارِ غالب' کے مقابلے میں کہیں زیادہ محنت اور سنجیدگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس لیے بعد کے محققین کو ان پر الزام عائد کرنے کا موقع مل گیا۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے 'یادگار غالب' پر اس طرح تبصرہ کیا ہے:

> ''حالی شاعر (غالب) کی تفصیلات زندگی معین کرنے میں ہمارے لیے خضر راہ نہیں ہو سکے۔ ان کی حقیقی دل چسپی واقعات زندگی سے وابستہ نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان واقعات کی ترتیب بہت ہی منتشر اور پراگندہ حالت میں پائی جاتی ہے۔''(۱۲)

حالی سے پہلے اگرچہ محمد حسین آزادؔ 'آب حیات' میں غالب کے متعلق اظہار خیال کر چکے تھے۔ اس میں انھوں نے اپنے استاد ذوقؔ کو غالب کے مقابلے میں بڑھا چڑھا کر پیش کیا تھا۔ اس لیے اکثر جگہ ہمیں یادگار غالب میں بقول ڈاکٹر وحید قریشی ''جواب آں غزل'' کی صورت نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے غالب کی سوانح، شاعری اور خطوط سے متعلق بیانات میں اکثر 'آب حیات' سے استفادہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے بہت سے بیانات کو تغیر الفاظ کے ساتھ اخذ کر لیا ہے۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ محمد حسین آزاد 'آب حیات' میں غالب کا خاندانی پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''خاندان کا سلسلہ افراسیاب بادشاہ توران سے ملتا ہے۔ جب تورانیوں کا چراغ کیانیوں کی ہوائے اقبال سے گل

ہوا۔ غریب خانہ برباد جنگلوں پہاڑوں میں چلے گئے مگر جوہر کی کشش نے تلوار ہاتھ سے نہ چھوڑی۔''(۱۳)

حالی نے اسی بات کو یادگار غالب میں اس طرح لکھا ہے: ''ایک دراز مدت تک تورکی نسل ملک و دولت سے بے نصیب رہی مگر تلوار کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹی۔''(۱۴)

۲۔آب حیات میں لکھا ہے کہ ''چندروز بعد حیدرآباد میں جاکر نواب نظام علی خاں بہادر کی سرکار میں تین سو سواروں کی جمعیت میں ملازم رہے۔کئی برس کے بعد خانہ جنگی کے بکھیڑے میں صورت بگڑی۔(۱۵)

حالی لکھتے ہیں: ''چندروز بعد وہاں سے حیدرآباد پہنچے اور سرکار آصفی میں تین سو سواروں کی جمعیت سے کئی برس تک ملازم رہے مگر وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔''(۱۶)

اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ آب حیات یادگار غالب کا ایک اہم ماخذ رہا ہے مگر افسوس حالی نے اس کا اعتراف نہیں کیا۔

یادگار غالب میں غالب کی زندگی کے روشن پہلو تو صاف طور پر نظر آتے ہیں مگر ان کے تاریک پہلو پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی اور اس بات کو لے کر بعد کے جن محققین نے حالی کو مورد الزام ٹھہرایا ہے ان میں عبداللطیف اور مولانا ابوالکلام آزاد کے نام قابل ذکر ہیں۔مثلاً حالی نے گنجفہ والے معاملے کو لے کر غالب کی گرفتاری سے متعلق تفصیلات کو نظر انداز کردیا ہے اور غالب کی پردہ پوشی کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے دوسرے مختلف فیہ مسائل کی تفصیلات پیش کرنے سے احتراز کیا ہے۔مزید برآں انھوں نے غالب کے بعض بیانات کو خصوصاً ملا عبدالصمد کو استاد غالب تسلیم کرلیا۔بعد ازاں محققوں (قاضی عبدالودود وغیرہ) نے اسے غلط ثابت کردیا۔

حالی چوں کہ شریف النفس انسان تھے۔اس لیے عیب جوئی اولاً ان کی فطرت ہی میں شامل نہ تھی۔ دوسرے اس وقت سوانح نگاری کا فن اس قدر ترقی نہیں کرپایا تھا کہ ہیرو کے عیب بیان کیے جاتے۔انھوں نے حیات جاوید کے دیباچہ میں لکھا ہے:

> ''اگرچہ ہندوستان میں جہاں ہیرو کے ایک عیب یا خطا کا معلوم ہونا
> اس کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ابھی وہ وقت نہیں

> آیا کہ کسی شخص کی بایوگرافی کریٹکل طریقے سے لکھی جائے۔اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریوں کو بھی دکھایا جائے۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے اس میں جہاں تک ہم سے معلوم ہو سکیں ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو ٹھیس نہیں لگنے دی ہے۔(۱۷)

ان تمام خامیوں اور سہل انگاریوں کے باوجود حالی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ایک عظیم شاعر کی زندگی کے رنگارنگ پہلوؤں کو ہمارے سامنے پیش کیا۔اس لیے یادگار غالب غالبیات کے ذیل میں ایک ناقابل فراموش کتاب ہے۔

حیات جاوید: حیات جاوید میں سرسید احمد خان کی زندگی اور ان کی علمی،ادبی اور مصلحانہ کارناموں کا مفصل بیان ہے۔ یہ سرسید پر لکھی گئی سب سے زیادہ مبسوط کتاب ہے۔اگر چہ سرسید کی حیات پر لکھی جانے والی یہ پہلی تصنیف نہیں ہے۔اس سے پہلے کرنل گریہم سرسید کی وفات سے تیرہ سال پہلے انگریزی میں ایک کتاب شائع کر چکے تھے۔لیکن اس میں حالی کی حیات جاوید کی طرح تفصیل نہیں تھی۔حالی کے ذہن میں سرسید کی لائف لکھنے کا خیال اس وقت پیدا ہوا جب سرسید علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈال چکے تھے۔اس لیے اس وقت سے انھوں نے ان کی حیات سے متعلق مواد جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔انھوں نے ایک طویل سوالنامہ سرسید کے پاس علی گڑھ بھیج دیا تھا۔لیکن سرسید کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔حالی چاہتے تھے کہ خود علی گڑھ جا کر ان سے سوالات پوچھیں مگر ملازمتی ذمہ داریوں کے باعث وہ ایسا نہیں کر سکے۔اس کے علاوہ ان کے احباب نے بھی ان کو سمجھایا کہ ابھی سرسید بقید حیات ہیں اس لیے ان کے حالات لکھنا مناسب نہیں۔اس لیے حالی نے کام موقوف کر دیا۔اسی وقت حاجی اسمٰعیل خان رئیس دتاولی نے اصرار کر کے منشی سراج الدین احمد سے سرسید کے حالات زندگی لکھوائے۔انھوں نے بڑی محنت سے متعلقہ مواد جمع کیا۔اور کتاب کو ترتیب دے کر حاجی صاحب کو دے دیا۔اور کئی برس تک رکھے رہنے کے باوجود اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ حالی نے بعد میں سرسید کی حیات میں ہی ان کی سوانح لکھنے کا ارادہ کر لیا۔چنانچہ ۱۸۹۴ء میں اس کام کے لیے انھوں نے علی گڑھ میں قیام کیا جہاں منشی سراج الدین کے ترتیب دیے ہوئے مسودات بھی انھیں مل گئے۔

اس طرح یہ کتاب ۱۹۰۱ء میں نامی پریس کانپور سے طبع ہو کر شائع ہوئی۔ اس ایڈیشن میں کل ایک ہزار صفحات تھے۔ بعد ازاں اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں قیمت کی کفایت کے خیال سے انڈیکس اور ضمیمے حذف کر دیے گئے اور اصل کتاب میں بھی کہیں کہیں زیادہ طویل عبارتوں کو مختصر کر دیا۔ قلم بھی پہلے کے مقابلے میں خفی کر دیا۔ اس طرح یہ ایڈیشن ۷۱۶ صفحات کا رہ گیا۔

اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں سرسید کے حالات زندگی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب کے دوسرے حصے میں ان کی زندگی اور کارناموں پر تبصرہ ہے۔ حالی نے اس کتاب میں سرسید کی زندگی کے تمام واقعات جہاں تک انھیں معلوم ہو سکے قلم بند کر دیئے ہیں۔ چونکہ یہ ایک متنازعہ فیہ شخصیت کی سوانح حیات ہے۔ اس لیے یہ کتاب خود بھی تنازع میں پڑ گئی۔ جہاں ایک طرف اس کی تعریف و ستائش کی گئی وہیں اس پر مخالفانہ الزام بھی لگائے گئے۔ مخالفین نے اسے مدلل مداحی اور کتاب المناقب قرار دیا۔ جس میں صداقت کم اور تعصب زیادہ نظر آتا ہے۔ حیات جاوید سرسید پر اب تک لکھی گئی تمام کتابوں میں سب سے زیادہ مبسوط، مکمل اور مستند کتاب ہے۔ اگرچہ اس میں کہیں کہیں حالی کا ہمدردانہ رویہ محققین کی نظروں میں کھٹکتا ہے مگر اس سے اس کی قدر و قیمت پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ اس پر کسی قسم کی گفتگو کرنے سے پہلے چند باتوں کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ پہلے ہم سوانح نگاری کے معنی و مفہوم کو سمجھ لیں تاکہ اس کی روشنی میں بات آگے بڑھائی جا سکے۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں بایوگرافی کی جو تعریف کی گئی ہے۔ اس کا تجزیہ کرتے ہوئے سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''اس تعریف کا تجزیہ کرنے سے سوانح عمری کے اصول خود بخود سامنے آجاتے ہیں۔ اول یہ کہ حیات میں موضوع کی ہو بہو تصویر آنی چاہیے جو حقیقت اور صداقت پر مبنی ہو۔ دوم موضوع کی زندگی کی تصویر مکمل ہو اور سوم سوانح عمری نفس انسانی کے ان تمام افکار و حوادث اور ہنگاموں کا مرقع ہونا چاہیے جن سے سوانح عمری کے ہیرو کو گزرنا پڑا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حیات میں بظاہر نقاشی کے ساتھ ساتھ موضوع کی داخلی شخصیت کو بہ تمام و کمال پیش کرنا چاہیے۔ تاکہ حیات جب کہ کسی

شخص کی حقیقی اور پر معنی سرگزشت بن سکے۔''(۱۸)

ان اصولوں کی روشنی میں حیات جاوید کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں حالی کے نقطۂ نظر پر بھی ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ حالی نے حیات جاوید کے دیباچہ میں اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اگرچہ ہندوستان میں ہیرو کے ایک عیب یا خطا کا معلوم ہونا اس کی تمام خوبی اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ شخص کی بائیوگرافی کریٹکل طریقے سے لکھی جائے۔ اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔۔۔ لیکن ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب و جہالت کا مقابلہ کیا ہے، تقلید کی جڑ کاٹی ہے۔۔۔ ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیوں کر لکھی جا سکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے۔ اور اس کا کھرا پن ٹھونک کر دیکھ لیا جائے۔ وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نقطہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس لیے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اس کی لائف میں اس کی پیروی کی جاتی اور نقطہ چینی کا کوئی نکتہ ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔''(۱۹)

کہا جا سکتا ہے کہ حالی نے اپنی تصنیف میں سوانح نگاری کے مذکورہ اصول کو اپنے پیش نظر رکھا۔ اور اپنے موضوع کو زندگی کے تمام کوائف بے کم و کاست بیان کر دیئے اور اس پر مزید انھوں نے نکتہ چینی کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی، جس کے ادعا کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اگرچہ انھوں نے کسی حد تک اس ذمہ داری کو نبایا بھی۔ چونکہ سرسید کی متنازعہ فیہ شخصیت پر قلم اٹھانا ''کارے دارد'' والا معاملہ تھا، اس لیے حالی کو بہت ہی سلیقہ اور توازن سے کام لینا پڑا۔ اس لیے معترضین کو یہ لگتا ہے کہ حالی نے سرسید کی مدلل مداحی کی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ حالی نے حیات سرسید کو مرتب کیا اور اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ حالی سرسید تحریک کے سرگرم کارکن تھے۔ انھیں سرسید سے عقیدت بھی تھی۔ دوسری جانب سرسید کے مخالفین کی فوج بھی تھی جو

ہرزہ گوئی پر اتر آئی تھی۔ ایسی صورت میں جہاں سرسید سے ان کی عقیدت، صداقت بیانی میں مانع ہوسکتی تھی وہیں مخالفین کا جواب دیتے وقت وہ تلخ کامی سے بھی کام لے سکتے تھے۔ لیکن حالی کی شرافت اور دیانت داری نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ پھر بھی مخالفین نے سرسید کے ساتھ حالی کو بھی بدنام کرنا شروع کر دیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

''خواجہ (حالی) مرحوم سوانح نگاری کو محض مدحت طرازی سمجھتے تھے۔ اسی لیے پسند نہ کرتے تھے کہ ناگوار واقعات کو ابھرنے دیا جائے۔ حیات جاوید میں انھوں نے ایسا ہی کیا ہے۔ سرسید مرحوم کے آخری عہد کے حالات سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ حیات جاوید لکھنے کا خیال ترک کر دیا تھا اور صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں ایسے کاموں پر خاک نہیں ڈال سکتا۔ بالآخر انھیں واقعات کو پوری رنگ آمیزی کے ساتھ لکھا اور جس قدر خاک ڈال سکتے تھے ڈال گئے۔'' (۲۰)

مولانا آزاد سے بھی آگے بڑھ کر مولانا اقبال احمد سہیل فرماتے ہیں:

''سرسید کو اپنی لائف مرتب کرانے کا خیال پیدا ہوا اور وہ یہ کلام علامہ شبلی سے لینا چاہتے تھے چنانچہ اس بارے میں جتنی بالواسطہ تحریکیں مولانا سے کی گئیں۔ ان کو مولانا بہ لطائف الحیل ٹالتے گئے۔ آخر نواب اسمٰعیل خان صاحب رئیس دتاولی کا ایک خط بنام سید اسی مضمون کا آیا کہ نواب صاحب نے مکہ معظّمہ میں یہ خواب دیکھا ہے کہ مولوی شبلی آپ کی لائف لکھ رہے ہیں۔ مولانا کو یہ خط دکھلایا گیا مگر اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کے بعد سرسید مرحوم مولانا کو بلا کر کچھ حالات نوٹ کراتے رہے اور مولانا بغیر کسی اضافے یا کمی کے بجنسہٖ املا کرتے جاتے تھے۔ اس طرح جب یہ آخری تدبیر بھی ناکام رہی تو سرسید نے بادل ناخواستہ یہ خیال ترک کر دیا اور مولانا حالی کو اس کام کے لیے طلب فرمایا۔'' (۲۱)

مولانا ابوالکلام کا یہ کہنا کہ مولانا حالی سوانح نگاری کو مدحت طرازی سمجھتے تھے درست نہیں۔ اس سلسلے میں ہم حالی کا ایک قول گزشتہ صفحات میں نقل کر چکے ہیں۔ جس سے مولانا آزاد کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے۔ مولانا کا یہ خیال کہ وہ ناگوار واقعات کو ابھرنے نہیں دیتے، اس میں بھی نیم صداقت ہے۔ اس کی تردید میں بہت سی امثال حیات جاوید میں دیکھنے کو مل جائیں گی۔ مولانا آزاد نے حیات جاوید لکھنے کا خیال ترک کرنے کی جو وجہ بتائی ہے اس کی تردید خود حالی کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ اول تو انھیں خاطر خواہ مواد فراہم نہ ہوسکا۔ دوسرے ان کے احباب نے انھیں سمجھایا کہ سرسید کی زندگی میں ان کی حیات لکھنا مناسب نہیں۔ اور پھر یہ حقیقت بھی ہے کہ حالی نے حیات جاوید لکھنے کا خیال ترک نہیں کیا تھا بلکہ اس کام کو موقوف کیا تھا۔

اب رہا الزام کہ حالی نے سرسید کے کارناموں پر خاک ڈال دی ہے تو یہ الزام قطعی طور پر درست نہیں۔ ہاں یہ بات صحیح ہے کہ حالی نے ایسے واقعات کو تفصیل پیش کرنے سے احتراز کیا ہے، جس سے سرسید کی تصویر داغ دار ہونے کا خطرہ تھا۔ مثلاً ٹرسٹی بل کا قضیہ اور مولوی سمیع اللہ سے اختلافات کا تذکرہ تو ضرور کیا ہے۔ مگر واقعہ کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ قاری حالی کا نقطۂ نظر قبول کرنے پر مجبور ہو جائے۔ جس کی تفصیلات حالی کے یہاں نہیں ملتیں۔ خود حالی سرسید کے رویہ کے خلاف محسن الملک اور وقار الملک کے ساتھ اپنے دستخطوں سے ایک بیان ''پیسہ'' اخبار میں شائع کرانے والے تھے جو سرسید کی ناگہانی موت سے روک لیا گیا۔ لیکن اس قسم کی مثالیں کم ہی ملیں گی جن میں حقیقت کی پردہ پوشی کی گئی ہو اور رہا سرسید کو حق بہ جانب ماننے کا سوال تو یہ مصنف کا ذاتی معاملہ ہے۔ اس نے قاری کے سامنے تمام صورت حال پیش کر دی ہے۔ اب یہ قاری پر منحصر ہے کہ وہ سے کیا نتیجہ اخذ کرے۔

جہاں تک مولانا اقبال سہیل کے اس بیان کا سوال ہے کہ سرسید نے شبلی سے اپنی سوانح لکھوانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی شہادت ان کے پاس نواب اسمٰعیل خاں کے خط کے سوا کچھ اور نہیں۔ جس میں انھوں نے اپنا ایک خواب بیان کیا ہے کہ شبلی حیات سرسید لکھ رہے ہیں۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ سرسید شبلی سے اپنی سوانح حیات لکھوانا چاہتے تھے۔ چونکہ نواب اسمٰعیل خاں کی یہ دلی خواہش تھی کہ سرسید کی لائف لکھوائی جائے۔ اس لیے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اس قسم کا خواب دیکھا بھی ہو۔

اقبال احمد سہیل صاحب کا یہ کہنا کہ شبلی سے مایوس ہوکر سرسید نے حالی کوطلب فرمایا، مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ سرسید نے حالی کو اپنے حالات لکھوانے کے لیے طلب نہیں کیا بلکہ یہ کام خود حالی نے اپنی مرضی سے شروع کیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کا بیان ہے کہ جب بھی انھوں نے سرسید سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے جواباً کہا کہ:

> ''میری لائف میں سوائے اس کے کہ لڑکپن میں خوب میں کبڈیاں کھیلیں، کنکوے اڑائے، کبوتر پالے۔ ناچ مجرے دیکھے اور بڑے ہوکو نیچری، کافر اور بے دین کہلائے، اور رکھا ہی کیا ہے۔''(۲۲)

بہر حال حالی نے ایک بہت بڑے کینوس پر ایک عظیم شخص کی جو قد آور، دل آویز اور پر معنی تصویر بنائی ہے، اگر اس میں موئے قلم کی لغزش سے کچھ چھینٹے ادھر ادھر پڑ گئے ہوں یا پس منظر میں کچھ نقوش پر رنگ آمیزی نہ ہوسکی ہو تو اس سے اتنی بڑی تصویر میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ سرسید کی اس سے زیادہ قد آور، دل آویز اور پر معنی تصویر اردو ادب کا کوئی مورخ یا محقق نہیں بنا سکا۔

محمد حسین آزاد (۱۸۰۳ تا ۱۹۱۰):

عہد سرسید کی ادبی شخصیتوں میں مولانا محمد حسین آزاد کا نام اس لیے سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ انھوں نے خالص ادبی بنیادوں پر شہرت و مقبولیت کی منزلیں طے کیں، جب کہ اس دور کے علی گڑھ تحریک سے وابستہ مصنفین کا نام ان کے ادبی کارناموں سے زیادہ قومی خدمات کی وجہ سے زندہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان لوگوں نے بھی اعلیٰ علمی و ادبی خدمات انجام دیں مگر یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ وہ ادیب ہونے سے زیادہ قومی رہنما ہونے پر نازاں تھے اور اس قومی رہنمائی نے ان کے ادب کو بھی زیادہ وقیع کیا اور بعض صورتوں میں اسے اپنے مرتبے سے گرایا بھی۔ غرض ان میں کوئی شخص اول ادیب نہ تھا، نہ کسی کو اولاً ادیب بننے پر فخر ہوا۔

آزاد کا اوڑھنا بچھونا ہی ادب تھا اور اس میں ان کی اولیت کو تسلیم نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ جدید شاعری

کی داغ بیل ڈالنے والوں میں ان کا نام سرفہرست ہے۔ جدید تنقیدی رجحانات بھی پہلی مرتبہ محمد حسین آزاد کے یہاں ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ادبی تاریخ کو تذکرہ نگاری کے دور سے نکالنے والے بھی آزاد ہی ہیں۔ لسانی تحقیق کی طرف توجہ کرنے والے بھی وہی پہلے شخص ہیں۔ ان سب کے باوجود آزاد کو نکتہ چیں تو بہت ملے پر ہمدرد کم ملے۔ محمد حسین آزاد کے دوسرے علمی کارناموں سے قطع نظر یہاں ان کی جن کتابوں کا جائزہ مقصود ہے ان میں سب سے اہم کتاب آب حیات ہے۔ یہ ان کی سالہا سال کی محنتوں کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے اس قسم کی ایک کتاب کی تجویز ۱۰/ جولائی ۱۸۶۵ء کے انجمن پنجاب کے جلسہ میں پیش کی تھی اور ۱۸۶۷ء میں ولیؔ، ہدایتؔ اور حاتمؔ پر مضامین بھی لکھے تھے، جو بعد میں آب حیات میں شائع ہوئے۔ اس کا پہلا ایڈیشن وکٹوریہ پریس لاہور سے ۱۸۸۰ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ اس میں مومن خان مومنؔ کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اس پر مولانا حالیؔ نے ۱۸۸۱ء میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

''بعض طبقات میں ایک آدھ ایسے شاعر کا حال قلم انداز کیا گیا ہے جو اپنے طبقہ میں مستند سمجھا جاتا تھا جیسے طبقات پنجم میں مومن خان مومنؔ یا میر نظام الدین خان ممنون۔''(۲۳)

اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۸۳ء میں شائع ہوا جس میں محمد حسین آزادؔ نے مومن خان مومنؔ کا نام تو شامل کر لیا البتہ ممنونؔ اس اشاعت ثانی میں بھی نظر انداز کر دیئے گئے۔ آب حیات کا موجودہ ایڈیشن اسی طبقۂ ثانی پر مبنی ہے۔ ہمارے پیش نظر ۱۹۰۷ء کا جو عکسی ایڈیشن (مطبوعہ اتر پردیش اردو اکادمی) موجود ہے اس میں بھی مومنؔ تو شامل ہیں مگر ممنونؔ نہیں۔ آزادؔ نے کتاب کے شروع میں ایک دیباچہ تحریر کیا ہے جس میں وجہ تالیف بیان کرنے کے بعد فہرست مطالب درج کی ہے۔ اس کے بعد تاریخ زبان کے عنوان کے تحت بڑے یقین کے ساتھ لکھا ہے ''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے۔''(۲۴)

اس سے بظاہر یہ لگتا ہے کہ وہ اردو زبان کی ابتدا سے متعلق کوئی نظریہ پیش کر رہے ہیں اور اردو زبان کا ماخذ برج بھاشا کو بتا رہے ہیں۔ لیکن اس حصہ کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ جدید ہند آریائی زبانوں کے باریک اختلاف سے آشنا نہیں۔ اور کسی لسانی بنیاد کے بغیر اپنے پیش رؤوں سے خصوصاً چرنجی لال وغیرہ

کی روایت کو قبول کرلیا ہے۔اس لیے ان کے یہاں ہمیں اردو زبان کی ابتدا سے متعلق کوئی خودساختہ نظریہ نہیں ملتا۔مزید یہ کہ لفظ برج بھاشا کا استعمال انھوں نے بہت کم کیا ہے اکثر اسے وہ بھاشا ہی کہتے ہیں۔ جس سے ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی خاص علاقہ کی زبان سے متعلق بات نہیں کر رہے ہیں بلکہ عام ہندوستانی زبانوں سے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔ان کے مطابق مسلمانوں کی آمد اور یہاں کے لوگوں سے ان کی میل جول سے فارسی اور بھاشا میں لین دین شروع ہوا لیکن صرفی اعتبار سے بھاشا نے فارسی سے کچھ بھی اخذ نہیں کیا۔ برج بھاشا پر عربی و فارسی کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''بہر حال ہمیں اپنے بزرگوں کی اس صنعت کا شکریہ ہی کرنا چاہیے کہ
ہندی بھاشا میں جو اضافت کی طوالت'' کا، کی، کے'' سے ادا ہوتی ہے
وہ فارسی کی اضافت میں آ کر مختصر ہوگئی۔''(۲۵)

اس کے علاوہ انھوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں اردو اور برج بھاشا کے صرفی ونحوی نیز لسانی مماثلت سے متعلق شواہد بھی فراہم نہیں کیے اور اسی لیے وہ جگہ جگہ تضاد بیانی کرتے نظر آتے ہیں۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اس کی اصل برج بھاشا جو اپنی بہار جوانی میں بھی فقط ایک ضلع میں
لین دین کی زبان تھی۔ خود اردو دلی سے نکلی۔ جس کا چراغ دلی کی
بادشاہت کے ساتھ گم ہوجانا چاہیے تھا۔ پھر بھی بیچوں بیچ ہندوستان
میں کھڑے ہوکر آواز دیں کہ اس ملک کی زبان کیا ہے تو جواب یہی
سنیں گے کہ اردو۔''(۲۶)

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ محمد حسین آزاد کے یہاں کوئی بنیادی لسانی نظریہ نہیں ہے۔

اردو زبان کی تاریخ کے بعد انھوں نے نظم اردو کے ارتقا پر روشنی ڈالی ہے۔اس کے بعد طبقاتی تقسیم کے مطابق شعرا کے حالات زندگی اور شاعری پر تنقید وتبصرہ کیا ہے۔ بہت سے لوگوں نے آب حیات میں ادوار کے تعین کو بہت اہمیت دی ہے۔لیکن آزاد کے یہاں یہ تاریخی ترتیب اچانک نمودار نہیں ہوئی بلکہ انھوں نے اس تقسیم کا ڈھنگ تذکروں سے ہی لیا ہے۔ تذکروں میں مخزن نکات سے آب حیات تک مختلف

تذکروں میں ادوار اور طبقات کے تعین میں ایک ارتقائی عمل دکھائی دیتا ہے۔ ہاں محمد حسین آزاد کے یہاں یہ عمل زیادہ صاف ستھرا اور مفصل دکھائی دیتا ہے۔ آزاد نے تذکروں کے برخلاف چند منتخب شاعروں کو ہی آب حیات میں جگہ دی ہے۔ جس سے ان کے یہاں شاعروں کے بارے میں پہلی بار تفصیلی بیانات ملتے ہیں۔ اب تک شعرا کی شخصیت سے متعلق جو منتشر مواد مختلف تذکروں میں بکھرا پڑا تھا۔ انھیں آزاد نے یکجا کر کے ایک دل آویز تصویر بنا دی اور یہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے آب حیات ایک کمزور تصنیف ہے۔ بقول انیس:

> ''آزاد طبعاً تحقیق کے لیے موزوں نہ تھے۔ ان کی طبیعت میں شدت، شاعرانہ افتادِ طبع اور اسلوبِ تحریر لسانی تحقیق کے لیے موزوں نہیں۔ تحقیق کے لیے جس عرق ریزی کی ضرورت ہے وہ آزاد کے بس کی بات نہیں۔ آزاد کو اپنے علم اور ہمہ دانی پر فخر تھا۔ وہ احساس تفخر اور انانیت کی بدولت اپنی معلومات کو مسلمات سمجھتے تھے۔'' (۲۷)

اسی لیے وہ کسی بات کو بغیر تحقیق کے ایک دعوے کی شکل میں پیش کر دیتے ہیں۔ تحقیق سے یہ بے نیازی اور سہل انگاری ان کے لیے وبال جان بن گئی اور ان کے پیش کردہ معلومات اور حقائق میں تسامحات در آئے۔ جن پر بعد کے محققین نے گرفت بھی کی۔ آزاد کسی بھی روایت کو اس کی صحت اور عدم صحت کی جانچ پڑتال کیے بغیر تخیل کی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں۔ ان کی بنائی ہوئی تصویریں رومان پرور تو ہوتی ہیں لیکن ان میں حقیقت سے انحراف کا احساس بھی ہوتا ہے۔ میر تقی میؔر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''کہن سال بزرگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ جب میر تقی میؔر نے میر تخلص کیا تو ان کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو۔ ایک دن خواہ مخواہ سید ہو جاؤ گے۔ اس وقت انھوں نے خیال نہیں کیا۔ رفتہ رفتہ ہو ہی گئے۔'' (۲۸)

یہاں نہ صرف روایت کمزور ہے بلکہ درایت کے اصول سے بھی درست نہیں۔ کیوں کہ میر کے والد کا انتقال اسی وقت ہو گیا تھا جب میر دس گیارہ برس کے تھے۔ ایسی حالت میں اس قسم کے بیان کی حقیقت معلوم

ہے۔اس کے علاوہ آزاد اکثر وبیشتر اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیتے۔اس وجہ سے ان کے بیانات مشکوک ٹھہرتے ہیں۔جب تک روایت کے تمام سلسلوں کا علم نہ ہو کسی روایت کا قبول کرنا درست نہیں۔اکثر آزاد کے بیانات کو اسی بات پر غلط قرار دیا جاتا ہے۔اخذ واستفادہ بذاتہ کوئی بری چیز نہیں لیکن ماخذ کا حوالہ دینا نہایت ضروری ہے۔اگر محمد حسین آزاد ایسا کرتے تو شاید آب حیات کا مرتبہ اور بلند ہو جاتا۔

آب حیات کے مطالعہ کے دوران ہمیں آزاد کی جانب داری کا احساس بھی ہوتا ہے۔انھوں نے میر کی بددماغی کو کچھ اس طرح پیش کیا کہ میر سے نفرت ہونے لگتی ہے مگر جدید تحقیقات کی روشنی میں آزاد کے بیانات کمزور معلوم ہوتے ہیں۔اسی طرح انھوں نے اپنے استاد ذوق کے مقابلے میں غالب کی تصویر خراب کرنے کی کوشش کی۔

ادب میں محض تاریخی یا سوانحی مواد جمع کرنے کا نام تحقیق نہیں بلکہ کسی فنکار کو اس کے تخلیقی پس منظر میں دکھانے کا کام بھی محقق کو ادا کرنا پڑتا ہے۔اگر تحقیق درست ہے تو نقد ونظر اور مرتبہ کے تعین میں مدد ملتی ہے۔ آزاد سے جہاں شعرا کے سوانحی پہلو پر تحقیق کے دوران بہت سی تاریخی اور واقعاتی غلطیاں سرزد ہوئیں وہیں تنقید میں بھی وہ کئی جگہ انصاف نہیں کر سکے۔اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں تاہم ان کا تنقیدی شعور بہت بالیدہ تھا۔

آب حیات کی تحقیقی اہمیت اور حیثیت جو کچھ بھی ہو،اس کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔یہ ایک بڑی حقیقت ہے کہ آب حیات کے بعد اردو ادب کی جو تاریخیں لکھی گئیں،ان میں کچھ فروعی اختلافات کے علاوہ تمام مواد اور انداز ترتیب آب حیات ہی سے ماخوذ ہے۔اگرچہ یہ مورخین محمد حسین آزاؔد پر جابہ جا اعتراض بھی کرتے ہیں مگر خود ان کی تصانیف کے تسامحات بھی کم نہیں۔اور پھر انھوں نے اپنا چراغ روشن کرنے کے لیے استفادہ بھی آب حیات ہی سے کیا۔اس لیے زمانہ،افتادِ طبع اور حالات کے لحاظ سے آزاؔد جو کچھ کر سکے،وہ قابلِ قدر ہے۔

آزاؔد کا دوسرا اہم کارنامہ 'سخن دانِ فارس' ہے۔یہ ان خطبات کا مجموعہ ہے جو لاہور کے ٹریننگ کالج میں دیے گئے تھے۔اس کتاب کے دو حصے ہیں۔حصہ اول ۱۸۷۲ء میں شائع ہو گیا تھا مگر حصہ دوم کی اشاعت

میں تاخیر ہوگئی۔ آزاد نے دو حصوں پر ۱۸۸۷ء میں نظر ثانی کی لیکن ان کی اشاعت ۱۹۰۷ء سے پہلے ممکن نہ ہوسکی۔ کتاب کے پہلے حصے میں انھوں نے ہندوستان کی قدیم زبان سنسکرت اور قدیم فارسی زبان کا ایک تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ نیز انھوں نے لسانیات کی تعریف اور تاریخ بیان کرنے کے ساتھ زبان کی تعریف بھی کی ہے اور اس کے ارتقا سے متعلق نظریات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں انھوں نے لغت اور اصطلاح کے معانی و مفاہیم پر بھی نظر ڈالی ہے اور اردو زبان کے قواعد وغیرہ سے تفصیلی بحث کی ہے۔ اردو میں اس قسم کی تفصیلی بحث ہمیں پہلی بار آزاد کے یہاں ملتی ہے۔ اگرچہ اس سے قبل گلستان سخن کے مقدمے میں بعض ابتدائی باتیں لکھی جا چکی تھیں، مگر وہاں اس طرح کی تفصیل مفقود ہے۔ اس لیے لسانی اعتبار سے سخن دان فارس کی اہمیت مسلم ہے۔ اس کے دوسرے حصے میں فارسی زبان و ادب سے متعلق مختلف موضوعات پر لکچر ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے اہم ہیں۔

محمد حسین آزاد کا تیسرا کارنامہ 'دیوان ذوق' کی تدوین ہے۔ آزاد کے مطابق ان کے پاس ذوق کا کلام موجود تھا اور انھوں نے اسے غدر کے ہنگامے میں تلف ہونے سے بچالیا تھا۔ اس میں حافظ، انور اور ویران کے مرتبہ دیوان ذوق سے زیادہ کلام شامل ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میں اکثر خود آزاد کا کہا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے محمد حسین آزاد کے ایک شاگرد احمد حسین نے توجہ دلائی ہے۔ ان کا کہنا ہے:

> ''دیوان ذوق ۱۲۷۹ھ میں شائع ہوا تھا۔ اب حال ہی میں مولانا آزاد نے ذوق کا دیوان چھپوایا۔ مولانا آزاد کے ایڈیشن کی نسبت ایک صاحب کہنے لگے کہ اس میں انھوں نے بہت سی غزلیں اپنی ملا دی ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے تھے کہ اس کتاب خانے میں جو اکبری دروازے کا باہر تھا، میں اکثر جایا کرتا تھا اور دیکھا کرتا تھا کہ مولوی صاحب اشعار گھڑ کر نا تمام غزلوں میں شامل کر دیتے تھے۔'' (۲۹)

اس کے بعد محمود شیرانی نے رسالہ (ہندوستانی) الہ آباد میں ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا۔ جس کا عنوان تھا شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد اور دیوان ذوق۔ یہ سلسلہ شیرانی صاحب کے انتقال تک جاری رہا۔ اس میں انھوں نے تحقیق سے یہ بات ثابت کی کہ دیوان ذوق میں اکثر غزلیں اور اشعار محمد حسین آزاد

کے کہے ہوئے شامل ہیں۔ اس طرح شیرانی صاحب کے خیال میں بھی دیوان ذوق مرتبہ آزاد میں الحاقی کلام موجود ہے۔ یہی بات بعض دوسرے شواہد کی روشنی میں آگے چل کر عابد پشاوری نے 'ذوقؔ اور محمد حسین آزادؔ' میں ثابت کیا۔

اس طرح دیوان ذوقؔ تدوینی تحقیق کی ایک انوکھی مثال ہے۔ محمد حسین آزادؔ نے اپنے مرتبہ دیوان کے شروع میں ایک مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ جس میں ذوقؔ کے حالات زندگی قلم بند کیے گئے ہیں۔ جو اکثر آب حیات میں درج حالات سے ملتے جلتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جس وقت سرسیدؔ، حالیؔ، شبلیؔ اور محمد حسین آزادؔ نے وادی تحقیق میں قدم رکھا تھا، اس وقت تک یہ وادی اردو والوں کے لیے ویران تھی۔ نہ کوئی راہنما تھا اور نہ کوئی منزل۔ سو ایسی حالت میں مسافر کا راستہ بھٹک جانا نہ تو حیران کن ہے اور نہ قابلِ ملامت۔ ان بزرگوں کی یہی خدمت بہت ہے کہ ان کے چھوڑے ہوئے نقش پا مستقبل کے محقق کے لیے راہ نما ثابت ہوئے اور نو واردان تحقیق نے اپنی بساط بھر اس ویران وادی کی سیر بھی کی اور اپنے تیشۂ ہنر سے گل بوٹے بھی کھلائے۔

شبلی نعمانیؔ (۱۸۵۷تا۱۹۱۴)::

علامہ شبلی نعمانی کی تحقیقی خدمات پر خامہ فرسائی کرنے سے پیش تر یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ادبی تحقیق انھیں محقق تسلیم نہیں کرتی۔ یہی نہیں اردو کے کسی بھی بڑے محقق نے ادبی تحقیق کے ظہور و شیوع میں بھی ان کی حصہ داری کا ہنوز اظہار و اعتراف نہیں کیا ہے۔ ''بڑے محقق'' سے میری مراد صرف رجحان ساز اور روایت ساز محققین سے ہے۔ جن میں سر دست صرف چار پانچ نام ہی پیش کیے جا سکتے ہیں۔ حافظ محمود شیرانی، مولانا امتیاز علی خان عرشی، قاضی عبدالودود، رشید حسن خان اور پروفیسر نذیر احمد۔ رشید حسن خان نے مولانا شبلی کی بابت لکھا ہے:

> ''انیسویں صدی کا آخری حصہ اور بیسویں صدی کا ابتدائی حصہ دراصل
> حالی و شبلی کا عہد تھا۔ اس زمانے میں ادبیات کی دنیا میں ان دونوں کے
> اثرات شریک غالب کی حیثیت سے کارفرما رہے اور ان کے انتقال

کے کچھ دن بعد تک یہ اثرات اسی طرح کام کرتے رہے۔ مولانا شبلی کی خوش مذاقی، انشا پردازی اور آگہی سے کون انکار کر سکتا ہے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے مزاج میں رومانیت کا غلبہ تھا۔ جس کا اثر ان کے انداز استدلال میں نمایاں ہے۔ بات پر اصرار اور بت گری اور پرستش کا جذبہ ان کے یہاں ہمیشہ کار فرما رہا۔ ان کی عبارت میں بھی ان عناصر کی جلوہ گری ہے۔۔۔ان کے یہاں تحقیقی سطح پر شک کرنے اور چھان بین کرنے کا رجحان کم تھا۔ مختصر یہ کہ وہ ناقد تھے، انشا پرداز تھے، خوش مذاق تھے اور اس صفت خاص میں بہت کم لوگ ان کے شریک نکلیں گے لیکن وہ ''محقق'' نہیں تھے۔ تحقیق جس کم یقینی، غیر جذباتی اندازِ فکر و انداز اظہار اور صحیح معنوں میں سنگ دلی کی طلب گار ہے۔ یہ چیزیں ان کے حصے میں کچھ کم آئی تھیں۔''(۳۰)

رشید حسن خان کے مذکورہ صدر بیان کے بعد علامہ شبلی نعمانی کی تحقیقی حیثیت پر بات کرنا شاید نقار خانے میں طوطی کی صدا ٹھہرے۔ تاہم بحیثیت ایک ریسرچ اسکالر میرا فریضہ ہے کہ میں ان کی نگارشات کے آئینے میں ان کے تحقیقی نقوش تلاش کروں تا کہ رشید حسن خان کے مذکورہ بیان کی تصدیق یا تردید کی جا سکے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ مولانا شبلی نعمانی اپنے تمام تر مورخانہ شعور و آگہی، مختلف علوم وفنون پر فاضلانہ دست رس، تصنیفی و تالیفی مہارت، نادر موضوعات کے انتخاب، مواد کی ترتیب و تنظیم، عالمانہ استدلال، نایاب و کمیاب مراجع و مصادر کی تلاش و شناخت جیسی خصوصیات اور بعض صورتوں میں امتیاز رکھنے کے باوجود کیا ابتدائی دور کے محققین کی صف میں بھی جگہ پانے کے مستحق نہیں۔ اس صورت حال کی بظاہر پانچ وجوہات معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی وجہ پروفیسر خلیق احمد نظامی کے بقول:

''اسلامی ہندوستانی تاریخ کو مسخ کرنے کا کام جب خطرناک حد تک

پہنچ گیا تو اصلاح حال کے لیے بعض مصنفین نے اپنا قدم اٹھایا۔
پرفریب ذہنوں نے ان کے دلائل پر غور کرنے کے بجائے اس
سارے لٹریچر کو جوابی اور معذرت آمیز کہہ کر اس کی اہمیت کو کم کر دیا اور
مطالعے سے پہلے ہی ان مصنفین کے اندازِ تحقیق کو مشتبہ بنا دیا۔'' (۳۱)

دوسری وجہ حافظ محمود شیرانی کی 'شعر العجم' پر احتسابی تنقید کا اثر ہے، جس نے مولانا شبلی کو بظاہر تحقیق کے میدان سے باہر لا کھڑا کیا۔ شیرانی صاحب نے 'شعر العجم' کی صرف دو جلدوں کا احتساب ۶۱۰ صفحات پر کیا تھا جو پہلی بار ۱۹۴۲ء میں تنقید شعر العجم کے نام سے انجمن ترقی اردو ہند دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس سے پیش تر یہ احتساب انجمن کے رسالے 'اردو' (اکتوبر ۱۹۲۲ء سے جنوری ۱۹۲۷ء تک) میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ اس احتساب کا اثر یہ ہوا کہ مولانا شبلی کے مدوحین بھی یہ لکھنے پر مجبور پائے گئے کہ شبلی بنیادی طور پر تحقیق کے مرد میدان نہیں تھے۔ ادب میں وہ صرف نظریاتی اور عملی تنقید کے بنیاد گزاروں میں ہیں۔ ان معنوں میں وہ محقق نہیں جن معنوں میں شیرانی نے انھیں تصور کیا، بایں سبب ان کے یہاں تحقیقی تسامحات کی تلاش بے معنی ہے، اس طرح گویا محمود شیرانی کے جملہ اعتراضات اور گرفت کو من و عن قبول کر لیا گیا۔ حالانکہ شعر العجم کے جن بیانات، جس طریقۂ استدلال اور مصادر و مراجع پر شیرانی نے عموماً گرفت کی تھی، اس سے مشابہ بیانات و مصادر ان کی اپنی تحقیقی کتاب 'پنجاب میں اردو' میں در آئے ہیں، جن کی گرفت رشید حسن خان نے کی ہے۔ انھوں نے اس کتاب کی بابت واضح الفاظ میں لکھا ہے:

''یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شیرانی صاحب نے اس کتاب میں
غیر معتبر حوالوں کو بھی بلا تکلف قبول کر لیا ہے۔ بیاضوں اور موخر
تصانیف کی بنیاد پر جس کلام کا انتساب درست سمجھا گیا ہے، تحقیق کے
نقطۂ نظر سے وہ نادرست ہے۔ شیرانی صاحب نے تو پنجاب میں اردو
کا مولد ثابت کرنا چاہا تھا اور اس کے لیے انھوں نے ہر طرح کے ماخذ
سے کام لیا۔ یہ اندازِ تحقیقی کم اور جذباتی زیادہ تھا۔'' (۳۲)

ادب میں مولانا شبلی کی تحقیقات پر عدم توجہ کی بڑی وجہ یہ بھی رہی کہ ان کو سرسید کے حریف کے طور پر

پیش کیا جانے لگا۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق ،محمد امین زبیری، شیخ محمد اکرام، داکٹر وحید قریشی وغیرہ نے مولانا شبلی کی علمی عظمت کو مشتبہ بنانے اوران کی عالمانہ شخصیت کو مجروح کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور یہ سلسلہ ادبی حدود سے تجاوز کر کے کردار کشی تک جا پہنچا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے:

''ایسے شواہد موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مضمون (مراد تنقید شعرالعجم) مولوی عبدالحق کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔ مولوی صاحب کا علامہ شبلی سے دل صاف نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مولوی صاحب سرسید اور حالی کے زبردست حامی بلکہ عاشق تھے۔ اس کے برعکس مولانا شبلی کو سرسید اور حالی سے بعض معاملات میں اختلاف تھا۔ سرسید سے یہ اختلاف زیادہ تھا۔ مولوی عبدالحق نے مولانا شبلی پر مضمون لکھ کر (لکھوا کر بھی) چھاپنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان پر ایک ایسا الزام بھی لگایا جس سے آج تک علامہ کو بریت حاصل نہیں ہو سکی ہے۔'' (۳۳)

خود مولوی عبدالحق نے ''خطوط شبلی'' کے مقدمہ میں لکھا ہے:

''مولوی شبلی کی تصانیف کو ابھی سے نونی لگنی شروع ہوگئی ہے، زمانہ کے ہاتھوں کوئی نہیں بچ سکتا، وہ بہت سخت مزاج ہے مگر آخری انصاف اسی کے ہاتھ ہے۔ ان کی بعض کتابیں ابھی سے لوگ بھولتے جاتے ہیں اور کچھ مدت بعد صرف کتاب خانوں میں نظر آئیں گی۔'' (۳۴)

۲۶۔۱۹۲۵ء کا یہ بیان کس قدر غیر ذمہ دارانہ ہے، یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح کی کوششوں نے سرسید اور مولانا شبلی کے معتقدین کے درمیان ایک مستقل کشمکش کی بنیاد رکھ دی۔ مولانا حالی اور مولانا شبلی کے بعد اس عہد پر سب سے زیادہ اثر مولوی عبدالحق کا تھا۔ ان اثرات سے مولانا شبلی کی علمی مقبولیت کو کچھ نہ کچھ نقصان تو پہنچنا ہی تھا سو پہنچا۔

تیسری وجہ مولانا شبلی کی جانب اردو کے بلند پایہ محققین کا ملتفت نہ ہونا ہے۔ غالب، اقبال، سرسید اور

پریم چند کی طرح مولانا شبلی کو اردو تحقیق میں ایک مستقل موضوع کی صورت میں ابھی قبول نہیں کیا گیا ہے۔ جامعات میں لکھے جانے والے مقالوں اور دارالمصنفین کے رفقا کی علمی تحریروں کے علاوہ بلند پایہ اور نامور محققین کی مستقل تصانیف تو کجا مضامین بھی ان پر نہ ہونے کے برابر ہیں، جب کہ مولانا شبلی سے کم تر درجے کے ادیبوں وشاعروں پر ہمارے محققین نے خاصا زورِ قلم خرچ کیا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ ادبی تحقیق کی تقریباً ایک صدی پر مشتمل روایت کا سلسلہ وار تاریخی مطالعہ و جائزہ ابھی تک نہیں لیا جا سکا ہے۔ اس صورت میں یہ کس طرح طے پائے کہ تحقیق کی گزشتہ ایک صدی کتنے ادوار پر مشتمل تھی؟ کس دور کے مصنفین کے تحقیقی رجحان کیا تھے؟ تحقیق کے کون سے اصول کس دور میں رائج ہوئے؟ کس دور کے مصنفین کا تصورِ تحقیق کیا تھا اور ان کی تصانیف میں تحقیق کے کون سے عناصر کام کر رہے تھے؟ کن اصولوں کو انھوں نے کب اور کیوں اختیار کیا؟ یہ اصول علم کی کس شاخ اور کس شعبے سے اخذ کیے گئے؟ یہ اور اسی قسم کے متعدد سوالات ہنوز تشنۂ مطالعہ ہیں۔

پانچویں وجہ جو میرے نزدیک سب سے اہم ہے وہ یہ ہے کہ مولانا شبلی کے علمی کام کو ان کے اپنے عہد کے علمی و تحقیقی روایت کے پس منظر میں نہیں دیکھا گیا۔ ہم دورِ حاضر کے دریچوں سے ماضی کا منظر نامہ دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں سو برس پرانے کاموں میں تحقیق و تفحص کی جگہ رومان و پرستش کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر عہد کے اپنے فکری و فنی تقاضے اور حدود ہوتی ہیں۔ اس کا اپنا مزاج، ماحول اور معیار ہوتا ہے اور اس کے اپنے معلوم ماخذ اور ان سے استفادے کے طریقے ہوتے ہیں۔ کیا شبلی کی تحقیقات کا جائزہ لیتے وقت اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھا گیا؟ 'تنقید شعر العجم' اور اسی نوعیت کی دوسری تحریروں کو دیکھنے کے بعد اس امر کا شدید احساس ہوتا ہے کہ شبلی کی تحقیقات کا کہیں موخر ماخذ اور کہیں تحقیق کے موخر اصولوں کی بنیاد پر رد کیا گیا۔ پروفیسر نذیر احمد نے اپنی کتاب 'حافظ محمود شیرانی: تحقیقی مطالعۂ' کے پیش لفظ میں قدرے احتیاط کے ساتھ لکھا ہے:

> ''محقق یا مورخ کے پیش نظر جو ماخذ نہ ہوں اور اگر چہ ان ماخذ کی روشنی میں ان کے نتائج ناقص ہوں تو اس سے مورخ یا محقق پر اعتراض لازم نہیں آتا، ہمارے محققین اکثر اس نکتہ سے غفلت برتتے ہیں۔ شیرانی

صاحب کی تحریروں میں بعض جگہ ہمیں یہ نقص نظر آتا ہے۔ اگر یہ نکتہ
پیش نظر ہوتو تحقیق میں جو تلخی پیدا ہوجاتی ہے وہ ختم ہوجائے۔'' (۳۵)

بیسویں صدی کے نصف دوم میں فن تحقیق کو ادب میں پذیرائی حاصل ہوئی۔ اب تک کی معلومات کے مطابق فنِ تحقیق پر پہلی کتاب ۱۹۶۸ء میں بمبئی سے بہ اسم 'مبادیات تحقیق' شائع ہوئی تھی، جس کے مصنف عبدالرزاق قریشی تھی۔ لیکن ماہنامہ 'آجکل' دہلی کے تحقیق نمبر (اگست ۱۹۶۷ء) کو ادبی تحقیق کے فن کو مدون ومشتہر کرنے کا نقطۂ آغاز مانا جاسکتا ہے۔ مبادیات تحقیق سے تحقیق شناسی (۲۰۰۳ء) تک تقریباً دو درجن کتابیں ادبی تحقیق اور تدوین کے فن پر لکھی جاچکی ہیں لیکن اکثر کا تعلق پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے لیے لکھے جانے والے علمی مقالوں سے ہے۔ ان میں قابلِ ذکر کتابیں نصف درجن سے زیادہ نہیں۔ دوسری زبانوں کے بالمقابل اردو کے جن محققین کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں وہ بھی چھ یا سات سے زیادہ نہیں۔ حافظ محمود شیرانی (اردو تحقیق کے معلم اول)، مولانا امتیاز علی خان عرشی، قاضی عبدالودود، رشید حسن خان، پروفیسر نذیر احمد اور پروفیسر حنیف نقوی وغیرہ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا محمود شیرانی سے قبل اردو تحقیق کا رجحان بالکل مفقود تھا یا تنقید کی طرح اس کے نقوش بھی علمی وادبی کتابوں میں موجود تھے؟ کیا تحقیق صرف مذہبی اور تاریخی کتب تک محدود تھی؟ کیا مذہبی، تاریخی اور سوانحی تحقیقات ادبی تحقیق کے زمرے میں نہیں آتیں؟ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ تحقیق بجائے خود ایک عمل ہے جس کا ظہور تاریخ میں بھی ہوسکتا ہے اور سوانح میں بھی۔ مذہبی علوم بھی اس کے دائرہ کار میں آسکتے ہیں اور زبان ولغت بھی، تنقید میں بھی اس سے کام لیا جاسکتا ہے اور کسی کتاب کی ترتیب وتدوین میں بھی۔ تحقیق حقائق ومعلومات کو کچھ اصولوں اور ضابطوں کی روشنی میں پرکھ کر پیش کرتی ہے اور ان نتائج تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے جو کسی شخصیت یا فن پارے کی افادیت کو حقیقت واقعہ کی بنیاد پر مستحکم کرتے ہیں اور علمی وادبی روایت کے دھارے سے جوڑتے ہیں۔ اس سلسلے کی دوسری بات یہ ہے کہ اردو میں تحقیق کو ایک باقاعدہ اور علاحدہ فن کے طور پر قبول کرنے کا رجحان مغرب سے لیا گیا اور آج تک اس نے ایک مستقل بالذات فن کی حیثیت حاصل کرلی ہے لیکن تحقیق کے نقوش ہمارے مذہبی علوم میں پہلے سے موجود تھے۔ خصوصاً حدیث اور فن اسماء الرجال میں تحقیق کے بغیر دوقدم بھی آگے نہیں بڑھا جاسکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق کی بعض اصطلاحات دراصل حدیث ورجال ہی کی

اصطلاحات ہیں۔ اس صورت میں کیا یہ ممکن ہے کہ شبلی تحقیق کے عمل سے ناواقف محض ہوں۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تمدنی ترقی کے دور میں جو چیزیں علم وفن کی شکل اختیار کر لیتی ہیں ان کا ہیولیٰ بقول مولانا شبلی پہلے سے موجود ہوتا ہے اور تمدن کے زمانے میں وہ ایک موزوں قالب اختیار کر لیتا ہے اور پھر ایک خاص نام یا لقب سے مشہور ہو جاتا ہے۔

اردو میں عالمانہ تدوین کی عمر بہت مختصر ہے۔ اس کی باقاعدہ ابتدا محمود شیرانی اور مولانا امتیاز علی خان عرشی نے کی۔ بعد میں دوسرے محققین نے بھی تدوین متن کے کام کیے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ آج تدوین کا فن اردو میں تحقیق کی ایک شاخ کے طور پر متعارف ہے اور موجودہ دور میں اس فن کے سب سے بڑے عالم رشید حسن خان (۲۰۰۶ء) اور پروفیسر نذیر احمد (۲۰۰۸ء) شمار کیے گئے ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ تاریخی طور پر اس میدان میں بھی تقدم کی فضیلت شبلی ہی کو حاصل ہے۔ اگرچہ تدوین متن کے سلسلے میں اولین روایت کے طور پر سرسید احمد خان کا نام لیا جاسکتا ہے، لیکن ان کی مرتبہ کتابوں کا تعلق فارسی زبان سے ہے۔ اب تک کی دریافت کے مطابق اردو زبان میں تدوین کی اولین روایت شبلی کا مرتبہ 'گلشن ہند' ہے۔

'گلشن ہند' شعرائے اردو کا قدیم تذکرہ ہے، جو ابراہیم علی خان کے فارسی تذکرے 'گلزار ابراہیم' ۱۷۸۴ء کا اردو ترجمہ ہے۔ اسے مرزا علی لطف نے گل کرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۱ء میں اردو میں تالیف کیا۔ یہ صرف ترجمہ نہیں بلکہ حذف واضافہ اور معلومات کے لحاظ سے ایک علاحدہ تذکرے کی صورت اختیار کر گیا۔ 'گلزار ابراہیم' میں شامل ۳۲۰ شعرا میں سے اس میں صرف ۶۸ شعرا کو شامل کیا گیا ہے۔ لطف کا اپنا ترجمہ بھی شامل ہے۔ اس طور گلشن ہند میں شامل شعرا کی تعداد ۶۹ ہو گئی ہے۔

۱۹۰۲۔۰۳ء میں حیدرآباد کی موسیٰ ندی میں طغیانی میں بہتا ہوا 'گلشن ہند' کا قلمی نسخہ مولوی غلام علی محمد مددگار کیبنٹ کونسل دولت آصفیہ کی ملکیت میں آیا۔ انھوں نے اسے شبلی کی خدمت میں پیش کر دیا اور بقول عبداللہ خان خویشگی:

> ''علامہ موصوف نے اسے غایت درجہ پسند کیا اور انجمن اردو کی طرف
> سے شائع کرنے کا قصد کیا۔ لیکن انجمن اپنی پیچ در پیچ طرز عمل کی وجہ
> سے اس کو نہ چھاپ سکی اور علامہ موصوف نے ہم کو اس کو شائع کرنے

کی رائے دی اور خود اس کے ایڈٹ کرنے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ علامہ
موصوف نے اس کی تصحیح بھی کی اور اس پر کچھ نوٹ بھی لگائے جو بجنسہٖ
چھاپ دیئے گئے ہیں۔''(۳۶)

اس وقت شبلی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے۔ انجمن اسے اپنے محدود وسائل کے سبب شائع نہ کرسکی۔ بعد میں عبداللہ خان ذمہ دار کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد نے رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور سے چھپوا کر حیدرآبا سے مع دیباچۂ لطف ومقدمۂ مولوی عبدالحق اسے شائع کردیا۔ تذکرے پر شبلی کی کوئی تعارفی تحریر نہیں ہے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی اور رفاقت علی شاہد نے تذکرے پر شبلی کے مقدمے کی اطلاع دی ہے جو غلط ہے۔

گلشن ہند کا دوسرا ایڈیشن محی الدین قادری زور نے مرتب کیا۔ انھوں نے گلزار ابراہیم اور گلشن ہند دونوں کو یکجا ترتیب دیا۔ یہ دونوں تذکرے یکجا طور پر مع مقدمہ عبدالحق بر تذکرہ گلشن ہند اور مقدمہ محی الدین قادری زور بر تذکرہ گلزار ابراہیم اور بدون دیباچہ لطف بر گلشن ہند ۱۹۳۴ء میں مطبع مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے چھپ کر شائع ہوا۔ اس کے شروع میں طبع اول پر شامل عبداللہ خان کی تحریر بہ عنوان 'پبلشر کی التماس' کو برقرار رکھا گیا ہے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس پر سرورق طبع اول کا چسپاں ہے جس سے بادی النظر میں یہ دھوکا ہوتا ہے کہ یہ طبع اول ہی ہے۔ بعض قلم کاروں کو تسامح بھی ہوا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے رسالہ 'نگار' کراچی کے تذکرہ نمبر میں لکھا ہے:

''گلزار ابراہیم کو ۱۹۰۴ء میں گلشن ہند کے ساتھ عبداللہ خان نے
حیدرآباد دکن سے شائع کیا۔ اس میں مولوی عبدالحق اور محی الدین
قادری زور دونوں کے مقدمات شامل ہیں۔ مولوی صاحب کا مقدمہ
گلشن ہند پر اور زور کا مقدمہ گلزار ابراہیم پر ہے۔ یہ تذکرہ دراصل زور
کا مرتب کیا ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے گلشن ہند اور گلزار ابراہیم
دونوں کی عبارتیں درج کردی ہیں اور جہاں کہیں اختلاف ہوا ہے
اسے واضح کردیا ہے۔''(۳۷)

۱۹۰۶ء میں محی الدین قادری زور کا اسے ترتیب دینا کیوں کر ممکن ہوسکتا ہے جب کہ ان کا سال پیدائش ۱۹۰۴ء ہے۔ دراصل طبع دوم پر دو سرورق استعمال کیے گئے تھے۔ایک سرورق پتنگی کاغذ کا چسپاں کیا گیا تھا جس پر مرتب کی حیثیت سے سید محی الدین قادری زور کا نام درج تھا اور دوسرا سرورق طبع اول کے مطابق تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پتنگی کاغذ کا سرورق کم زور ہونے کے سبب جلد ضائع ہوگیا اور طبع اول کا سرورق باقی رہا جو تسامح کا سبب بنا۔راقم الحروف نے دونوں نسخوں کو دیکھا ہے۔سطور آئندہ میں طبع اول کے حوالے ہی سے گفتگو کی جائے گی۔

شبلی کے مرتبہ گلشن ہند پر تفصیلی مضمون ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی نے لکھا ہے۔اس مضمون میں انھوں نے تصحیح متن وتحشیہ نگاری کے سلسلے میں شبلی کی کاوشوں کا جائزہ لیا ہے اور کثرت سے مثالیں درج کی ہیں۔انھوں نے لکھا ہے:

''گلشن ہند کی تصحیح وتدوین میں علامہ شبلی نے کن اصولوں کو پیش نظر رکھا تھا اس کی انھوں نے کہیں وضاحت نہیں کی ہے البتہ ان کے قلم سے جو حواشی و وضاحتی نوٹ ہیں، ان سے طریقۂ تصحیح وتدوین کا کسی قدر اندازہ ضرور ہوتا ہے اور اس کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ علامہ شبلی نے اپنے ہی تحقیق وتدوین کے اصولوں سے بڑی حد تک کام لیا ہے۔انھوں نے اصل سے تحقیق ومراجعت بھی کی ہے اور وضاحتی نوٹ بھی لکھے ہیں۔بعض اضافے بھی کیے ہیں، املا کی تصحیح بھی کی ہے۔اس کے علاوہ مفید علمی وتنقیدی حواشی لکھے ہیں۔ ان ہی پانچ بنیادی امور سے تذکرہ 'گلشن ہند' مزین ہوکر طبع واشاعت کی منزل سے گزرا۔'' (۳۸)

تصحیح متن کے لیے گلشن ہند کے خطی نسخے کا دوسرے دستیاب نسخوں سے تقابل ضروری تھا جو ممکن نہ ہوسکا۔(غالباً اس کے کسی دوسرے نسخے کا علم اس وقت تک نہ تھا) متن میں جہاں تہاں جو خلا تھے وہ بڑی حد تک شبلی نے پر کرنے کی کوشش کی لیکن بعض مقامات ان کی نظروں سے اوجھل رہے۔یہ نہیں کہا جاسکتا کہ شبلی کی معلومات ان مقامات کا احاطہ نہیں کرسکتی تھی۔البتہ ان مقامات کی موجودگی ہی سے یہ خیال مستحکم ہوجاتا ہے کہ تصحیح وتحشیہ کا کام فرمائش پر عجلت میں کیا گیا ہے۔

غرض کہ شبلی کی یہ کاوش تاریخی طور پر اردو میں تصحیح متن کی اولین روایت کا درجہ ضرور رکھتی ہے۔نقش اول

ہونے کے سبب اس میں خامیاں تو تلاش کی جاسکتی ہیں مگر شبلی کی تحقیقی حیثیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

گارساں دتاسی (۱۷۹۴تا۱۸۷۸):

گارساں دتاسی پیدائش ۱۷۹۴ء وفات ۱۸۷۸ء: اردو زبان وادب کے فروغ میں مستشرقین کی بڑی خدمات رہی ہیں۔ انھوں نے مختلف ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جب اہلِ اردو ان سے پوری طرح واقف نہیں تھے۔ یہاں ہمارا مقصد ان تمام مستشرقین کی خدمات کا جائزہ لینا نہیں ہے بلکہ اردو کے اس محسن کے کارناموں کا تذکرہ کرنا ہے، جسے گارساں دتاسی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ گارساں دتاسی وہ پہلا شخص ہے جس نے اردو ادب کے متعلق سنجیدہ تحقیقات کا سلسلہ شروع کیا۔ اس نے بچپن سے ہی مشرقی علوم سے دلچسپی لینا شروع کر دیا تھا۔ اول اس نے عربی زبان سیکھی اور اس کے بعد ہندوستانی۔ ہندوستانی زبان سے اس کی دلچسپی اس قدر بڑھی کہ اس نے اس میں تحقیقات شروع کر دیں۔ ۱۸۲۵ء میں میر تقی میر کی مثنوی تنبیہ الجمال کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ اس طرح اس کا ذوق روز بروز بڑھتا گیا اور اسے احساس ہوا کہ اردو شعرا کے کلام کو سلیقے کے ساتھ ترتیب دیا جائے۔ اس سلسلے میں اس کی نظر سب سے پہلے کلام ولؔی پر پڑی اور اس نے ولؔی کا کلام مدون کر کے ۱۸۳۳ء میں شاہی پریس سے شائع کروایا۔ جن نسخوں کی بنا پر اس نے یہ متن مدون کیا، اس کے بارے میں لکھتا ہے:

> ''دیوان ولؔی کو ترتیب دیتے وقت میرے پاس چھ مختلف نسخے تھے۔ جن میں سے کئی اچھی حالت میں تھے۔ (اور اس نے ان کے چربے بھی اپنی کتاب میں دیئے ہیں) بعد ازاں میں نے چار مختلف نسخے حاصل کیے۔ جن میں سے ایک لال قلعہ کے شاہی کتب خانے کا ہے اور اس میں محمد شاہ رنگیلے کی مہر ہے یہ نسخہ بہت ہی اچھی حالت میں ہے۔ ان نئے نسخوں کے مطالعہ سے بھی تصدیق ہوئی کہ میں نے جو متن طبع کیا وہ صحیح ہے۔ میں یہ کہنے کی جسارت کرسکتا ہوں کہ میرا ایڈیشن صحیح ہے۔ کیوں کہ میں نے نئے ایڈیشن کی طرح متن کو بدلنے

کی کوشش نہیں کی۔ ہر مصرعے کی بحر اور وزن کو جانچ لیا۔ ساتھ ساتھ
میں نے دکنی کے محاورے اور ہر ترکیب کو جوں کا توں رہنے
دیا۔''(۳۹)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے کتنے سلیقہ اور محنت سے کلام وؔلی کو مدون کیا۔ یہ انیسویں صدی کے معیار تدوین کے لحاظ سے بہت قابل قدر کارنامہ ہے۔ گارساں دتاسی نے اپنے مرتبہ دیوان میں مقدمہ کے طور پر وؔلی کے حالات زندگی اور خصوصیات کلام پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

بعدازاں اس نے تاریخ ادبیات ہندوئی و ہندوستانی لکھی جو دو جلدوں میں علی الترتیب ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔ اس ایڈیشن کی جلد اول کے شروع میں ایک تمہید ہے۔ اس کے بعد اردو ہندی کے ۷۳۸ شعرا کی زندگی اور ان کی تصنیفات کا حال درج ہے۔ آخر میں ایک ضمیمہ ہے۔ اس کے علاوہ کتابوں اور اشخاص کا اشاریہ بھی ساتھ میں دیا ہے۔ اس میں ۶۴۶ صفحات ہیں۔ دوسری جلد ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔ اس میں جلد اول میں شامل مصنفین کی تخلیقات کے نمونے کے ساتھ ان پر تبصرہ بھی ہے۔ اس کی دوسری اشاعت تین جلدوں میں عمل میں آئی۔ جن میں اولین دو ۱۸۷۰ء میں اور تیسری ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی۔ اس ایڈیشن میں گارساں دتاسی نے ترمیم واضافے بھی کیے۔ پہلی جلد میں طویل اور مبسوط مقدمے کے بعد ایک ہزار دوسو بائیس مصنفین کا تذکرہ ہے۔ دوسری جلد میں بغیر کسی مقدمے اور تمہید کے ایک ہزار دوسو مصنفین کا تذکرہ ہے۔ تیسری جلد میں ایک مختصر سے اشتہار کے بعد آٹھ سو ایک ادیبوں کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ اس طرح ان تین جلدوں میں تین ہزار دوسو تیئیس ہندوستانی شاعروں اور ادیبوں کا حال بیان کیا ہے۔

گارساں دتاسی کا یہ کارنامہ بہت اہم ہے۔ وہ کام جو ہندوستانی نہیں کر سکے وہ اس نے فرانس میں بیٹھ کر انجام دے دیا۔ گارساں دتاسی نے جو تاریخ لکھی وہ اردو ادب کی پہلی تاریخ (اگرچہ اس کی ترتیب بھی بعض مجبوریوں کی وجہ سے حروف تہجی کے مطابق ہی عمل میں آئی ہے) کہی جاسکتی ہے۔ یہ الگ بات کہ یہ سوال آج بھی تشنۂ تحقیق ہے کہ اس کا پیش کردہ مواد کتنا معتبر ہے۔ اس سلسلے میں اگر اس کے بیانات کو جانچ لیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ کیوں کہ گارساں دتاسی فرانس میں بیٹھ کر یہ سب کچھ لکھ رہا ہے۔ اس لیے اولاً وہاں مواد کی کمی تھی دوسرے جن لوگوں سے خط و کتابت کے ذریعہ معلومات حاصل کرتا تھا، ان کی بیان کردہ

روایات پر اکتفا کرنے کے سوا اس کے پاس دوسرا کوئی ذریعہ بھی نہ تھا۔ تیسرے تذکروں اور دوسری کتابوں کا استعاراتی انداز سے اکثر اسے غلط فہمی بھی ہوئی ہے۔ اس لیے اس کے پیش کردہ مواد میں اگر اسقام رہ گئے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ مگر اس نے بڑے خلوص کے ساتھ یہ کوشش کی کہ جہاں تک ممکن ہو شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں صحیح اور ضروری معلومات فراہم ہو جائے۔ اس نے مروجہ تذکروں کے برخلاف زیر بحث شاعر یا ادیب کی زندگی کے حالات، شخصی دلچسپیاں، ذہنی ارتقا اور قوت تنقید وغیرہ سے کماحقہٗ واقف کرانے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح اس کی تالیف کردہ تاریخ ادب معلومات کا خزانہ ہے جس میں شاعر اور نثر نویسوں کے علاوہ مدیر اور پبلشرز بھی شامل ہیں۔

اس کے علاوہ اس نے مختلف ادبی موضوعات پر مقالے بھی تحریر کیے۔ جن کا میری ناقص معلومات کے مطابق اب تک اردو میں ترجمہ نہیں ہو سکا ہے۔ ان میں سے کچھ کا ذکر پروفیسر ثریا حسین نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ اس سے اس کی علمی تحقیقات سے دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ ہر تعلیمی سال کے شروع میں ہندوستانی زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت سے متعلق ترقیات پر اپنا خطبہ دیا کرتا تھا۔ جس کا سلسلہ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۷۷ء تک ہر سال (سوائے ۱۸۵۸ء) برابر چلتا رہا۔ جو بعد میں کتابی شکل میں (۱۸۵۰ء تا ۱۸۶۹ء) پیرس سے ۱۸۷۴ء میں شائع ہوئے۔ اور ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۷ء تک کے خطبات الگ شائع ہوئے۔ ان تمام خطبات کے تراجم اولاً اردو سہ ماہی اورنگ آباد میں شائع ہوتے رہے۔ بعد میں انھیں کتابی شکل میں ۱۸۳۵ء میں خطبات گارساں دتاسی (۱۸۵۰ء تا ۱۸۶۹ء) کے نام سے اور ۱۹۴۳ء میں مقالات گارساں دتاسی (دو جلدیں) کے نام سے انجمن ترقی اردو نے شائع کیا۔ یہ خطبات نہ صرف ادبی لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں بلکہ یہ اس دور کی علمی، ادبی، سیاسی، مذہبی، تہذیبی اور تمدنی زندگی کا آئینہ بھی پیش کرتے ہیں۔ اگر کسی کو اردو ہندی کے تنازعہ کی صحیح صورت حال سمجھنا ہو تو ان خطبات کا مطالعہ بہت ہی کارآمد ثابت ہوگا۔ بہرحال گارساں دتاسی نے جو کارنامے انجام دیے اس کے لیے اردو دنیا اس کی ممنون احسان رہے گی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس میں جو اسقام رہ گئے ہوں انھیں دور کر کے اس کی تالیفات کو ازسرنو مرتب کیا جائے۔

مولوی عبدالحق (۱۸۷۰تا۱۹۶۱):

اردو زبان کے ابتدائی محققین میں مولوی عبدالحق کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔مولوی عبدالحق نے اپنی تمام زندگی اردوزبان وادب کی تحقیق وترویج میں گزار دی خصوصاً اردو تحقیق ان کا پسندیدہ میدان رہا ہے۔ان کی پیدائش ۲۰/اگست ۱۸۷۰ء میں اتر پردیش کے ضلع میرٹھ کے قصبہ ہاپوڑ میں ہوئی۔دسویں تک کی تعلیم پنجاب میں مکمل کی۔مزید تعلیم کے حصول کے لیے علی گڑھ تشریف لائے ۔ وہاں ۱۸۸۸ء میں انٹر میڈیت میں داخلہ لیا۔انٹر کی کامیابی کے بعد ۱۸۹۴ء میں بی۔اے۔بھی کامیاب کرلیا۔(عبدالحق ہندوستانی ادب کے معمار)

علی گڑھ میں انھیں اردو کی عظیم ہستیوں کا ساتھ نصیب ہوا۔جن میں سرسید احمد خان،علامہ شبلی نعمانی، پروفیسر تھامس آرنلڈ،مولانا حالؔی،وقارالملک اور محسن الملک جیسی عالم وقابل ہستیاں شامل تھیں۔علی گڑھ کی علمی فضاؤں میں عبدالحق کی تمام تر صلاحیتیں نکھریں اوراردوزبان وادب کی خدمت کا جذبہ فروغ پایا۔چنانچہ انھوں نے اردوزبان وادب کی ترقی وترویج کو اپنا مقصود حیات بنالیا۔۱۸۹۴ء میں ملازمت کی تلاش میں علی گڑھ سے ممبئی پہنچے۔وہاں حیدرآباد کے نواب محسن الملک سے ملاقات ہوئی جو ریاست حیدرآباد کے ہوم سکریٹری تھے۔ملازمت کے سلسلے میں انھوں نے رہنمائی کی۔چنانچہ ۱۸۹۴ء میں حیدرآباد تشریف لے گئے۔

حیدرآباد میں اپنی ملازمت کا آغاز ۱۸۹۶ء میں کیا۔ان کی اولین ملازمت مدرسہ آصفیہ کے صدر مدرس کی حیثیت سے رہی۔اس کے بعد ہوم آفس حیدرآباد میں مترجم کی خدمات انجام دیں۔اسی دوران تصنیف وتالیف میں خاص دلچسپی لینی شروع کردی۔ان کی ادبی زندگی کا غالب حصہ تحقیق وترتیب متن اور ترتیب انتخابات پر محیط ہے۔انھوں نے دوسرے موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔تاہم یہاں ان کے دیگر کاموں سے قطع نظر صرف ان کے تحقیقی کاموں کا جائزہ لیا جائے گا۔

گلشن ہند: علی ابراہیم خان نے تذکرہ گلزار ابراہیم کے عنوان سے شعرائے اردو کا تذکرہ لکھا تھا۔ گلکرسٹ کی فرمایش پر ۱۸۰۱ء میں مرزا علی لطف نے اس تذکرے کا اردو ترجمہ کیا اوراس کا نام ’گلشن ہند‘ رکھا۔یہ صرف لفظی ترجمہ نہیں تھا بلکہ لطف نے اس میں بہت کچھ اضافہ بھی کیا تھا۔جس کی بنا پر لطف کی اپنی

تصنیف لگتی ہے۔اس تذکرہ پر مولوی عبدالحق نے مقدمہ لکھا اور مولانا شبلی کی تصحیح و تحشیہ کے ساتھ ۱۹۰۶ء میں شائع کیا۔مقدمہ میں مولوی عبدالحق نے اردو زبان و ادب کی تاریخ کے ساتھ فورٹ ولیم کالج کی خدمات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کے متعلق پہلی مرتبہ اس طرح کا مضمون سامنے آیا تھا۔یہ مضمون نہایت ہی تلاش و تحقیق کے بعد لکھا گیا تھا اور کافی مفصل معلومات فراہم کی گئی تھیں۔خاص کر اس مضمون کی وجہ سے ڈاکٹر گلکرسٹ کی خدمات کا تعارف ممکن ہو سکا۔گلکرسٹ کی اردو خدمات کا جائزہ لے کر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''اس شخص نے اس وقت کے قابل قابل لوگ بہم پہنچائے اور مختلف کتابیں لکھوانا شروع کیں۔حقیقت یہ ہے کہ اردو نثر کا لکھنا اسی وقت سے شروع ہوا۔۔۔جو احسان ولیؔ نے اردو نظم پر کیا تھا اس سے زیادہ نہیں تو اسی قدر احسان جان گلکرسٹ نے اردو نثر پر کیا ہے۔''(۴۰)

اردو ادب کی تدوین کا یہ پہلا کام تھا اور یہ کام مولوی عبدالحق کے اہم مقدمہ کے ساتھ منظر عام پر آیا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس مقدمہ کی اولیت اور اہمیت کے باوجود اس میں ایک اہم کمی کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔وہ یہ کہ اس مقدمہ میں ماخذات اور حوالوں کا کوئی خاص ذکر نہیں ہے۔صرف چند حوالوں کا ذکر کیا گیا ہے تاہم یہ حقیقت بھی ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے کہ اردو ادب میں تدوین کی یہ پہلی کوشش تھی۔اس وقت تک تدوین کے اصولوں کا کوئی خاص تصور ہی نہیں تھا۔اگرچہ یہ مضمون اردو تحقیق کے ابتدائی دور میں اہمیت کا حامل رہا لیکن ہم اسے خاص تحقیق یا تدوین متن کا بڑا کارنامہ نہیں کہہ سکتے البتہ اس مقدمہ کو اولین تحقیقی کوشش ہونے کی وجہ سے اس خامیوں کے باوجود اہم مقام کا حامل قرار دیا جاتا ہے۔

اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام: مولوی عبدالحق کی یہ تحقیقی کتاب ۱۹۳۳ء میں انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) سے شائع ہوئی۔یہ کتاب صرف ۸۴/صفحات پر مشتمل ہے لیکن اس کتاب کی اہمیت ہزاروں صفحات پر مشتمل صفحات سے کہیں زیادہ ہے۔اس کتاب میں پہلی بار زبان اردو کی بالکل ابتدائی شکل دیکھنے کو ملتی ہے اور اردو زبان کی ابتدائی و ارتقائی کڑیوں کو جوڑنے کی کوشش دکھائی دیتی ہے۔اس ضمن میں صوفیائے کرام کی ابتدائی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔چونکہ اردو زبان کو پہلے پہل صوفیائے کرام نے اپنی

تحریروں میں اپنایا تھا اور غیر ارادی طور پر اس زبان کی نشو ونما میں حصہ لیا تھا۔اس لیے اردو زبان کی تاریخ کا مطالعہ ان صوفیائے کرام کی خدمات کے مطالعے کے بغیر نامکمل معلوم ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ مولوی عبدالحق کی اس کتاب کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔سب سے پہلے یہ تحقیقی مقالہ جامعہ عثمانیہ کی مجلس تحقیقات علمیہ سے شائع ہونے والے رسالہ 'مجموعہ تحقیقات علمیہ' کی جلد اول ۱۹۳۳ء میں منظر عام پر آیا۔ پھر اسی سن میں اسے مستقل تصنیف کی شکل دے کر انجمن ترقی اردو سے شائع کیا گیا۔

انتخاب کلام میرؔ: انتخاب کلام میر ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی جس میں میر تقی میرؔ کے کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔اس کتاب پر مولوی عبدالحق نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے جس میں میر کا تعارف اور ان کی شاعری پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے اور 'ذکر میر' کے حوالے سے میرؔ کے حالات مرتب کیے گئے ہیں۔ مقدمے کے آخری حصے میں میرؔ کی شاعرانہ خصوصیات سے بحث کی گئی ہے۔میرؔ کی غزلوں اور قصیدوں اور مثنویوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور بے شمار اشعار بطور حوالہ پیش کیے گئے ہیں۔

ذکر میرؔ: میرؔ کی خودنوشت سوانح ہے جو فارسی زبان میں لکھی گئی تھی۔مولوی عبدالحق نے اس کا اردو ترجمہ کیا اور اس پر ایک عالمانہ مقدمہ لکھ کر ۱۹۲۶ء میں انجمن ترقی اردو سے شائع کیا۔اس کتاب کی ابتدا میں میرؔ کا مختصر سا تعارف اور ادب میں خودنوشت سوانح کی اہمیت پر بحث کی گئی ہے۔ذکر میرؔ کو مولوی عبدالحق نے ہی پہلی بار متعارف کرایا۔اس کتاب کے شائع ہوجانے سے خود میرؔ کے متعلق بہت سی نئی باتوں کا انکشاف ہوا۔میرؔ کے متعلق کئی ایک معلومات جو 'آب حیات' میں پیش کی گئی تھیں، ذکر میرؔ کی روشنی میں ان کی تردید ہوگئی۔ذکر میرؔ کو دو نسخوں کی مدد سے مرتب کیا گیا اور حاشیہ میں اختلاف نسخ بھی تحریر کیے گئے۔

معراج العاشقین: اس قدیم نثری رسالے کو مولوی عبدالحق نے ۲۵-۱۹۲۴ء میں ادبی دنیا سے متعارف کرایا اور اس پر دس صفحہ کا ایک مختصر سا مقدمہ بھی لکھا۔ یہ قدیم رسالہ صرف تیس صفحات پر مشتمل ہے جسے انھوں نے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب کیا تھا۔ بہت بعد ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر حفیظ قتیل نے مختلف شواہد اور دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ یہ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف نہیں بلکہ ان سے بہت بعد مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری کی تصنیف ہے۔

مثنوی خواب وخیال: مولوی عبدالحق نے میر آثر کی مثنوی 'خواب وخیال' کو ۱۹۲۶ء میں مرتب کیا۔ اس مثنوی کا ایک نسخہ ان کے بھائی شیخ ضیاء الحق نے فراہم کیا تھا اور دوسرا نسخہ مولوی نجیب اشرف کو دستیاب ہوا تھا۔ مولوی عبدالحق نے اس پر مقدمہ تحریر کیا۔ مقدمہ میں میر اثر کی زندگی کے حالات اور شاعرانہ خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ مقدمہ میں اس مثنوی کے سنہ تصنیف کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ مرزا شوق کی مثنوی 'خواب و خیال' اور میر اثر کی مثنوی کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔

چمنستان شعرا: لچھمی نرائن شفیق کے تذکرے چمنستان شعرا کو مولوی عبدالحق نے ۱۹۲۸ء میں مرتب کیا۔ اس کتاب کے مقدمہ میں مولوی عبدالحق نے شفیق کے حالات، اس کی تعلیم و تربیت، اس کی تاریخی تصانیف اور اس کے لکھے دوسرے تذکروں پر اظہار خیال کیا ہے۔ شفیق نے ریختہ گو شعرا کا یہ تذکرہ بہت چھوٹی عمر میں ترتیب دیا تھا۔ جیسا کہ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> ''شفیق نے یہ تذکرہ ۱۸ سال کی عمر میں لکھا۔ اس عمر میں ایسی اچھی کتاب کی تالیف کرنا اعجاز سے کم نہیں۔ اس سے شفیق کی غیر معمولی ذہانت اور لیاقت معلوم ہوتی ہے۔ کتاب کا نام 'چمنستان شعرا' تاریخی ہے اور اس سے ۱۱۷۵ھ سن تالیف ملتا ہے۔'' (۴۱)

اس تذکرے کا ایک ہی کرم خوردہ نسخہ دستیاب ہوا تھا، اسی لیے مولوی عبدالحق کو تصحیح کے لیے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اسی بنا پر قیاسی تصحیح سے کام لینا پڑا۔ کچھ حل طلب الفاظ چھوڑ دیے گئے اور اس کی جگہ نقطے ڈال دیے گئے۔ مشکوک اشعار شعرا کے اصل دیوان سے تلاش کر کے لکھے گئے۔ بعض مشتبہ الفاظ کی صحت نہ ہوسکی اور اس کے آگے استفہام کی علامت لکھ دی گئی۔

اس تذکرہ کی ترتیب میں مولوی عبدالحق نے جدت سے کام لیا۔ قاقشال کے تذکرے 'تحفۃ الشعرا' سے ان ریختہ گو شعرا کا حال اور کلام جو شفیق کے تذکرے میں بھی موجود تھا، حاشیے میں درج کر دیا ہے۔ اور جن شعرا کا اردو میں کلام نہیں تھا ان کے صرف حالات ہی حاشیے میں تحریر کر دیے ہیں۔ جہاں حالات میں کوئی نئی بات نہیں تھی وہاں صرف کلام درج کر دیا گیا۔ مشترک کلام کو خارج کر دیا۔ اس طرح کی ترتیب سے شعرا کے تعلق سے زیادہ معلومات حاصل ہوگئیں۔ شفیق کا کلام کی ذیلی سرخی کے تحت شفیق کی شاعری کا جائزہ

بھی لیا ہے۔اوراس کی غزلوں،قصیدوں،مثنویوں کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔

مخزن نکات: شیخ محمد قیام الدین قائم کے تذکرے 'مخزن نکات' کومولوی عبدالحق نے ۱۹۲۹ء میں مرتب کیا۔آغاز میں قائم کے حالات کی تفصیلات پیش کی ہیں،اس کے بعداس تذکرے پر گفتگو کی گئی ہے۔مقدمہ میں قائم کے پیش کردہ حقائق کی تردید کی ہے۔لکھتے ہیں:

> ''قائم کا دعویٰ ہے کہ اس سے قبل کوئی تذکرہ شعرائے ریختہ کے بیان میں نہیں لکھا گیا۔ یہ دعویٰ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ اس سے دو چار سال قبل میر تقی میرؔ اور علی حسینی گردیزی نے اپنے تذکرے لکھے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قائم کوان تذکروں کی اطلاع نہیں تھی۔(۴۲)

سب رس: سب رس کو اردو نثر کی پہلی باقاعدہ کتاب قرار دیا جاتا ہے۔اسداللہ وجہی کی اس ادبی شاہکار کومولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو سے۱۹۳۲ء میں پہلی بارمولوی عبدالحق نے اپنے عالمانہ مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔اس سے قبل وہ انجمن کے ترجمان رسالہ 'اردو' (۱۹۲۷ء) میں اس کتاب کے تعلق سے ایک طویل مقالہ قلم بند کر چکے تھے۔ادبی نثر کے اس اولین نقش کے متعلق مولوی عبدالحق رقم طراز ہیں:

> ''اب تک اردو نثر کی پہلی کتاب فضلی سے منسوب کی جاتی تھی اوراس کی 'کربل کتھا' اردو نثر کی پہلی کتاب سمجھی جاتی تھی لیکن حال ہی میں معلوم ہوا کہ فضلی سے کہیں پہلے نثر میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں مگر پردۂ خفا میں تھیں،تحقیق وجستجو نے انھیں گم نامی سے نکالا ہے۔انھیں میں سے ایک قابل قدر کتاب سب رس ہے۔''(۴۳)

مولوی عبدالحق نے اس کتاب پر کافی طویل اور مبسوط مقدمہ درج کیا ہے جس میں وجہی کی تفصیلات، اس کے اسلوب کا جائزہ اورقدیم اردو کی صرفی اورنحوی خصوصیات کا ذکر کیا ہے نیز اس داستان کے ماخذات کی نشان دہی کی ہے۔ بقول مولوی عبدالحق اس داستان کے قصے کا ماخذ محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کی فارسی مثنوی 'دستورالعشاق' کا ترجمہ 'حسن ودل' ہے۔مولوی صاحب نے اس داستان کو چار نسخوں کی مدد سے مرتب کیا جس میں دو بالکل ناقص نسخے تھے،جس کی بنا پر انھیں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔تدوین کے

دوران پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اول تو قلمی نسخوں کا پڑھنا جن کے رسم خط کی وجہ سے طرح طرح کی غلط فہمی ہو جاتی ہے، پھر ایسی پرانی زبان کا پڑھنا اور سمجھنا جس کے اکثر محاورے اور الفاظ نہ اب بولے جاتے ہیں نہ سمجھے جاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر کاتبوں کی اصلاح یہ ایسی دقتیں ہیں کہ مقابلے، تصحیح اور تحقیق میں بہت وقت صرف ہو جاتا ہے۔''(۴۴)

مولوی عبدالحق نے ۱۹۵۳ء میں 'سب رس' کو دوبارہ کراچی سے شائع کیا۔ یہ اشاعت مزید اور نسخوں کے مطالعہ کے بعد عمل میں آئی۔ اس میں پچھلی اشاعت سے زیادہ اختلافات درج کیے گئے تاہم اس دوسری اشاعت میں بھی بہت ساری اغلاط پائی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں متون کے اختلافات پر زیادہ دھیان نہیں دیا گیا اور مختلف نسخوں کی تفصیلات درج نہیں کی گئیں جن سے اس متن کو مرتب کرنے میں مدد لی گئی تھی۔ اختلاف نسخ کو بھی حاشیوں میں بہتر طریقے سے واضح نہیں کیا گیا۔

۱۹۸۳ء میں ڈاکٹر حمیرا جلیلی نے اپنی کتاب 'سب رس کی تنقیدی تدوین' شائع کی۔ انھوں نے سب رس کی تدوین نو کے لیے جملہ تیرہ نسخوں سے استفادہ کیا۔ وہ مولوی عبدالحق کی مرتبہ 'سب رس' پر تنقید کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> '' مولوی عبدالحق نے اپنی مرتبہ 'سب رس' کے مقدمے میں بتایا کہ انھوں نے سب رس کی ترتیب میں چار نسخوں سے فائدہ اٹھایا ہے، لیکن پتہ نہیں یہ استفادہ کس قسم کا ہے۔ کیوں کہ متن میں صرف ۲۶ مقامات پر ایک آدھ لفظ کے اختلاف کو درج کیا ہے۔''(۴۵)

ان اعتراضات کے باوجود سب رس کی دریافت اور اشاعت مولوی عبدالحق کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ انھیں کی بدولت اردو زبان کی اس پہلی ادبی کاوش سے اہل اردو متعارف ہو سکے۔ مولوی عبدالحق کا یہ کارنامہ تدوین سے زیادہ تعارف متن کے ضمن میں اہمیت رکھتا ہے۔ مولوی عبدالحق کے دوسرے تحقیقی کارناموں میں 'کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی' 'تذکرۂ ہندی از مصحفی' ، 'مخزن الشعرا از فائق'،

'ریاض الفصحا از مصحفی'، 'عقد ثریا از مصحفی'، 'تذکرہ ریختہ گویاں از فتح علی گردیزی'، 'دیوان تاباں'، 'نکات الشعرا از میر تقی میرؔ'، 'تذکرۂ گل عجائب از اسد علی خان تمنا'، 'قطب مشتری از وجہی' وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ تاہم مولوی صاحب کے کارناموں میں اکثر کی حیثیت تحقیقی کم اور تعارفی زیادہ ہے۔ ان تمام تحقیقی کمزوریوں کے باوجود مولوی صاحب کے یہ کارنامے قابل ستائش ہیں جن کے سبب اردو ادب کے اتنے سارے متون سے ادبی دنیا واقف ہو سکی اور اہل تحقیق ان متون کی تحقیق کی طرف متوجہ ہو سکے۔

حواشی

۱۔الیاس اعظمی، دارالمصنفین کی تاریخی خدمات، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ،۲۰۰۲،ص ۴۳

۲۔الطاف حسین حالی، حیات جاوید،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی،۲۰۱۳،ص ۱۶۵

۳۔سر سید احمد خان، تاریخ فیروز شاہی، مشمولہ مقالات سر سید، مرتبہ عبداللہ خان خویشگی، علی گڑھ،ص ۱۱۔۵۱۰

۴۔الطاف حسین حالی، حیات جاوید،ص ۱۲۴

۵۔ڈاکٹر مشتاق احمد، سرسدی کی نثری خدمات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی،۱۹۹۳،ص ۶۷

۶۔الطاف حسین حالی، حیات جاوید،ص ۴۸۔۴۷

۷۔دیباچہ طبع اول بحوالہ ڈاکٹر مشتاق احمد، سرسید کی نثری خدمات،ص ۶۷

۸۔الطاف حسین حالی، حیات سعدی، مرتبہ رشید حسن خان، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی،۱۹۹۲،ص ۱۳۔۱۲

۹۔الطاف حسین حالی، یادگارِ غالب، اترپردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ،۱۹۸۶،ص ۵۔۴

۱۰۔ایضاً،ص ۳

۱۱۔ایضاً،ص ۲

۱۲۔ڈاکٹر وحید قریشی، مطالعۂ حالی، استقلال پریس، لاہور،۱۹۶۱،ص ۹۸

۱۳۔محمد حسین آزاد، آب حیات، اترپردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ،۲۰۰۳،ص ۴۸۲

۱۴۔الطاف حسین حالی، یادگارِ غالب،ص ۹

۱۵۔محمد حسین آزاد، آب حیات،ص ۲۸۴

۱۶۔الطاف حسین حالی، یادگارِ غالب،ص ۱۲

۱۷۔الطاف حسین حالی، حیات جاوید،ص ۲۴

۱۸۔سید عبداللہ، وجہی سے عبدالحق تک، ناز پبلشنگ ہاؤس، دہلی، سن ندارد ص ۲۲۸۔۲۲۷

۱۹۔الطاف حسین حالی، حیات جاوید،ص ۲۴

۲۰۔ڈاکٹرعبدالقیوم،تنقیدی نقوش،ص۳۱

۲۱۔رسالہ''الصلاح''،ص۵۵۳سرائے میر اعظم گڑھ،ستمبر۱۹۲۸بحوالہ مولانا شبلی کا مرتبہ اردوادب میں از عبداللطیف اعظمی،نسیم بک ڈپو،لکھنؤ،۱۹۸۷،ص۶۳

۲۲۔سیدعبداللہ،وجہی سے عبدالحق تک،ص۴۱۸

۲۳۔الطاف حسین حالی،مقالات حالی حصہ دوم،انجمن ترقی اردو جامع مسجد پریس دہلی،۱۹۳۶،ص۱۴۶

۲۴۔محمد حسین آزاد،آب حیات،ص۸

۲۵۔ایضاً،ص ۵۷

۲۶۔ایضاً،ص ۶۱

۲۷۔سیدسجاد(مرتب)،آب حیات کا تنقیدی وتحقیقی مطالعہ،اعجاز پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۱۹۸۵،ص۸۸

۲۸۔محمد حسین آزاد،آب حیات،ص۱۹۵

۲۹۔تنویراحمدعلوی،کلیات ذوق،قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان،نئی دہلی،۲۰۰۵،ص۴۸

۳۰۔رشیدحسن خان،ادبی تحقیق:مسائل اور تجزیہ،اترپردیش اردو اکیڈمی،لکھنؤ،۱۹۹۰،ص۱۴۲

۳۱۔خلیق احمد نظامی،شبلی بحیثیت محقق مشمولہ معارف،دارالمصنفین اعظم گڑھ مارچ۱۹۸۶

۳۲۔رشیدحسن خان،ادبی تحقیق:مسائل اور تجزیہ،ص۲۹۴

۳۳۔سیدشہاب الدین دسنوی،شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں،انجمن ترقی اردو ہند،دہلی،۱۹۸۷،ص۷

۳۴۔محمدامین زبیری وسید یوسف قیصر،شمسی مشین پریس آگرہ،۱۹۲۶،ص۳۶

۳۵۔پروفیسر نذیر احمد،حافظ محمود شیرانی:تحقیقی مطالعے،غالب انسٹی ٹیوٹ،دہلی،۱۹۹۱،ص۷

۳۶۔محی الدین قادری زور،گلزارِ ابراہیم وگلشن ہند،انجمن ترقی اردو ہند،دہلی،باردوم،۱۹۳۴،ص

۳۷۔رسالہ''نگار''تذکروں کا تذکرہ نمبر،ص۳۷

۳۸۔الیاس اعظمی،تذکرہ گلشن ہند اور علامہ شبلی نعمانی،مشمولہ ہماری زبان،دہلی،۲۲۔۲۸ر جنوری ۲۰۰۵

۳۹۔گارساں دتاسی،مقالات گارساں دتاسی حصہ دوم،انجمن ترقی اردو ہند،اورنگ آباد،۱۹۴۱،
ص۲۰۷۔۲۰۶

۴۰۔مولوی عبدالحق، ''مقدمہ گلشن ہند''، مرتبہ مولانا شبلی حیدر آباد، ۱۹۰۶، ص ۵

۴۱۔ڈاکٹر عبادت بریلوی، مقدمات عبدالحق، دہلی، ۱۹۷۳، ص ۵۳

۴۲۔ایضاً، ص ۲۲

۴۳۔ایضاً، ص ۲۷۱

۴۴۔ایضاً، ص ۳۱۱

۴۵۔ڈاکٹر حمیرا جلیلی، سب رس کی تنقیدی تدوین، حیدر آباد، ۱۹۸۳، ص ۱

باب دوم

اردو تحقیق (۱۹۲۰ کے بعد)

(الف) لسانی تحقیق

(محمود شیرانی، نصیرالدین ہاشمی، محی الدین قادری زور، مسعود حسین خاں، سیدہ جعفر)

(الف) لسانی تحقیق

محمود شیرانی:

حافظ محمود شیرانی کی پیدائش ۱۵/ اکتوبر ۱۸۸۰ء کو ٹونک (راجستھان) میں ہوئی اور وہیں ۱۵/ فروری ۱۹۴۶ء کو پیوند خاک ہوئے۔ وہ اپنے وقت کے مشہور محقق، عالم و فاضل تھے۔ تحقیق و تنقید کے میدان میں آج بھی ان کا شمار صف اول میں ہوتا ہے۔ وہ زندہ رہے تو تاریخی کرداروں کو زندہ کرتے رہے اور مرے تو تاریخی کرداران کو زندہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے اردو تحقیق کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا، انھیں 'تحقیق کا معلم اول' کہا جاتا ہے۔

محمود شیرانی ایک ایسے اسکالر تھے جن کی اسکالرشپ کا دائرہ نہ صرف اردو اور فارسی بلکہ تاریخ اور دوسرے مضامین جیسے فلسفہ وغیرہ سے بھی متعلق تھا۔ وہ ان عالموں میں تھے جنھوں نے اردو تحقیق میں بہت ٹھوس کام کیے۔ شیرانی کی تاریخی اہمیت یہی ہے کہ انھوں نے ادبی تحقیق کے میدان میں بت شکنی کا آغاز کیا۔ شبلی اچھے ادیب ہیں، مسلم شعری ذوق رکھتے ہیں، محمد حسین آزاد انشا پرداز ہیں، اردو ادب کے محسن ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد پروفیسر بڑی ڈگریوں کے مالک ہیں لیکن زبان و ادب کے رموز سے واقف نہیں۔ اس لیے ان کی تحقیقات پر مکمل بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ محمود شیرانی بت شکنی کرتے رہے اور لکھنے والوں کو سکھاتے رہے کہ اور محتاط بنیے۔ جستجو میں مزید گہرائی کے لیے علم میں مزید گیرائی پیدا کیجیے۔

شیرانی کا طریقۂ تحقیق یہ تھا کہ لوگ جو بات اب تک مانتے چلے آتے ہیں بلا تحقیق اسے کیوں مان لیا جائے۔ پہلے وہ تحقیق کرتے تھے، پھر وہ جن نتائج پر پہنچتے تھے بے کم و کاست بیان کر دیتے تھے۔ خواہ وہ دوسروں کے لیے برہمی کا باعث ہی کیوں نہ ہو۔ شیرانی نے ادبی تحقیق کے میدان میں جو سرمایہ چھوڑا ہے وہ اصول تحقیق اور عملی تحقیق دونوں کو سمجھنے اور نمونہ بنانے کے لیے آج بھی معاون ہے۔ شیرانی کی تحریروں سے یہ اصول و ضوابط اخذ کیے جا سکتے ہیں کہ حقیقت کی تلاش و جستجو نہایت دشوار مگر دلچسپ کام ہے۔ یہ کام کسی مادی

لالچ اور حصول زر کے لیے نہیں کیا جا سکتا۔ تحقیق کے لیے تقلیدی انداز سم قاتل ہے۔ شیرانی کے نزدیک محقق کو خوش اعتقاد نہیں بلکہ متشکک ہونا چاہیے۔ مثبت تشکیک کے جذبے کے ساتھ دریافت کردہ سچائیوں کو بے کم و کاست بیان کرنا تحقیق کا تقاضا ہے۔ اپنے ذہنی مغالطوں کے سبب کسی دوسرے مصنف کو لعن طعن کرنا ان کے نزدیک ناپسندیدہ بات تھی۔ دوسروں کی تحقیق کا احتساب کرتے وقت اس کے کام کی اہمیت اور اس کے مثبت پہلو کا اعتراف کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ جس تالیف پر تحقیق کی جائے اس کے مؤلف کو اس کی اطلاع ضرور ہونی چاہیے۔ صرف اغلاط کی نشان دہی کافی نہیں بلکہ درست واقعات وحقائق کے انکشاف کو تحریر میں لانا ضروری خیال کرتے تھے۔ محقق کے لیے ضروری ہے کہ متعلقہ زبان کے تمام ارتقائی مراحل سے واقف ہو۔ انھوں نے ماخذ کی تلاش پر زور دیتے ہوئے تحقیق کو مآخذ کی درجہ بندی اور معیارگری کا انتہائی اہم سبق بھی سکھایا ہے۔ بغیر دیکھے کسی کتاب کا حوالہ نہیں دینا چاہیے۔ ساتھ ہی دوسرے اہم علم کی تحقیقات سے استفادہ ضرور کرنا چاہیے۔

محمود شیرانی کے بیٹے اختر شیرانی دوسرے میدان کے تھے۔ ہاں اختر کے بیٹے یعنی محمود شیرانی کے پوتے مظہر محمود شیرانی ان کے جانشین ثابت ہوئے۔ مظہر محمود شیرانی نے حافظ محمود شیرانی کے مقالات کو آٹھ جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ ان مقالات میں ان کی شائع شدہ اکثر کتابیں اور مقالات آ گئے ہیں جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ، مسکوکات، عروض، لغات اور ادب کی آمیزش سے انھوں نے ادبی تحقیق کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ علمی معاملات میں وہ سخت محنت کے عادی تھے۔ ذہن میں اعتدال اور توازن تھا۔ ان کا تحریری کام وسیع بھی ہے اور رنگارنگ بھی۔ انھوں نے لسانیات، تحقیق، تدوین، تنقید، تاریخ، عروض اور مسکوکات میں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

لسانیات کے میدان میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی کتاب 'پنجاب میں اردو' ہے۔ یہ کتاب صحیح معنوں میں اردو لسانیات کے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ اس موضوع پر لکھنے کے لیے نہ صرف زبان کے مختلف پہلوؤں پر گہری نظر رکھنا ضروری ہے بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ سے کماحقہ واقفیت بھی ضروری ہے۔ محمود شیرانی مسلمانان ہند کی تاریخ کا شعور رکھتے تھے۔ اس کتاب میں شیرانی کو متعصب ہونے

کا طعنہ نہیں دیا جاتا۔ وہ پنجاب کے متوطن نہ تھے۔ انھوں نے بڑی ایمان داری سے کام کیا ہے۔ 'پنجاب میں اردو' نے ہی محمود شیرانی کو اردو دنیا میں زندگی جاوید عطا کی ہے۔ اس کتاب کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے محمود شیرانی نے لکھا ہے کہ: ''اس تالیف کا نام اس کے آخری باب 'پنجاب میں اردو' کی رعایت سے لکھا گیا ہے جو تمام وکمال پنجاب کے اردو گوشعرا کے ذکرواذکار سے مملو ہے۔''(۱)

محمود شیرانی نے سب سے پہلے اس پونے دوسو برس کے عرصے کی لسانی اہمیت اجاگر کی ہے جو فتح دہلی سے پہلے مسلمانوں نے پنجاب میں گزارا تھا۔ اردو اور پنجابی میں قریبی مشابہت سے شیرانی نے یہ نظریہ اخذ کیا کہ اردو کی بنیاد اس بولی پر قائم ہوتی ہے جو دہلی کے فتح کے وقت مسلمان پنجاب سے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

'پنجاب میں اردو' میں انھوں نے اردو زبان کے سلسلے میں رائج تھیوری کو غلط ثابت کر کے اپنی نئی تھیوری سے لوگوں کو روشناس کرایا، لیکن فوراً ہی تردیدیں شائع ہونے لگیں اور کچھ ماہرین لسانیات نے ان کے اس کام پر بھرپور وار کر کے اس تصور اور نظریہ کو پیچھے کی طرف ڈھکیل دیا۔

شیرانی کا یہ نظریہ کہ اردو زبان کا اصل ماخذ پنجابی ہے، مکمل طور پر ان کا نہیں۔ اس کی جھلکیاں کئی ماہرین لسانیات کی تحریروں میں مل جاتی ہیں۔ کتابی صورت میں باقاعدہ تھیوری بنا کر پیش کرنے کا سہرا ان ہی کے سر بندھتا ہے۔ حافظ شیرانی گریرسن کے تعارف میں لکھتے ہیں: ''ان کو لسانیات ہند کا دیوتا کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان کی تالیف 'جائزہ لسانیات ہندوستان' اس کے ضخیم مجلدات ان کے علم وفضل کی شاہد وعادل ہیں۔''(۲)

محمد حسین آزاد کی 'آب حیات' نے ایک عرصہ تک اردو لسانیات پر توجہ دینے والوں کو غلط راستوں پر بھٹکائے رکھا۔ ہاں شیرانی کی کتاب 'پنجاب میں اردو' صحیح راستے کے تعین کی ایسی کوشش کہی جاسکتی ہے جو کامیاب رہی لیکن بدقسمتی سے اسے صوبائی عصبیت کا شاخسانہ قرار دے کر غلط تنقید کا نشانہ بنایا گیا اس کے باوجود اردو کے لسانیاتی مطالعے پر پنجاب میں اردو کے مثبت اور گہرے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

محمود شیرانی سے پہلے اردو دنیا کی ادبی تحقیق ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی ا۔ انھوں نے اسے پائیدار

بنیادوں اور جدید مغربی اصولوں پر قائم کیا۔ انھوں نے ہمارے تحقیقی معیار کو بلند کرنے کے لیے اصلاحی تحقیق سے کام لیا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی کتاب 'تنقید شعر العجم' اور 'تنقید آب حیات' مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی خدمات سے ہمارے علمی و تحقیقی معیار کو پستی سے اٹھا کر بلندیوں سے روشناس کرایا ہے۔

قدیم اردو کے ارتقا کے مقابلے میں جدید اردو شعر و ادب پر شیرانی کا کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ 'تنقید آب حیات' اور ایک حد تک 'تنقید دیوان ذوق' کے حوالے سے انھوں نے اس ضمن میں قابل قدر کام کیا ہے۔ 'آب حیات' کی زبان کے وہ قدردان اور پرستار تھے اور 'آب حیات' کے لیے مواد کی فراہمی کے سلسلے میں مولانا آزاد کی محنت شاقہ کے بھی وہ قائل تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب 'آب حیات' جب منظر عام پر آئی تو اس کی خوب قدر ہوئی ساتھ ہی مخالفانہ تنقید بھی شروع ہوئی۔ محمد حسین آزاد نے اپنے ناقدین کے کچھ اعتراضات کو دوسری اشاعت میں دور کرنے کی کوشش بھی کی۔ وقت گزرتا گیا اور 'آب حیات' پر تنقید میں اضافہ ہوتا گیا۔ 'آب حیات' کے نقادوں میں مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی، شیخ چاند اور مولانا عبدالحئی وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ ان لوگوں نے محمد حسین آزاد کو فرائض سے غفلت برتنے والا بتایا۔ محمد حسین آزاد کے دفاع میں خود شیرانی نے حصہ لیا ہے۔ ۱۹۳۳ء ہی میں ان کا مرتبہ حکیم قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ 'مجموعۂ نغز' شائع ہوا۔ اس کے مقدمہ میں محمود شیرانی نے یہ انکشاف کیا کہ یہ تذکرہ محمد حسین آزاد کی مشہور تالیف 'آب حیات' کا ایک اہم ماخذ ہے۔

محمد حسین آزاد نے 'آب حیات' میں بعض جگہ 'مجموعۂ نغز' کے حوالے دیے ہیں۔ اکثر مقامات پر انھوں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔ محمود شیرانی نے 'آب حیات اور مجموعۂ نغز' کے عنوان سے دونوں کتابوں کا تقابلی مطالعہ کر کے ایک مقالہ لکھا ہے کہ کن کن مقامات پر محمد حسین آزاد نے خوشہ چینی کی ہے:

''نکات الشعرا' اور 'ذکر میر' کے چھپنے پر میرؔ صاحب کے سلسلے میں مولانا بہت بدنام ہوئے مگر جب 'مجموعۂ نغز' شائع ہوا تو دنیا کو صاف معلوم ہوگیا کہ مولانا کے بیانات بے بنیاد نہ تھے۔'' (۳)

آغا باقر نے اپنے استاد محمود شیرانی سے 'آب حیات' کا تنقیدی جائزہ لینے کی درخواست کی جسے انھوں

نے منظور کر لیا۔ اس تنقید کی صرف تین ہی قسطیں شائع ہوئی تھیں کہ آغا محمد باقر گھبرا گئے اس لیے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ اس کے ڈھائی برس بعد 'دیوان ذوق' پر اس وقت تنقید شروع ہوئی جب وہ ملازمت سے سبک دوش ہو چکے تھے۔ چنانچہ حافظ محمود شیرانی نے دیوان ذوق پر تین حصوں 'تنقید دیوان ذوق مرتبہٗ آزاد'، 'دیوان ذوق پر آزاد کی اصلاحات' اور 'دیوان ذوق پر آزاد کے اضافے' پر مشتمل مقالہ لکھا۔ دوسرا اور تیسرا حصہ تصحیح و تحقیق متن سے تعلق رکھتا ہے۔ جب کہ پہلا حصہ دیوان ذوق کے مقدمے میں ذوق کی سوانح سے متعلق ہے۔ شیرانی نے 'آب حیات' میں پیش کردہ سوانح ذوق کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا ہے۔

اردو زبان و ادب کی کوئی بھی تاریخ حافظ محمود شیرانی کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ ان کی مشہور تصنیف 'پنجاب میں اردو' اپنی دیگر خوبیوں کے باوجود دو باتوں کے لحاظ سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ اول یہ کہ اس میں شیرانی نے اردو زبان کا مولد سرزمین پنجاب کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ شیرانی کا کہنا ہے کہ:

> ''اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے۔ بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں گے۔'' (۴)

انھوں نے یہ دعویٰ بالکل نہیں کیا کہ اردو زبان مکمل طور سے پنجابی زبان سے نکلی ہے بلکہ اردو کی بنیاد وہ بولی ہے جو فتح دہلی سے قبل مسلمانوں کے قیامِ پنجاب کے عرصے میں یہاں بولی جاتی ہے۔ مسلمان اسے اپنے ساتھ لے کر دہلی جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس میں امیر خسرو سے منسوب کتاب 'خالق باری' کو ان کی تصنیفات سے خارج قرار دینے کے لیے نہایت مدلل، مفصل اور عالمانہ و محققانہ بحث کی ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو محمود شیرانی سے قبل متفقہ طور پر امیر خسرو کی تصنیف سمجھی جاتی رہی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے عربی و فارسی الفاظ کو ہندی مترادفات کو منظوم شکل میں پیش کیا ہے۔ امیر خسرو کے نام کے ساتھ اس کتاب کی نسبت کو محمود شیرانی خسرو کی توہین سمجھتے ہیں کیوں کہ اس میں اوزان و بحور کی غلطیاں بکثرت ملتی ہیں۔ بہت سے الفاظ کے تلفظ اور لہجے غلط ہیں۔ بہت سے الفاظ کے معنی غلط لکھے گئے ہیں اور بہت سے ایسے لفظوں کا استعمال ملتا ہے جو امیر خسرو کے عہد کے نہیں ہیں اس سلسلے میں انھوں نے مولوی محمود امین

چریاکوٹی کے ذریعہ 'جواہر خسروی' میں پیش کی گئی مثبت دلیلوں کی تردید کی ہے کیونکہ وہ 'خالق باری' کو امیر خسرو کی تصنیف مانتے ہیں۔اس کے بعد محمود شیرانی نے اپنے اعتراضات پیش کیے ہیں۔

نصیرالدین ہاشمی:

نصیرالدین ہاشمی کا شمار حیدرآباد کے ان سپوتوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے علمی اور ادبی کارناموں سے حیدرآباد کا نام روشن کیا۔نصیرالدین ہاشمی نے اردو تحقیق ،سوانح ،تاریخ ،فہرست نگاری ، دکنیات اورنسوانیات پر گراں قدر کارنامے انجام دیئے۔انھوں نے اپنی تحقیقی کاوشوں سے اردو ادب کے کئی پوشیدہ خزانوں کا تعارف کرایا۔وہ دکن کی ادبی دنیا ہو کہ نسوانی دنیا،سیاسی موضوعات ہوں یا تمدنی موضوعات سب کا احاطہ انھوں نے اپنی تحریروں میں کیا اور اردو زبان و ادب کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ کیا۔

نصیرالدین ہاشمی کا تعلق اہل نوائط خاندان سے تھا۔ان کی پیدائش ۱۸۹۵ء کو حیدرآباد میں ہوئی۔ان کے والد مولوی عبدالقادر سررشتۂ عدالت میں مجسٹریٹ اور بلدہ میں فائز رہے۔وہ بھی علم و ادب کے ماہر اور کتابوں کے بیحد شوقین تھے۔مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا ذخیرہ ان کے پاس موجود تھا۔گویا نصیرالدین ہاشمی کو علم و ادب کا شعور وراثتاً ودیعت ہوا تھا۔نصیرالدین ہاشمی کی ابتدائی تعلیم مدرسہ دارالعلوم میں ہوئی۔پھر خانگی طور پر مدراس یونی ورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔والد کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے سبب تعلیم کو باقاعدہ طور پر جاری نہ رکھ سکے۔البتہ مطالعہ کے بے انتہا شوق کی بنیاد پر کتابوں سے فیضیاب ہوتے رہے۔ مطالعے کے ساتھ ساتھ ادبی سرگرمیوں سے بھی ابتدائے عمر سے ہی دل چسپی رہی۔

۱۹۲۰ء میں ملازمت کی شروعات بحیثیت اہل کار دفتر دیوانی و مال سے ہوئی۔مختلف عہدوں پر فائز رہے۔منتظم ،نائب ،مددگار ،پھر سررشتہ ،رجسٹریشن واسٹامپ میں مددگار ناظم اس کے بعد رجسٹرار بلدہ اور کچھ عرصہ بعد ناظم رجسٹریشن کی خدمت پر مامور رہے،۱۹۵۰ء میں وظیفہ پر سبک دوش ہوئے اور ۲۶ نومبر ۱۹۶۴ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، ہاشمی صاحب کی علمی وادبی زندگی کا آغاز اوائل عمری میں ہی ہو گیا تھا۔

شوق مطالعہ کی بنا پر ہزار ہا ردیف وار اشعار جمع کیے تھے۔ اشعار کے اس مجموعہ کو ان کے والد عبدالقادر نے 'گلزار نصیری' کا نام دیا تھا۔ بچپن ہی میں ایک اور تذکرہ 'حالات بھونگیر' کے نام سے لکھا تھا۔ انہی دنوں ایک اہم تالیف 'المحبوب' سپرد قلم کی جو بہت عرصہ بعد شائع ہوئی۔ اس کتاب میں نواب میر محبوب علی خان آصف سادس کی سوانح عمری کو موضوع بنایا گیا تھا۔ بچپن کا یہ ذوق وشوق ایک جنون کی صورت اختیار کر گیا اور اردو زبان سے ان کا یہ عشق روز افزوں بڑھتا ہی گیا۔ نتیجتاً ان کے قلم سے بے شمار تحریریں عالم وجود میں آئیں، جو اردو ادب کے خزانے کا بیش بہا سرمایہ ثابت ہوئیں۔ انھوں نے ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ مگر ان کی علمی و ادبی زندگی کا سب سے روشن حصہ ادبی تحقیق سے متعلق ہے۔

۱۹۲۳ء میں ان کی کتاب 'دکن میں اردو' کی اشاعت تحقیق کی دنیا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو میں یہ پہلی علاقائی ادبی تاریخ تھی۔ اس کی شہرت ومقبولیت نے کئی اور ادیبوں کو علاقائی تاریخیں لکھنے کی طرف متوجہ کیا۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد ہی حکومت آصفیہ نے انھیں اعزازی وظیفہ پر ۱۹۲۸ء میں یورپ روانہ کیا، تاکہ وہاں کی لائبریریوں میں موجود اردو کے نایاب مخطوطات کی معلومات اکٹھی کی جا سکے۔ ۱۳/ ماہ کے قیام کے بعد انگلستان، اسکاٹ لینڈ، فرانس اور روم کی لائبریریوں میں مخزونہ قدیم ادب کے مخطوطات کی تفصیلات 'یورپ میں دکنی مخطوطات' کے عنوان سے ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ مخطوطات کی فہرست سازی کی اولین کوششوں میں ہاشمی صاحب کی یہ کوشش اپنا ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے حیدرآباد کے کتب خانوں کے مخزونہ مخطوطات کی فہرست سازی میں بے حد اہم کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ یہاں ان کے کارناموں کا ایک سرسری جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

دکن میں اردو: یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ء میں مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ پہلی اشاعت میں یہ کتاب صرف ۱۸۰/ صفحات پر مشتمل تھی۔ چونکہ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب تھی اس لیے بہت ہی قلیل مدت میں اسے بڑی مقبولیت نصیب ہوئی۔ صرف تین سال بعد ہی مزید اضافہ کے ساتھ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۲۶ء میں شائع کیا گیا۔ یہ ایڈیشن جملہ ۳۲۶ صفحات پر مشتمل تھا۔ تیسرا ایڈیشن بھی اسی مکتبہ سے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا جو ۵۶۵ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس ایڈیشن کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی رہی کہ اس میں 'یورپ

میں دکنی مخطوطات' کے مواد کو بھی شامل کرلیا گیا تھا۔ جس سے اس ایڈیشن کی اہمیت ایک دستاویز کی سی ہوگئی تھی۔ البتہ اس ایڈیشن میں اس سے قبل کی دونوں اشاعتوں میں موجود ابواب 'مدراس میں اردو' اور 'میسور میں اردو' کو خارج کر دیا گیا۔ اس کا سبب غالباً یہ رہا ہوگا کہ یہ دونوں ابواب اس درمیان میں الگ کتابی صورت میں شائع ہو چکے تھے۔ دکن میں اردو کا چوتھا ایڈیشن مکتبہ معین الادب لاہور سے ۱۹۵۲ء میں منظر عام پر آیا جو بہت سارے اضافے اور نئی معلومات کے ساتھ ۸۷۸ صفحات پر مشتمل تھا، ۱۹۶۰ء میں مصنف کو اطلاع دیئے بغیر مکتبہ اردو لاہور نے اس کا پانچواں ایڈیشن شائع کیا تھا جو چوتھے ایڈیشن کا چربہ تھا۔

۱۹۶۲ء میں نسیم بکڈ پو نے ۱۰۸۱ صفحات پر مشتمل اس کا چھٹا ایڈیشن شائع کیا۔ اس ایڈیشن میں بے شمار ترمیمات اور اضافے تھے۔ ترمیمات کا یہ سلسلہ ہاشمی صاحب کی پوری زندگی چلتا رہا۔ خاص کر چھٹے ایڈیشن میں قدیم ادب سے متعلق مواد میں بے شمار اضافے کیے گئے۔ کیوں کہ ہاشمی صاحب کے ہاتھ سالار جنگ کتب خانہ، کتب خانہ آصفیہ اور ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں مخزونہ مواد بھی دستیاب ہو گیا تھا۔ تمام دستیاب مواد کی معلومات کو اس اضافہ شدہ ایڈیشن میں شامل کرلیا گیا۔ اس کے علاوہ ۱۹۵۶ء میں آندھرا پردیش کے قیام کے بعد ریاست حیدرآباد سے الگ کیے گئے اضلاع جو ریاست مہاراشٹر اور کرناٹک کے حدود میں چلے گئے تھے، ان اضلاع کے شعرا اور مصنفین کی معلومات بھی علاحدہ پیش کی گئیں۔

نصیرالدین ہاشمی کے انتقال کے بہت سالوں بعد ۱۹۸۵ء میں ترقی اردو بیورو نئی دہلی نے دکن میں اردو کا ایک اور ایڈیشن شائع کیا۔ اس ایڈیشن میں ہاشمی صاحب کی سوانح کا حصہ بھی شامل کیا گیا۔ اس آٹھویں ایڈیشن تک اردو تحقیق نے ہاشمی صاحب کی بہت سی معلومات کو رد کیا تھا۔ چنانچہ اس ایڈیشن میں ان معلومات پر نظر ثانی تو نہیں کی گئی البتہ ڈائریکٹر ترقی اردو بیورو ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے نئی معلومات کی طرف 'اپنی بات' میں نشان دہی کی ہے۔

'دکن میں اردو' دکنی ادب کی تحقیق کے لیے ایک اہم ماخذ ثابت ہوئی۔ اس علاقائی تاریخ میں دکن کی مکمل ادبی تاریخ جس میں اردو زبان و ادب کا عہد بہ عہد ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس دور کی پوری ادبی فضا کو اس کتاب کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ قدیم دور سے لے کر آصفیہ دور تک مختلف علمی و

ادبی انجمنوں اور اخبارات و رسائل کی معلومات بھی اس کتاب میں اکٹھا کردی گئی ہے۔ یہ کتاب دکن میں اردو ادب کی نشو ونما کی معلومات کا اہم ذریعہ ثابت ہوئی ہے۔علاقائی تاریخ کے اس نقش اول کے تتبع میں ہی 'پنجاب میں اردو' 'گجرات میں اردو' 'بہار میں اردو' 'میسور میں اردو' 'بنگال میں اردو' جیسی علاقائی تاریخیں لکھی گئیں۔

مدراس میں اردو: نصیرالدین ہاشمی کی کتاب 'دکن میں اردو' کی پہلی دو اشاعتوں تک ایک باب 'مدراس میں اردو' کے عنوان سے شامل تھا۔ بعد کی اشاعتوں میں اس حصہ کو حذف کردیا گیا۔ تاہم یہ باب اپنے اندر ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا تھا۔اس اہمیت کے پیش نظر مزید معلومات کے ساتھ اس کو کتابی شکل میں ۱۹۳۸ء میں ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد سے شائع کیا گیا۔اس کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر زور نے تحریر کیا۔علاقائی ادب کے مطالعہ کے ضمن میں یہ ایک اہم کتاب ہے۔جس میں مدراس میں اردو ادب کی نشو ونما کی معلومات پیش کی گئی ہے۔مدراس سے شائع ہونے والے رسائل اور وہاں کی انجمنوں کی تفصیلات بھی تحریر کی گئی ہے۔

خواتین عہد عثمانی میں: تعلیم نسواں اور خواتین کی اصلاح نصیرالدین ہاشمی کی تحریروں کا اہم موضوع رہا ہے۔انھوں نے اس موضوع پر کئی مضامین اور کتابیں لکھی ہیں۔جس میں انھوں نے خواتین کی علمی و ادبی اور سماجی کوششوں کو منظر عام پر لانے کا کام کیا ہے۔'خواتین عہد عثمانی میں' اعظم اسٹیم پریس سے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں میر عثمان علی خان آصف سابع کے عہد کی خواتین دکن کی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔

حیدرآباد کی نسوانی دنیا: ۱۹۴۴ء میں شائع ہونے والی یہ کتاب نصیرالدین ہاشمی کے پانچ مطبوعہ اور ایک غیر مطبوعہ مضمون کا مجموعہ ہے۔اس کتاب کو شہزادی درشہوار کے نام معنون کیا گیا ہے۔پیش لفظ بیگم ہمایوں مرزا کا لکھا ہوا ہے۔مندرجات میں حیدرآباد کی عورتیں، خواتین دکن کی ادبی خدمات، جدید ادب نسواں، طبقۂ نسواں کے ذرائع معیشت، ہمارے خاندان کی عورتیں اور حیدرآباد کے تینتیس ستارے شامل ہیں۔

دکنی ہندو اور اردو: نصیرالدین ہاشمی کی یہ ایک اہم تحقیقی تصنیف ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۶ء میں ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد سے شائع ہوئی۔اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ ایک اہم تحقیقی تصنیف ہے جس میں

دکن کے ہندو شعرا و ادبا کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اردو ادب کو پروان چڑھانے میں دکن کے نہ صرف مسلمان شعرا و ادبا نے حصہ لیا تھا بلکہ اس زبان کی شیرینی نے دوسرے مذاہب کے افراد کو بھی اپنی طرف راغب کیا تھا۔ نصیر الدین ہاشمی نے بڑی محنت اور لگن سے ان ہندو شعرا و ادبا کے نام اور کلام کو جمع کیا جنھوں نے اس زبان کی تعمیر و ترقی میں حصہ لیا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت سے دکن کی ادبی تاریخ کا ایک اہم پہلو دنیائے اردو کے سامنے آتا ہے۔ یہ کتاب بہمنی عہد سے ۱۹۵۵ء کے ہندو شعرا و ادبا کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں شعرا و مصنفین کا مختصر تعارف پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے کلام پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ شاعرات کا تعارف، اخبارات و رسائل اور ان کے مدیران کے بارے میں بھی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ اس کتاب میں ۲۳۲ ہندو شعرا اور مصنفین کی تفصیلات درج ہیں۔

یورپ میں دکنی مخطوطات: نصیر الدین ہاشمی نے ۱۹۲۸ء میں یورپ کے مختلف کتب خانوں سے استفادے کے لیے حکومت کے وظیفے پر یورپ کا سفر کیا اور انگلستان، اسکاٹ لینڈ، فرانس اور اٹلی وغیرہ میں ۱۳/ ماہ قیام کیا اور وہاں کے انڈیا آفس، برٹش میوزیم، رایل ایشیاٹک سوسائٹی، اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز اڈنبرا یونی ورسٹی کے کتب خانوں سے بھرپور استفادہ کیا اور وہاں کے مخزونہ اردوئے قدیم کے نادر و نایاب مخطوطات کی تفصیلات جمع کیں انھوں نے ۱۵۱ مخطوطات کی تفصیلات 'یورپ میں دکنی مخطوطات' کے عنوان سے ۱۹۳۲ء میں حیدر آباد سے شائع کیا۔

اس کتاب کو مہاراجہ سرکشن پرشاد کے نام معنون کیا گیا ہے اور مقدمہ ڈاکٹر زور کا لکھا ہوا ہے۔ وضاحتی فہرستوں کی اولین کتابوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس سے قبل ۱۹۲۹ء میں شمس اللہ قادری نے بھی برٹش میوزیم کے مخطوطات کی فہرست شائع کی تھی جو دراصل ترجمہ اور تلخیص تھی۔ اسی سنہ میں عبدالقادر سروری نے جامعہ عثمانیہ کے مخطوطات کی فہرست مرتب کی تھی۔ اس کے فوراً بعد 'یورپ میں دکنی مخطوطات' کا نمبر آتا ہے۔

نصیر الدین ہاشمی نے یورپ کے کتب خانوں میں مخطوطاتِ مخزونہ کا عرق ریزی سے مطالعہ کیا اور قدیم مصنفین اور ان کے کارناموں کی تفصیلات بڑی ہی تحقیق اور تدقیق کے بعد پیش کیں۔ اس کتاب میں ہر مخطوطہ کی تفصیل، مصنف کے حالات، نمونۂ کلام، وجہ تصنیف، سنہ تصنیف جیسی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔

دفتر دیوان و مال کے اردو مخطوطات: دفتر دیوان و مال سرکار آصفیہ کا ہسٹوریکل ریکارڈ آفس تھا جس میں سرکار آصفیہ کے قدیم دفتری کاغذات کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ اس دفتر کا ایک کتب خانہ بھی تھا، جس میں مختلف زبانوں کی کتابیں رکھی گئی تھیں۔ ان میں مخطوطات کی بھی خاصی تعداد تھی۔ ان مخطوطات کو ترتیب دے کر نصیر الدین ہاشمی نے ان کی فہرست 'دفتر دیوانی و مال کے اردو مخطوطات' کے نام سے ۱۹۳۵ء میں شائع کی، جس میں ان تمام اردو مخطوطات کی تفصیلات کو پیش کیا جو دفتر دیوانی و مال کے مخزونہ تھے۔

سنٹرل ریکارڈ آفس کے مخطوطات: یہ ایک مختصر سی فہرست ہے جس میں سنٹرل ریکارڈ آفس کے مخطوطات کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ یہ توضیحی فہرست بھی ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ اس سے قبل یہ فہرست رسالہ 'نوائے ادب' بمبئی میں شائع ہو چکی تھی۔ بعد میں اسے کتابی شکل دی گئی۔ اس فہرست میں مذکورہ مخطوطات کی تفصیلات جیسے سائز، سطور، سنہ طباعت اور مصنف کے حالات زندگی مختصراً تحریر کیے گئے ہیں۔

کتب خانہ سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست: یہ فہرست ۱۹۵۷ء میں مرتب ہوئی اور مکتبہ ابراہمیہ حیدرآباد سے شائع کی گئی۔ یہ ایک طویل وضاحتی فہرست ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ میں سیکڑوں نادر و نایاب مخطوطات و مطبوعات جمع ہیں۔ جو سالار جنگ بہادر ثالث اور ان کے خاندان کی ذاتی دلچسپی کی بنا پر جمع ہوئی تھیں۔ اس وضاحتی فہرست کو نصیر الدین ہاشمی نے دو سال کی مدت میں بڑی محنت اور جانفشانی سے ترتیب دیا تھا۔

نصیر الدین ہاشمی نے اس توضیحی فہرست میں کل ۷۲۵ مخطوطات کی تفصیلات تحریر کی ہیں۔ ان میں صرف دکن ہی کے مخطوطات کا ذکر نہیں بلکہ دلی، لاہور اور لکھنؤ کے مخطوطات کی بھی تفصیلات موجود ہیں۔ ان کو مختلف علوم و فنون کے نو زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات جلد اول و دوم: یہ توضیحی فہرستیں ۱۹۶۱ء میں مرکزی حکومت کی امداد سے 'کتب خانہ خواتین دکن' سے شائع ہوئیں۔ پہلی جلد میں ۵۶۵ مخطوطات اور دوسری جلد میں ۶۱۲ مخطوطات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ جو کتب خانہ آصفیہ کے مخزونہ ہیں۔ ان مخطوطات کو مختلف علوم و فنون کے سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

کتب خانہ جامعہ نظامیہ کے اردو مخطوطات: یہ نصیرالدین ہاشمی کا ایک اہم اور طویل مضمون ہے۔ جامعہ نظامیہ حیدرآباد کی ایک قدیم اسلامی درس گاہ ہے۔جس کا قیام ۱۲۹۲ہجری میں عمل میں آیا تھا۔اس درس گاہ میں ایک کتب خانہ بھی قائم کیا گیا تھا، جہاں عربی کے ساتھ ساتھ اردو اور فارسی کی بے شمار کتابیں جمع کی گئی تھیں۔ان میں مطبوعات کے ساتھ ساتھ مخطوطات کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے۔نصیرالدین ہاشمی نے اس اسلامی درس گاہ جامعہ نظامیہ کے مخزونہ اردو مخطوطات کی فہرست کے زیرِعنوان ایک طویل مضمون رسالہ 'نوائے ادب' بمبئی میں جنوری ۱۹۶۴ء اور اپریل ۱۹۶۴ء کے شماروں میں شائع کیا تھا۔ یہ فہرست الگ سے کتابی صورت میں شائع نہ ہوسکی۔

مقالاتِ ہاشمی: نصیرالدین ہاشمی نے بے شمار تحقیقی مضامین لکھے جو ان کی تحقیقی بصیرت اور ژرف نگاہی کا بین ثبوت ہیں۔ بالخصوص انھوں نے قدیم ادب کی تحقیق میں لازوال نقش چھوڑے ہیں۔ان کی تلاش و جستجو سے متعدد ادبی شہ پاروں کی بازیافت ممکن ہوسکی۔ان کے یہ تحقیقی مقالے اور مضامین ہندوستان بھر کے موقر رسائل و جرائد کی زینت بنتے رہے ہیں۔ان ہی مطبوعہ مضامین میں سے چند منتخب مضامین کو یکجا کرکے مجموعہ کی شکل عطا کی گئی ہے۔اس مجموعہ میں قدیم اردو سے متعلق اہم مضامین بھی شامل ہیں۔

دکنی کے چند تحقیقی مضامین: نصیرالدین ہاشمی کے دکنی مضامین کے اس مجموعہ کو ۱۹۶۳ء میں زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔۲۰۰صفحات پر مشتمل اس کتاب میں دکنیات کا بے حد اہم ذخیرہ موجود ہے۔اس مجموعہ میں جملہ ۹ر مضامین شامل ہیں۔اس کا ہر مضمون اپنے اندر تحقیق کی ایک وسیع دنیا رکھتا ہے۔درج ذیل عنوانات سے ان کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۱۔قدیم اردو یا دکھنی ادب ۲۔قدیم اردو میں سیرت النبی کا ذخیرہ ۳۔قدیم اردو کے قصص الانبیاء ۴۔قدیم اردو میں نیچرل شاعری ۵۔سلطان علی عادل شاہ ثانی اور اس کی اردو شاعری ۶۔سلطان عبداللہ قطب شاہ کی اردو شاعری ۷۔اردو میں لیلیٰ مجنوں کی داستانیں ۸۔محمد حنیف کے متعلق منظوم داستانیں ۹۔اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ لطف النساء امتیاز کا دیوان اور مثنوی گلشن شعرا۔

سرزمین دکن سے نصیرالدین ہاشمی کو والہانہ محبت تھی اور اسی محبت نے انھیں دکنی ادب کی تحقیق کی طرف

متوجہ کیا۔انھوں نے بڑی جانفشانی اور تلاش و تحقیق سے بہمنی عہد، عادل شاہی اور قطب شاہی عہد کی ادبی شخصیتوں اور ان کے کارناموں کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر اردو دنیا کے سامنے پیش کیا۔انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ سرزمین دکن میں اردو زبان کے بڑے خزانے پوشیدہ ہیں۔نصیر الدین ہاشمی کی تحقیقات سے اردو ادب کی تاریخ کے کئی گوشے روشن ہوئے۔اردو دنیا ان کے ان تحقیقی کارناموں کی وجہ سے ہمیشہ ان کی ممنون احسان رہے گی۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور:

ڈاکٹر زور ایک کثیر الجہات شخصیت کے حامل تھے۔ان کی قلمی فتوحات ادب کی تمام اصناف پر چھائی رہیں۔تحقیق، تنقید، سوانح، تدوین، لسانیات، دکنیات، غالبیات، اقبالیات، صحافت، شاعری اور افسانہ نگاری غرض کہ ان کی ذہنی اور فکری کاوشیں ہمہ رنگ ہیں۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر زور کی اصل شناخت دکنی زبان وادب کے محقق کی ہے۔دکنیات کی تحقیق میں ان کے کارنامے قطب نما کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس لیے انھیں دکنی تحقیق کا سالارِ کاروں بھی کہا گیا۔ان کی تحقیقات کی بدولت اردو زبان کے دامن میں گراں مایہ سرمایہ کا اضافہ ہوا۔

سید محی الدین قادری زور ۷/دسمبر ۱۹۰۴ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں مدرسہ مفید الانام سے میٹرک کامیاب کرنے کے بعد ۱۹۲۵ء میں بی۔اے۔پاس کیا۔۱۹۲۷ء میں ایم۔اے۔کی کامیابی کے فوراً بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے وظیفہ پر یورپ روانہ ہوئے۔لندن یونی ورسٹی سے ''اردو زبان کا آغاز وارتقا'' کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی۔کی ڈگری حاصل کی۔وہاں سے صوتیات کی تعلیم کے لیے پیرس روانہ ہوئے اور صوتیات پر سند کے لیے ''ہندوستانی فونیٹک'' کے موضوع پر مقالہ تحریر کیا۔۱۹۳۱ء کو ہندوستان واپس ہوئے اور شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں بحیثیت ریڈر ان کا تقرر ہو گیا۔

ڈاکٹر زور کی ہمہ جہت شخصیت نے ادب کے مختلف شعبوں میں اپنے لازوال نقش چھوڑے ہیں۔ان کی علمی وادبی سرگرمیاں دوران تعلیم ہی شروع ہو گئی تھیں۔'روح تنقید' جو اردو تنقید میں ایک اہم مقام رکھتی ہے، انھوں نے بی۔اے۔کے دوران ہی لکھی تھی۔یورپ اور پیرس میں قیام کے دوران وہاں کے کتب

خانوں اور میوزیم میں مخزونہ اردو مخطوطات کے مطالعے نے انھیں قدیم ادب کے بے شمار شہ پاروں سے متعارف کروایا تھا۔لسانیات اور صوتیات سے دلچسپی، گہرے مطالعے اور تلاش وجستجو نے ان سے 'ہندوستانی لسانیات' اور 'ہندوستانی صوتیات' جیسی شاہکار کتابیں تصنیف کروائیں۔ ذیل میں ان کی تحقیقی خدمات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

مرقع سخن (جلد اول): یہ دور آصفیہ کے شعرا کا باتصویر تذکرہ ہے۔ اس تذکرہ کو ڈاکٹر زور نے ۱۹۳۵ء میں مرتب کیا اور مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد سے شائع کروایا۔اس کتاب کو آصف سابع کی حکومت کے پچیس سالہ جشن سیمیں کے موقع پر مرتب کیا گیا تھا۔اس تذکرہ میں حیدرآباد کے ان پچیس شعرا کا ذکر کیا گیا ہے جو آصف جاہی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ان پچیس مختلف شعرا کے کلام کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان شعرا پر مختلف اہل ادب سے مضامین لکھوائے گئے اور ڈاکٹر زور نے اسے ترتیب دیا۔اس تذکرے کے متعلق ڈاکٹر زور تفصیلات پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شاعروں کے حالات اور کلام کی فراہمی میں ہر ممکنہ ذرائع سے استفادہ کیا گیا ہے اور مضامین کو تحقیقی طرز سے زیادہ ادبی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ انھیں شاعروں سے متعلق مزید تحقیق وتفتیش کے ذریعہ سے اور زیادہ معلومات حاصل ہو سکیں۔'' (۵)

مرقع سخن (جلد دوم): اسے ڈاکٹر زور نے ۱۹۳۷ء میں مرتب کیا۔اس تذکرے میں پچاس شعرا کا کلام ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ بھی باتصویر ہے۔اس میں شعرا کے حالات زندگی بھی درج ہیں۔اس تذکرے میں ایک خصوصیت یہ بھی رکھی گئی ہے کہ اس میں آصف جاہی خاندان کے اراکین کا کلام بھی شامل کیا گیا ہے اور ان کی شاعری پر مضامین بھی لکھوائے گئے ہیں۔

اردو کے اسالیب بیان: ڈاکٹر زور نے 'اردو کے اسالیب بیان' کے عنوان سے ایک طویل مضمون قلم بند کیا تھا جو ۱۹۲۶ء میں رسالہ 'سہیل' علی گڑھ کے دو شماروں اپریل اور جولائی میں شائع ہوا تھا۔اس مضمون پر نظر ثانی کے بعد اسے ۱۹۲۷ء میں کتابی شکل دے دی گئی۔

اس کتاب میں اردو نثر کے ابتدائی نمونوں سے لے کر ۱۹۲۵ء تک کے نثری کارناموں کا عہد بہ عہد جائزہ لیا گیا ہے اور تمام عہد کے رجحانات اور تغیرات کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔اس طرح سے یہ کتاب ایک تحقیقی وتنقیدی تصنیف کا درجہ رکھتی ہے۔اس کتاب کے موضوعات کو نو ابواب میں تقسیم کر کے اردو نثر کی ابتدا اوراس کی نشو ونما کا بخوبی جائزہ لیا گیا ہے۔اپنے موضوع کے لحاظ سے ڈاکٹر زور کی یہ ایک اہم تصنیف ہے جو ادبی تاریخوں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔

اردو شہ پارے: ڈاکٹر زور 'اردو زبان کا آغاز وارتقا' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی سند کے حصول کے لیے لندن و پیرس میں قیام پذیر تھے۔اپنے موضوع سے متعلق مواد کی تحقیق کے لیے انھیں لندن، آکسفورڈ، کیمبرج، پیرس اور اڈنبرا کی لائبریریوں میں مخزونہ دکنی مخطوطات سے استفادے کا موقع ملا تب انھیں اس بات کا شدید احساس ہوا کہ قدیم اردو کے بے شمار شہ پارے دنیا کی دوسری لائبریریوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔اس نایاب ادبی ذخیرے کو علمی دنیا سے متعارف کرانا ضروری تھا۔اس لیے وہ لندن میں دوران تعلیم ان شہ پاروں کے تمام ضروری مواد کو اکٹھا کرتے رہے۔ ۱۹۲۹ء کی چھٹیوں میں ہندوستان واپس آئے تو حیدرآباد کے کتب خانوں کے مخطوطات سے بھی استفادہ کیا۔اسی سال یعنی ۱۹۲۹ء میں انھوں نے اردو شہ پاروں کو اپنے بسیط مقدمے کے ساتھ حیدرآباد سے شائع کیا۔

'اردو شہ پارے' اردو کی ابتدائی تحقیق کے دوران لکھی گئی ایک اہم ادبی تاریخ ہے۔اگرچہ اس کتاب میں ڈاکٹر زور سے بہت سا تسامح ہوا ہے تاہم ان کی اس کوشش سے دوسرے محققین دکنی ادب کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوئے اور دکنی ادب کی بہت سی پوشیدہ گوشے منصۂ شہود پر آئے۔ڈاکٹر زور کو خود ان تسامحات کا احساس تھا اور انھوں نے خود اس بات کا اظہا کیا ہے۔لکھتے ہیں:

> ''اس امر کا کوئی بھی شخص دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں جو کام پیش کرر ہا ہوں وہ ہر حیثیت سے مکمل ہے۔اس کتاب میں ان تمام قلمی تصنیفات کے انتخابات دیے گئے ہیں جو اس وقت دستیاب ہوسکی ہیں۔یہ بھی اس دور کے اردو ادب کی ایک مکمل تاریخ نہیں ہوسکتی۔جتنی معلومات فراہم کی جاسکتی تھیں ان کے پیش نظر نظم کرنے کی حتی الامکان کوشش کی

گئی۔‘‘(۶)

ڈاکٹر زور کا خیال تھا کہ اس طرح کی ادبی تاریخ کی دو جلدیں مزید شائع کی جائیں گی تاکہ موجودہ عہد تک اردو کی ادبی تاریخ مرتب کی جا سکے لیکن یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور اردو شہ پارے کی ایک ہی جلد مرتب ہو سکی۔ تاہم اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے باوجود یہ کتاب ڈاکٹر زور کے ایک تحقیقی شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

عہد عثمانی میں اردو کی ترقی: یہ کتاب ۱۹۳۴ء میں اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ڈاکٹر زور نے آصف سابع نواب میر عثمان علی خان کے پچیس سالہ عہد حکومت میں اردو ادب کی نشو ونما کا جائزہ لیا ہے۔ میر عثمان علی خان کا دور حکومت اردو زبان و ادب کی ترقی کا ایک درخشاں دور تھا۔ ڈاکٹر زور نے اس دور کے تمام قلمی و ادبی کارناموں پر روشنی سے ڈالی ہے۔ گویا یہ کتاب عہد عثمانی کی ادبی تاریخ کی ایک اہم دستاویز بن گئی ہے۔

تاریخ ادب اردو: ادارہ ادبیات اردو کے قیام کے منصوبے میں یہ طے کیا گیا تھا کہ اس ادارے سے مختلف زبانوں کی ادبی تاریخیں شائع کی جائیں گی۔ اس سلسلے میں اردو زبان کی ادبی تاریخ لکھنے کا کام ڈاکٹر زور کو سونپا گیا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر زور نے ایک ضخیم تاریخ مرتب کی لیکن ادارہ ادبیات اردو کے امتحانات کے سلسلے میں ایک مختصر اور جامع ادبی تاریخ کی ضرورت کے پیش نظر ڈاکٹر زور نے اسے مختصر کر کے ۱۹۴۰ء میں ادارہ سے شائع کیا۔

’تاریخ ادب اردو‘ کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں اردو کی ابتدائی نثر سے عہد ولی تک کی ادبی تاریخ پر نظر ڈالی گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں ’دہلی میں اردو کے آغاز وارتقا‘ کا جائزہ عہد مصحفی وانشا تک پیش کیا گیا ہے۔ اس حصہ میں ’اردو نثر کی ترقی‘ کے عنوان سے فورٹ ولیم کالج کے مصنفین اور ان کی تخلیقات کا جائزہ لیا ہے۔ تیسرے حصے میں دبستان لکھنؤ اور دبستان دہلی کی ادبی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ چوتھے حصے میں ’اردو ادب کا جدید دور‘ کے زیر عنوان جدید شعرا اور ادبا کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن میں حالؔی، آزادؔ، شبلی، سرسیدؔ، نذیر احمد، امیرؔ، داغؔ، اکبرؔ الہ آبادی، چکبستؔ اور اقبال شامل ہیں۔ ان جدید اہلِ قلم کے ساتھ

ساتھ دکن کے جدید قلم کاروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن میں گردھاری لال پرشاد باقی، ڈاکٹر احمد حسین مائل، جلال الدین توفیقی، رضی الدین حسن کیفی اور طیبہ بیگم کا ذکر شامل ہے۔ ادیبوں اور شعرا کے تذکرے کے ساتھ ساتھ اردو کے علمی و ادبی اداروں اور رسائل و اخبارات کا تعارف بھی پیش کیا ہے۔ یہ کتاب مختصر تاریخ ادب کی حیثیت سے ایک اہم کتاب ہے۔

داستان ادب حیدر آباد: ڈاکٹر زور کی لکھی ہوئی ادبی تاریخوں میں یہ ایک اہم کتاب ہے۔ یہ ۱۹۵۱ء میں طارق پریس حیدر آباد سے شائع ہوئی۔ اس علاقائی ادبی تاریخ میں ۱۰۰۰ ہجری سے ۱۳۷۰ ہجری تک کے اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کے شعرا اور نثر نگاروں کے علمی و ادبی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب کے عنوانات کی فہرست دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تقریباً پونے چار سو سالہ ادبی تاریخ کو کس خوش اسلوبی کے ساتھ ایک مستند دستاویزی شکل میں پیش کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں پیش کیے گئے عنوانات آگے چل کر الگ الگ اہم تحقیقی موضوع قرار پائے اور کئی محققین نے ان موضوعات پر تحقیق کی۔ اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر زور کی یہ کتاب کتنی اہمیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر زور کو بھی اس موضوع کی اہمیت و افادیت کا اندازہ تھا لہٰذا لکھتے ہیں:

> ''کیا تعجب ہے کہ حیدر آبادی ادب کا یہ سرسری اور حقیر سا جائزہ ہی مستقبل کے حیدر آبادی ادیبوں اور شاعروں کیلیے ایسے نقوش قدم کا کام کر جائے جن سے علم و فضل اور شعر و سخن کے گزرے ہوئے کارواں کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اور اہل حیدر آباد کے علاوہ دوسرے مقامات کے اہل نظر بھی معلوم کر سکیں کہ اس شہر کی تاریخ کیسے کیسے علمی و ادبی کارناموں سے منور ہو رہی ہے۔'' (۷)

دکنی ادب کی تاریخ: یہ ایک مختصر ادبی تاریخ ہے جو ۱۹۶۰ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں دکن کی چار سو سالہ ادبی تاریخ کو پیش کیا گیا ہے۔ دکن کے اہم ادبی مراکز گلبرگہ، بیدر، گولکنڈہ بیجاپور اور اورنگ آباد کے شعرا اور نثر نگاروں کے تخلیقی کارناموں کو بہت اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو ڈاکٹر زور نے پانچ ابواب پر منقسم کیا ہے۔ پہلا باب بہمنی دور پر محیط ہے۔ اس میں اس دور کے تاریخی،

سماجی، اور تہذیبی پس منظر کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ نیز اس عہد کے اردو شعرا کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

دوسرے اور تیسرے باب میں ترتیب وار عادل شاہی اور قطب شاہی عہد کے ادبا وشعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔ چوتھے باب کو مغل عہد کا عنوان دیا گیا ہے جو زوال گولکنڈہ اور بیجاپور کے بعد اورنگ آباد میں نشو ونما پانے والے ادب کا احاطہ کرتا ہے۔ پانچواں باب نہایت اہم ہے جو 'دکنی ادب کا اثر شمالی ہند کی اردو پر' کے عنوان سے ہے۔ اس عنوان کے تحت شمالی ہند کے ان اولین شعرا کے کلام کا جائزہ لیا گیا ہے جو ولی سے متاثر ہو کر اردو شاعری کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

تذکرہ گلزار ابراہیم وگلشن ہند: ڈاکٹر زور کا مرتبہ یہ تذکرہ ۱۹۳۴ء میں مطبع مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے شائع ہوا۔ یہ تذکرہ علی ابراہیم خان نے ۱۱۹۸ ہجری میں ترتیب دیا تھا جسے ۱۸۰۱ء میں مرزا علی لطف نے گلکرسٹ کی فرمائش پر گلشن ہند کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔ انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) کی فرمائش پر ڈاکٹر زور نے اس تذکرہ کو ۱۹۳۴ء میں مرتب کیا۔ اس تذکرہ کے ابتدا میں ڈاکٹر زور نے کافی وقیع اور پرمغز مقدمہ لکھا جس میں تذکرہ نگاری کی روایت اور گلزار ابراہیم کی خصوصیات سے بحث کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر زور نے اس تذکرہ کو اس طرح مرتب کیا ہے کہ مرزا علی لطف کے مرتبہ گلشن ہند میں جو شعرا جگہ نہ پا سکے تھے ان کو ڈاکٹر زور نے شامل کر لیا ہے اور ان کی نشان دہی کر دی ہے۔ اسی طرح جہاں جہاں گلزار ابراہیم اور گلشن ہند میں اختلافات تھے ان کی نشان دہی کر دی ہے۔ ساتھ میں گلشنِ ہند کی ۱۹۰۶ء میں تدوین کے وقت مولوی عبدالحق کے ذریعے لکھے گئے مقدمہ کو بھی شامل کتاب کیا ہے۔ اس طرح ڈاکٹر زور نے ایک نئی طرز کی تدوین کو اپنایا تاہم اس طرز تدوین کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ رقم طراز ہیں:

> ''ڈاکٹر زور کی مرتب کردہ گلزار ابراہیم ایک انوکھے طرز کی ایڈیٹنگ کو پیش کرتی ہے جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ جب اس کتاب کو تذکرہ گلزار ابراہیم مع تذکرہ گلشن ہند کا نام دیا گیا ہے تو چاہیے تھا کہ گلزار ابراہیم کو مکمل صورت میں پیش کیا جاتا۔ ڈاکٹر زور نے جو کتاب ترتیب دی اس پر 'گلزار ابراہیم' کا اطلاق ہرگز نہیں ہوتا۔ یہ دراصل تذکرہ گلشن

ہند ہے جسے علامہ شبلی نعمانی نے مرتب کیا ہے۔ اس میں صرف شعرا
کے حالات اور نمونۂ کلام کا اضافہ کیا گیا ہے جنھیں مرزا علی لطف نے
جلد اول میں نظرانداز کر دیا تھا۔''(۸)

کلیات محمد قلی قطب شاہ: کلیات قلی قطب شاہ کی تدوین ڈاکٹر زور کا ایک اہم اور لازوال کارنامہ ہے۔ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کے کلیات کو ڈاکٹر زور نے سلسلۂ یوسفیہ کے تحت مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کے زیرِ اہتمام ۱۹۴۰ء میں مدون کیا اور مکتبہ ابراہیمیہ سے شائع کیا۔ اس کلیات کو ڈاکٹر زور نے کتب خانہ سالار جنگ میں مخزونہ تین نسخوں اور پروفیسر آغا صفدر حسین کے مملوکہ ایک قلمی نسخے کی مدد سے بڑی محنت اور جاں فشانی سے مرتب کیا۔ یہ کتاب جملہ ۱۰۶۸ صفحات پر محیط ہے۔ جن میں ۳۳۵ صفحات پر مشتمل مقدمہ شامل کتاب ہے۔ یہ مقدمہ نہ صرف تحقیقی اعتبار سے کافی اہم ہے بلکہ تاریخی اعتبار سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اس مقدمے میں ڈاکٹر زور نے ایک بہترین مورخ ہونے کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔ اس طویل مقدمہ سے قلی قطب شاہ کے حالات سے مکمل آگاہی ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے عہد کی تاریخ پر بھی بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ خصوصاً قطب شاہی عہد کی تہذیب، رسم و رواج، عقائد، شہر کے تمام مذہبی و ثقافتی آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ مقدمہ گویا قطب شاہی عہد اور تہذیب کا ایک بہترین مرقع ہے جس میں اس عہد کی پوری تہذیب منعکس ہوتی ہے۔

ڈاکٹر زور نے مرتبہ کلیات کے پہلے حصے میں ۲۲۰ نظمیں ترتیب دی ہیں اور ان نظموں کے موضوعات کے پیش نظر عنوانات قائم کیے ہیں۔ اسی طریقۂ کار کو پروفیسر سیدہ جعفر نے بھی کلیات محمد قلی قطب شاہ کی ترتیب میں اپنایا۔ سچ تو یہ ہے کہ تدوین متن کے طریقۂ کار میں یہ بات درست نہیں قرار دی جاتی کہ مرتب متن کسی بھی طرح سے متن میں اضافہ کرے کیوں کہ تدوین متن کا مقصد یہی ہے کہ متن کی صحیح بازیافت کی جائے نہ کہ متن میں اضافہ و اصلاح۔

مرتبہ کتاب کے دسرے حصے میں محمد قلی قطب شاہ کی ۳۱۲ غزلیں شامل ہیں اور تیسرے حصے میں قصیدے، رباعیاں، مرثیے، ریختیاں اور ایک مثنوی شامل ہے۔ کتاب کے آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی دی گئی ہے۔

کلیات محمد قلی قطب شاہ کی تدوین ڈاکٹر زور کا ایک اہم کارنامہ ہے۔اس مرتبہ متن میں انھوں نے ایک فرماں روا، ایک شاعر اور اس کے عہد کی زندگی کی بازیافت نہایت خوبی کے ساتھ کی ہے۔اسے ڈاکٹر زور کا ایک وقیع کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

مثنوی طالب وموہنی: ڈاکٹر زور نے سید محمود والہ موسوی کی مثنوی ُطالب وموہنی' کو ۱۹۵۷ء میں مرتب کیا۔اس کتاب کے مقدمے میں انھوں نے مصنف کے حالات زندگی اور اس کی تصنیفات پر اظہار خیال کرنے کے ساتھ ساتھ اس مثنوی پر لسانی نقطۂ نظر سے بحث بھی کی ہے۔ یہ مثنوی ٹھیٹ دکنی بولی میں نہیں لکھی گئی بلکہ اس مثنوی میں زبان کی بدلتی ہوئی ہیئت ملتی ہے۔جس پر دکنی بولی، فارسی زبان اور شمالی ہند کی زبان کے اثرات مرتب ہورہے تھے۔ڈاکٹر زور نے اس مثنوی کو صرف ایک نسخہ کی مدد سے مرتب کیا جو انھیں ادارہ ادبیات اردو میں دستیاب ہوا تھا۔مثنوی کے اور نسخے ان کے پیش نظر ہوتے تو اختلاف نسخ وغیرہ کی گنجائش ہوتی اور تقابل کی صورت پیدا ہوتی لیکن اور نسخوں کی عدم موجودگی کے سبب صرف اسی ایک نسخے پر انحصار کرنا پڑا۔

توضیحی فہرستیں: ڈاکٹر زور نے بڑی کوشش اور لگن کے ساتھ ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانے میں ڈھیروں مخطوطات جمع کیے تھے۔ان مخطوطات کی وضاحتی فہرست کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی تھی۔اس طرح کی فہرستوں کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر ڈاکٹر زور نے ہی اس فریضۂ تحقیق کو انجام دیا اور بڑی جاں فشانی سے فہرست مخطوطات کی پانچ جلدیں مرتب کیں جس میں کل ۱۵۰۰ مخطوطات کی مکمل تفصیلات پیش کیں۔

ان فہرستوں کی ترتیب کے دوران ڈاکٹر زور کی محققانہ صلاحیتیں پوری طرح ابھر کر سامنے آئیں۔ انھوں نے فن مخطوطہ شناسی کے تمام تقاضوں کو بحسن وخوبی پورا کیا اور ہر مخطوطہ کی توضیحات پر پوری طرح توجہ صرف کی۔ساتھ ہی ساتھ ہر مخطوطہ کے مصنف اور اس کے عہد کا تعین بھی دلائل وبراہین کے ساتھ پیش کیا۔

ڈاکٹر زور سے قبل یوں تو بہت سی وضاحتی فہرستیں ترتیب دی گئیں، لیکن ڈاکٹر زور کی فہرستیں تحقیقی نقطۂ نظر سے ان سب سے زیادہ مبسوط اور اہمیت کی حامل ہیں۔انھیں فن مخطوطہ شناسی کے تقاضوں کو پوری طرح

برتنے میں اولیت حاصل ہے۔انھوں نے اس فن کو ایک مقام و مرتبہ عطا کیا، اور اس فن کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسی فہرستیں تیار کیں جو بعد کے آنے والے محققین کے لیے اہم ماخذ ثابت ہوئیں۔حالانکہ اس ترتیب میں انھیں جتنی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں اس طرح کے کام سے سابقہ پڑا ہو۔لیکن یہ مشکلات ان کے ذوق تحقیق کو کم نہ کر سکیں۔تحقیق کی دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اس تذکرے مخطوطات کی ترتیب کے سلسلہ میں مولف کو جو زحمتیں اٹھانی پڑی ہیں اور جو وقت صرف ہوا ہے اس کا اندازہ وہی اصحاب کر سکتے ہیں جنھیں قلمی نسخوں سے کام لینے کا تجربہ ہوا ہو۔اکثر مخطوطوں کے مصنفوں کے نام یا زمانۂ تصنیف اور زمانۂ کتابت وغیرہ کی تحقیق میں بیسوں قلمی و مطبوعہ کتب کی ورق گردانی کرنی پڑی اور بڑا وقت صرف ہوا۔''(۹)

غرض کہ ڈاکٹر زور نے مخطوطہ شناسی کے فن میں اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔انھوں نے بڑی ہی عرق ریزی سے ایک ایک مخطوطے کا مطالعہ کیا، اس کی داخلی و خارجی شہادتوں پر گہری نظر رکھی۔قدیم نسخے پڑھنا اور اس کے مقام و عہد اور مصنف کا تعین کرنا بہت مشکل اور دقت طلب کام ہے تاہم ڈاکٹر زور اس میں بھی پوری طرح کامیاب ہوئے اور یہاں بھی وہ میرِ کارواں قرار پائے۔

ڈاکٹر زور کے نامکمل تحقیقی کام: ڈاکٹر زور نے تحقیق کے ذریعہ اردو زبان و ادب کے بے شمار پوشیدہ حقائق کو منظر عام پر لا کر اردو ادب کے سرمایے میں گراں قدر اضافہ کیا۔ان کے کئی اہم تحقیقی کارنامے بعد میں آنے والے محققین کے لیے مشعل راہ بنے۔ان متعدد کارناموں کے علاوہ ڈاکٹر زور کے تدوین متن کے تین کام ادھورے رہ گئے۔وہ تین کارنامے بالترتیب ارشاد نامہ (برہان الدین جانم) ابراہیم نامہ (عبدل) اور تاج الحقائق (وجہی) ہیں۔ان تینوں کتابوں کے متون سلسلۂ یوسفیہ کے تحت مجلس اشاعت دکنی مخطوطات سے ترتیب پا رہے تھے۔دورانِ ترتیب ہی سر سالار جنگ بہادر کے انتقال کے باعث یہ کام ادھورا رہ گیا۔ان کے انتقال کے بعد اپریل ۱۹۴۹ء میں رسالہ 'سب رس' کا سالار جنگ نمبر شائع ہوا۔اس

شمارہ میں میر سعادت علی رضوی نے ''سلسلۂ یوسفیہ'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اور آخر میں ان کتابوں کی فہرست بھی شائع کی جن کی طباعت کا کام سر سالار جنگ کی زندگی میں جاری تھا۔ ان ہی میں ڈاکٹر زور کی ان تینوں کتابوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ حالانکہ ۱۹۵۴ء میں دوبارہ سر سالار جنگ دکنی مخطوطات کمیٹی نے اپنا کام شروع کیا اور چند ایک کتابیں اس کے تحت شائع بھی ہوئیں لیکن ڈاکٹر زور کی یہ تینوں کتابیں شائع نہ ہو سکیں۔ ان کتابوں کے طباعت شدہ نسخے ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہیں۔ بعد میں ان تینوں قدیم ادبی شاہکاروں کو دوسرے محققین نے مرتب کیا۔ ارشاد نامہ کو ۱۹۷۰ء میں اکبرالدین صدیقی نے عثمانیہ یونی ورسٹی سے قدیم اردو کے سلسلہ کے تحت مرتب کیا۔ ابراہیم نامہ کی لسانی، ادبی اور تاریخی اہمیت کے پیش نظر پروفیسر مسعود حسین خان نے ۱۹۶۹ء میں سلسلۂ قدیم اردو کے تحت شعبۂ لسانیات علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے شائع کیا اور تاج الحقائق کو ڈاکٹر نورالسعید نے ۱۹۷۰ء میں مرتب کر کے بمبئی یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

مسعود حسین خان:

پروفیسر مسعود حسین خان اردو دنیا اور بالخصوص اردو تحقیق کے میدان کی ایک اہم شخصیت ہیں۔ وہ ایک کثیر الجہات شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ بیک وقت شاعر بھی تھے اور ناقد بھی، محقق و مدون بھی، ادبی مورخ اور ماہر لسانیات بھی۔ وہ ہر حیثیت میں اپنا ایک اہم اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ خصوصاً اسلوبیاتی مطالعے نے انھیں اردو حلقوں میں شہرت کی معراج پر پہنچا دیا ہے۔ انھیں اردو میں اسلوبیاتی تنقید کے امام کی حیثیت حاصل ہے۔ مسعود حسین خان نے اردو زبان کی جڑوں کو تلاش کر کے تاریخ زبان اردو کا ایک ایسا ناقابل فراموش کارنامہ انجام دیا ہے جسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ان کی بے شمار تحقیقی و تدوینی کاوشیں اشاعت کی منزلوں سے گزر کر اردو دنیا سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ذیل میں ان کی تحقیق و ترتیب سے متعلق کتابوں کو درج کیا جاتا ہے۔

مقدمہ تاریخ زبان اردو (۱۹۵۸)، بکٹ کہانی (۱۹۶۵)، قصہ مہر افروز و دلبر (۱۹۶۶)، دکنی اردو لغت (۱۹۶۸)، عاشور نامہ (۱۹۷۲)، رقعات رشید احمد صدیقی (۱۹۸۲)۔ اس کے علاوہ بے شمار تحقیقی و

تنقیدی مضامین رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

مسعود حسین خان کی پیدائش ۲۸ جنوری ۱۹۱۹ء بہ مقام قائم گنج (فرید آباد) میں ہوئی۔ان کے والد مظفر حسین کا انتقال ان کی پیدائش کے صرف چند سالوں بعد ہی ہو گیا تھا اور والدہ بھی بہت جلد راہیٔ ملک عدم ہو گئیں تھیں، لہٰذا مسعود حسین خان کی تعلیم و تربیت نانہال میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم پتورہ کے پرائمری اسکول میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۳ء تک وہیں تعلیم حاصل کی۔۱۹۳۵ء میں ڈھاکہ بورڈ سے میٹرک کیا۔۱۹۳۷ء میں انٹرمیڈیٹ اور ۱۹۳۹ء میں اینگلو عربک کالج دہلی (یونیورسٹی) سے بی۔اے۔میں کامیابی حاصل کی۔علی گڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۴۱ء میں ایم۔اے (اردو) اول درجے میں کیا۔۱۹۴۳ء میں شعبۂ اردو (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) میں عارضی لیکچرر کے طور پر ان کا تقرر عمل میں آیا۔۱۹۴۵ء میں تاریخ زبان اردو کے عنوان سے مقالہ لکھ کر علی گڑھ یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی۔کی ڈگری حاصل کی۔اسی سال علی گڑھ یونیورسٹی میں مستقل ملازمت پر فائز ہوئے۔۱۹۵۰ء میں یورپ جا کر اسکول آف اورینٹل اینڈ امریکن اسٹڈیز کے شعبۂ لسانیات میں داخلہ لیا۔۱۹۵۱ء میں لندن سے پیرس منتقل ہو کر ۱۹۵۳ء میں پیرس یونیورسٹی سے ڈی۔لٹ۔کی ڈگری حاصل کی۔اس ڈگری کے لئے A Phonetic and Phonologhical study of the word in urdu) کے موضوع کا انتخاب کیا۔ان کو کئی ملکی و بین الاقوامی اعزازات و انعامات سے نوازا گیا۔مسعود حسین خان کو ۱۹۷۵ء میں ایسوسی ایشن آف ایشین اسٹڈیز (افریکا) کی جانب سے سینیر فیلوشپ دی گئی۔جس کے تحت انھوں نے ٹکساس اور ہارورڈ یونیورسٹی سے لسانیات میں تربیت حاصل کی۔۱۹۰۹ء میں ڈپاٹمنٹ آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز آف کیلی فورنیا میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا اور ۱۹۶۲ء میں شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوئے۔دراصل ۱۹۶۲ء کے بعد ہی انھوں نے قدیم ادب کی تحقیق و تدوین کی طرف خصوصی توجہ دی۔مسعود حسین خان کی قدیم ادب پر گہری نظر کو حیدر آباد کی ادبی فضاؤں نے تقویت پہنچائی۔۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۸ء تک حیدر آباد میں ان کا قیام قدیم ادب پر تحقیق کے لیے نہایت اہم ثابت ہوا۔اس دوران انھوں نے شعبۂ اردو سے قدیم اردو کے عنوان سے قدیم متون کو ترتیب دے کر شائع کرنے کی بنیاد ڈالی۔اس سلسلے کے

تحت جو قدیم ادبی شہ پارے منظر عام پر آئے وہ ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے کو انھوں نے ۱۹۶۸ء میں علی گڑھ واپس جانے کے بعد بھی قایم رکھا۔

حیدر آباد سے واپسی کے بعد ۱۹۷۳ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے وائس چانسلر کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے۔ وہاں سے ۱۹۷۸ء میں سبکدوشی کے بعد شعبۂ لسانیات علی گڑھ میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے اور اسی شعبے سے ۱۹۸۱ء میں سبکدوشی حاصل کی۔ سبکدوشی کے بعد بھی کئی یونیورسٹیوں میں بہ حیثیت وزیٹنگ پروفیسر زبان و ادب اور تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس کے علاوہ متعدد ذی وقار علمی و ادبی انجمنوں، اداروں اور سلیکشن بورڈ کے رکن بھی رہے۔ یوں تو پروفیسر مسعود حسین خان کی علمی و ادبی کاوشوں کا ذکر مفصل مقالہ کا متقاضی ہے۔ تاہم یہاں صرف ان کی چند تحقیقی تصانیف کے ذریعہ ان کے مقام و مرتبے کے تعین کی کوشش کی جائے گی۔

مقدمہ تاریخ زبان اردو:

اردو میں ادبی تحقیق کے حوالے سے جن محققین نے لسانی تحقیق کی طرف توجہ کی ان میں مسعود حسین خان کا نام سرِ فہرست ہے۔ مسعود حسین خان نے اردو زبان کے آغاز وارتقا کے موضوع پر تحقیقی کام کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے اپنے تحقیقی مقالے میں اردو زبان سے متعلق ہریانوی زبان کے اثرات پر زیادہ توجہ صرف کی۔ مسعود حسین خان نے جدید لسانیاتی نظریات کی روشنی میں ہند آریائی زبانوں کا تفصیل سے مطالعہ کیا ہے اور اردو کا تعلق ان ہی جدید ہند آریائی زبانوں سے قایم کیا ہے۔ انھوں نے اردو پر ہریانوی زبان کے اثرات کے حوالے سے زور دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''قدیم دکنی کے مطالعے کے سلسلے میں اب تک ہریانوی کو بالکل نظر انداز کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہی زبان ہے جو قطع نظر شہر دہلی اور اضلاع دہلی میں آج بھی بولی جاتی ہے۔ پروفیسر شیرانی اسے قدیم اردو کی ایک شکل گردانتے ہیں۔ اردوئے قدیم سے متعلق لسانی تحقیق کے سلسلے میں جو اہمیت اس کو حاصل ہے، اس کی طرف سب سے پہلا اشارہ

پروفیسر زول بلوک نے اپنے ایک مضمون 'ہند آریائی لسانیات کے بعض مسائل' میں کیا ہے۔'' (۱۰)

اردو لسانیات کی تاریخ میں مسعود حسین خان کی کتاب 'مقدمہ تاریخ زبان اردو' بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ ان کی زندگی ہی میں اس کے متعدد اڈیشن شائع ہوئے اور ہر اڈیشن میں ترمیم و اضافے اور حک و اصلاح کا عمل جاری رہا۔ تاہم اس کے بنیادی مباحث ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی معرض تحریر میں آ چکے تھے۔ اردو لسانیات کے موضوع پر آج بھی یہ سب سے جامع اور مختصر کتاب ہے۔ اس کتاب میں پہلی مرتبہ سائنٹفک اصولوں پر اردو کی ابتدا سے متعلق بحث کی گئی ہے اور دہلی اور اطراف دہلی کو اردو کا مولد ثابت کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مرزا خلیل بیگ نے لکھا ہے کہ:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کے آغاز و ارتقا اور اس کی سلسلہ وار تاریخ پر جدید لسانیاتی تناظر میں اردو میں جدید تحقیقی نقطۂ نظر سے لکھی جانے والی یہ ایک ایسی جامع اور مستند تصنیف ہے جس کی ہم پایہ کوئی دوسری تصنیف آج تک منظر عام پر نہیں آسکی۔'' (۱۱)

پرت نامہ:

دکنی ادب کی تحقیق و تدوین میں مسعود حسین خان کا اہم کارنامہ 'پرت نامہ' کی تدوین ہے، جسے انھوں نے ۱۹۶۵ء میں شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی سے سلسلہ 'قدیم اردو' کے تحت شائع کیا۔ پرت نامہ سولہویں صدی عیسوی کی مثنوی ہے جسے فیروز بیدری نے تصنیف کیا تھا۔ پرت نامہ کو مسعود حسین خان نے دو نسخوں کی مدد سے ترتیب دیا تھا۔ اس سے قبل اس مثنوی کا تعارف ڈاکٹر زورؔ نے تذکرہ مخطوطاتِ اردو کے رسالے (اردو ادب ۱۹۵۷) میں اس مثنوی کا تعارف کروایا تھا۔ مسعود حسین خان نے دو نسخوں کے تقابل کے ذریعہ اس مثنوی کا صحیح متن مرتب کرنے کی کوشش کی جیسا کہ رقم طراز ہیں:

''انجمن اور ادارہ دونوں کے نسخوں کا مقابلہ کرنے سے متن کی ان خامیوں کا رزالہ ہو گیا اور اکثر اشکال دور ہو گئے ہیں۔ سب سے بڑی

بات یہ ہے کہ وہ ایک شعر نمبر (۴۴) جو انجمن کے نسخے میں غائب تھا وہ
ادارہ کے نسخے میں مل گیا ہے اور اس طرح پرت نامہ کا ایک سو اکیس
ابیات پر مشتمل متن تیار ہو گیا ہے'' (۱۲)

مسعود حسین خان نے انجمن کے نسخے کو بنیادی نسخہ بنا کر تحقیق کرنا شروع کیا اور ادارہ ادبیات اردو کے نسخے کو تقابل کے لیے استعمال کیا اور فٹ نوٹ میں اختلاف نسخ کو تحریر کیا۔ متن کے آخر میں فرہنگ اور ضمیمہ بھی پیش کر دیا گیا ہے۔ پرت نامہ پر ان کا مقدمہ نہایت عالمانہ ہے جس میں انھوں نے فیروز بیدری کے حالاتِ زندگی اور اس کی شاعری کی تفصیلات کو نہایت تلاش و تحقیق کے بعد پیش کیا ہے۔ اس معلومات کی تلاش و تحقیق کے لیے انھیں مثنوی کی داخلی اور خارجی دونوں سطح پر شہادتیں تلاش کرنی پڑیں ہیں۔ سولھویں صدی کی اس مثنوی کو مرتب کرنا آسان کام نہیں تھا۔ اس مثنوی کی زبان پر قدامت کا رنگ شدید طور پر غالب ہے۔ اس مثنوی کی سب سے اہم خوبی یہی ہے کہ مسعود حسین خان نے اس قدیم زبان کا لسانی جائزہ لے کر اردو زبان کی مختلف کڑیوں کی نشان دہی کی ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ان کی مرتبہ 'پرت نامہ' سائنٹفک طرز تدوین کی بہترین مثال ہے۔

بکٹ کہانی:

'بکٹ کہانی' افضل پانی پتی کی تصنیف ہے۔ اس مثنوی کو 'قدیم اردو' جلد اول کی اشاعت کے سلسلے میں انھوں نے نور الحسن ہاشمی کے اشتراک سے ترتیب دیا اور اس پر ایک وقیع مقدمہ بھی تحریر کیا۔ اس مقدمہ کو بعد میں الگ سے کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا۔

مسعود حسن خان نے شمالی ہند کی اس قدیم ترین مثنوی کو بڑی عرق ریزی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اس مرتبہ مثنوی میں عبدل کے حالات زندگی اور اس کی زبان سے متعلق مواد کو کافی تلاش کے بعد جمع کیا گیا ہے۔ نیز مختلف نسخوں کے تقابل کے بعد صحیح متن کو ترتیب دیا گیا ہے۔ مقدمہ کا اہم حصہ لسانی جائزے پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں شمالی ہند کی قدیم ترین زبان کا جائزہ لیتے ہوئے 'بکٹ کہانی' کی زبان کو زیر بحث لایا گیا اور دلائل و شواہد کی روشنی میں اسے شمالی ہند میں لکھا گیا اردو ادب کا پہلا نقش قرار دیا گیا ہے۔ اس ضمن

میں وہ لکھتے ہیں:

''بکٹ کہانی شمالی ہند میں اردو شاعری کا پہلا مستند نمونہ ہے جس کی موجودگی میں تاریخ ادب کا یہ معروضہ غلط ثابت ہو جاتا ہے کہ شمال میں اردو کی شمع ولی نے روشن کی تھی۔'' (۱۳)

'قصہ مہر افروز و دلبر:

'قصہ مہر افروز و دلبر' کے متن کو ۱۹۶۶ء میں ترتیب دے کر شائع کیا گیا۔ اس قصہ کی اہمیت کے پیش نظر اس کا ہندی اڈیشن بھی شائع کیا گیا۔ ۱۹۸۸ء میں اس کی دوسری اشاعت عمل میں آئی، جس میں ڈاکٹر پرکاش مونس کی معلومات کی روشنی میں مسعود حسین خان نے اپنے مقدمہ پر از سر نو نظر ثانی کی اور عیسوی خان کے متعلق تفصیلات پیش کیں۔ نیز اس کی زبان سے متعلق پرکاش مونس (مصنف اردو ادب پر ہندی کا اثر) کے چند بیانات کی تردید بھی کی۔ لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر پرکاش مونس اور ڈاکٹر گیان چند جین دونوں نے قصے کی زبان کی برجیت کی جانب بھی اشارے کیے ہیں تا کہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ یہ گوالیار کی زبان ہے نہ کہ دہلی کی۔ ان کا یہ قیاس صحیح نہیں۔ قصے کی زبان بنیادی طور پر کھڑی بولی ہے صرف کہیں کہیں برج کے روپ آجاتے ہیں ----- میرے خیال میں لسانی تجزیہ اور قصہ کی داخلی شہادتوں کی بنیاد پر عیسوی خان کا دہلوی خاندان سے ہونے کا دعویٰ بآسانی کیا جا سکتا ہے-------- بہر حال عیسوی خان کے بارے میں تحقیق کا دروازہ ابھی بند نہیں ہوا ہے'' (۱۴)

مسعود حسین خان تمام عمر درس و تدریس اور مختلف انتظامی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کی تحقیق کرتے رہے۔ ان کی تحقیقات میں زیادہ زور زیر بحث لسانیات پر ہوتا ہے۔ انھوں نے لسانیات کی تربیت بھی حاصل کی تھی اور ساری زندگی لسانی مطالعے میں صرف کی۔ یہی سبب ہے کہ ان کے بیشتر کارناموں میں اس کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ بہر حال انھوں نے قدیم متون کی تلاش و ترتیب میں بڑی

جانفشانی کا ثبوت دیا ہے اور ترتیب متن کے لیے جس حزم واحتیاط کی ضرورت ہوتی ہے، ان سب کو بحسن و خوبی نبھایا اور تدوین متن کے اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے کئی اہم متن ترتیب دیے۔ بالخصوص ان متون کے لسانی جائزے تحقیقی وتنقیدی اعتبار سے نہایت اہم مقام رکھتے ہیں۔ اردو تحقیق انھیں ان کے کارناموں کی بدولت ہمیشہ یاد رکھے گی۔

سیدہ جعفر:

پروفیسر سیدہ جعفر اردو تحقیق وتنقید کا ایک معتبر اور اہم نام مانا جاتا ہے۔ خصوصاً دکنیات کی تحقیق میں انھوں نے اپنے منفرد نقش ثبت کیے ہیں۔ تادم تحریر سیدہ جعفر کے اس قدر تحقیقی کارنامے منظر عام پر آچکے ہیں جو انھیں دنیائے تحقیق میں ایک معتبر مقام عطا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ خاص کر دکنیات کی تحقیق و تدوین پر ان کارنامے ان کی تحقیقی ژرف نگاہی، سخت محنت اور لگن کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ایک معتبر ناقد کی حیثیت سے بھی اردو ادب میں ان کی حیثیت مسلم ہے۔

پروفیسر سیدہ جعفر حیدرآباد کے ایک ذی علم گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے جد اعلیٰ سید رضی نے حضرت علی کے خطبات مرتب کیے تھے۔ نہج البلاغہ کی ترتیب وتدوین ان کا یادگار کارنامہ ہے۔ پروفیسر صاحبہ کے جد امجد سید والہ موسوی اپنے عہد کے بلند پایہ مصنف و شاعر اور انشا پرداز تھے۔ انھوں نے مثنوی 'پھول بن' کے جواب میں مثنوی 'طالب وموہنی' لکھی تھی۔ اس مثنوی کو ڈاکٹر زور نے مرتب کر کے شائع کیا۔ وآلی ویلوری (مصنف روضۃ الشہدا اور رتن پدم) بھی پروفیسر صاحبہ کے بزرگوں میں تھے۔

سیدہ جعفر کی پیدائش ۱۹۳۴ء میں ضلع کریم نگر حیدرآباد میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم نامپلی گرلز ہائی اسکول حیدرآباد میں ہوئی۔ وہیں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ویمنس کالج (عثمانیہ یونی ورسٹی) سے انٹرمیڈیٹ کامیاب کرنے کے بعد عثمانیہ یونی ورسٹی سے ہی بی اے اور پھر ایم اے کرنے کے بعد پروفیسر عبدالقادر سروری کی نگرانی میں 'اردو مضمون کا ارتقا' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ۱۹۵۹ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی سند حاصل کی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ مکمل ہونے سے قبل ہی ۱۹۵۸ء میں نظام کالج میں بحیثیت اردو لکچرر ان کا تقرر ہو چکا تھا۔

وہ ۱۹۶۵ء میں شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ میں ریڈر کے عہدے پر فائز ہوئیں۔۱۹۸۳ء میں پروفیسر اور ۱۹۸۴ء میں صدر شعبۂ اردو مقرر ہوئیں۔ پروفیسر سیدہ جعفر کئی علمی و ادبی اداروں سے بھی وابستہ رہیں۔ ان کی تحقیقی وتنقیدی کتابوں پر مختلف اکیڈمیوں نے انھیں انعامات سے نوازا۔ان کے اعزازات میں ڈاکٹر زورؔ ایوارڈ،فراقؔ ایوارڈ،نوائے میرؔ ایوارڈ، بیسٹ اردو اسکالر اور قاضی عبدالودود ایوارڈ شامل ہیں۔ذیل میں ان کے تحقیقی کاموں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

ماسٹر رام چندر اور اردو کے ارتقا میں ان کا حصہ: ڈاکٹر سیدہ جعفر کی یہ پہلی مطبوعہ کتاب ہے جو ۱۹۶۰ء میں مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہوئی۔ڈاکٹر صاحبہ کو ان کے پی۔ایچ۔ڈی۔ کے موضوع پر تحقیق کرتے ہوئے ماسٹر رام چند کے نثری کارنامے دریافت ہوئے اور یہ حقیقت بھی آشکارا ہوئی کہ سرسید سے بھی بہت پہلے ماسٹر رام چندر نے مضمون نگاری شروع کردی تھی۔اسی مناسبت سے ڈاکٹر صاحبہ نے ماسٹر رام چندر کو اردو کا پہلا مضمون نگار ثابت کیا۔ چنانچہ اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر انھوں نے اس پر مزید تحقیق جاری رکھی اور ماسٹر رام چندر کی حیات اور ان کی مضمون نگاری پر ایک مبسوط کتاب تصنیف کی۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اس کتاب کے مواد کے لیے تمام ممکنہ ماخذات سے استفادہ کیا ہے۔اس کے لیے انھوں نے تمام متعلقہ کتابوں کے علاوہ اخبار الحقائق دہلی، اردو اخبار دہلی، آگرہ، سنیچر اور کلکتہ ریویو وغیرہ سے استفادہ کیا اور ماسٹر رام چندر کی تصنیفات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے پیش رو محققین کے متعدد بیانات کی تردید بھی کی ہے۔

اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔حصہ الف میں ماسٹر رام چندر کی زندگی اور ان کی تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے اور حصہ ب کے تحت ماسٹر رام چندر کے مضامین کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ ماسٹر رام چندر اور ان کے کارناموں کی اہمیت پر بات کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ’’ان کی تحریریں قدیم اور جدید کی درمیانی کڑی ہیں۔ان کا اسلوب سادہ، رواں اور سلیس ہے اور اس میں نثری قدروں سے زیادہ اس کے معنوی حسن پر زور دیا گیا ہے۔ ماسٹر رام چندر کی تحریروں میں نئی زندگی

کی آہٹیں سنائی دیتی ہیں۔ ان کی عبارتیں مشینی دور کی آمد کا احساس دلاتی ہیں۔ جب سماجی زندگی اور گہما گہمی اور کشمکش تیز ہو چکی تھی اور ادیبوں اور انشا پردازوں کو فرصت کاروبار شوق میں کمی کا احساس ہونے لگا تھا۔ اور اسی احساس نے نثر کو سادہ اور فطری انداز عطا کیا تھا۔ رام چندر نے اردو نثر کو اس اسلوب سے روشناس کرایا۔ میں نے ماسٹر رام چندر کو بلند مرتبہ انشا پردازوں کی صف میں کھڑا نہیں کیا لیکن ان کے صحیح مقام کا تعین کرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔'' (۱۵)

ڈاکٹر سیدہ جعفر کی اس تحقیق سے قبل ماسٹر رام چندر کے حالات اکثر تذکرہ نگاروں کے یہاں بہت مختصراً تحریر تھے۔ اس کے علاوہ ماسٹر رام چندر رسالہ 'فوائد الناظرین' شائع کیا کرتے تھے۔ ان رسالوں کے متعلق بھی اکثر محققین اور مضمون نگاروں کو غلط فہمیاں تھیں۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اس ضمن میں اہم معلومات پیش کی ہیں۔ نیز عرصہ تک سرسید، حالی اور شبلی کو اردو کے اولین مضمون نگار مانا جاتا تھا۔ خاص طور پر سرسید کو اردو مضمون نگاری میں اولیت حاصل تھی۔ بقول سیدہ جعفر:

'' یہ معلوم کر کے بڑا تعجب ہوتا ہے کہ سرسید اپنے مضامین کو مضمون نگاری کے اولین نقوش سمجھتے تھے۔ ماسٹر رام چندر کے مضامین یا تو سرسید کی نظر سے نہیں گزرے تھے یا سرسید ماسٹر رام چندر کے مضامین کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔'' (۱۶)

آگے چل کر وہ اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ:

''مضمون نگاری کے ارتقا میں سرسید کے مضامین ایک توسیع ہیں آغاز نہیں۔ ماسٹر رام چندر اردو کے پہلے مضمون نگار ہیں جنھوں نے شعوری طور پر اردو ادب میں اس صنف کی ابتدا کی۔'' (۱۷)

ڈاکٹر صاحبہ نے ماسٹر رام چندر کے عہد کے پس منظر میں ان کے مضامین کا جائزہ لیا ہے اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کے مقام کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ ماسٹر رام چندر کو اردو دنیا سے

متعارف کروانے اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا مقام متعین کرنے کی اولین کوشش ڈاکٹر سیدہ جعفر ہی کی ہے۔

اردو مضمون کا ارتقا ۱۹۵۰ء تک: یہ کتاب جو دراصل ڈاکٹر سیدہ جعفر کا تحقیقی مقالہ ہے، ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو کی پہلی کتاب ہے جس میں اردو مضمون نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز اس کتاب میں مضمون اور انشائیہ کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ اس سے قبل مضمون اور انشائیہ کو ایک ہی صنف قرار دیا جاتا رہا ہے۔

پروفیسر سیدہ جعفر نے اس کتاب میں نہ صرف اردو بلکہ دودسری زبانوں میں انشائیہ نگاری کے ابتدائی نقوش پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اردو نثر میں مضمون نگاری کے آغاز و ارتقا کا جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب میں ماسٹر رام چندر کے علاوہ ۱۹۵۰ء تک کے دوسرے اہم مضمون نگاروں کے متعلق تفصیلات بھی پیش کی گئی ہیں۔ چونکہ اردو مضامین مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں اس لیے محقق نے سماجی، اصلاحی، سیاسی، تاریخی، رومانی، مذہبی، فلسفیانہ، تنقیدی اور تحقیقی تمام اقسام کے مضامین کا جائزہ لیا ہے۔ یہ ایک اہم تحقیقی کتاب ہے تاہم اس کتاب کی ایک خامی کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ مصنفہ نے پوری کتاب میں کہیں بھی کوئی حوالہ درج نہیں کیا ہے صرف اقتباسات درج کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ حتیٰ کہ کتاب کے آخر میں بھی ماخذات کی فہرست نہیں دی گئی ہے۔ حالانکہ یہ کتاب ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی ہے اور تب تک اردو تحقیق اپنی کئی منزلیں طے کر چکی تھی۔ اور تحقیقی اصول و مبادیات مدون ہو چکے تھے۔ نیز تحقیق کے اعلیٰ معیاری نمونے بھی منظر عام پر آ چکے تھے۔

پروفیسر سیدہ جعفر نے غیر تدوینی تحقیق کے علاوہ تدوینی تحقیق میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ غیر تدوینی تحقیق میں مذکورہ بالا کتاب کے علاوہ ڈاکٹر زور ۱۹۸۴ء بھی ان کا قابل ذکر تحقیقی کام ہے۔ جس میں انھوں نے ڈاکٹر زور کے حالات اور ان کے علمی، ادبی اور تحقیقی کارناموں کا دقت نظر سے جائزہ لیا ہے اور اردو میں ان کے مقام و مرتبے کے تعین کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ڈاکٹر گیان چند جین کے اشتراک سے اردو ادب کی تاریخ ابتدا سے ۱۷۰۰ء تک مرتب کی جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے پانچ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اردو ادب کی تاریخ ۱۷۰۰ء سے ترقی پسند تحریک تک تین جلدوں میں

انھوں نے تنہا مرتب کی جو ۲۰۰۴ میں شائع ہو کر داد تحقیق حاصل کر چکی ہیں۔ یہاں ان کی ترتیب و تدوین متن سے متعلق تحقیقی خدمات کا اجمالی جائزہ لیا جاتا ہے۔

من سمجھاون: یہ شاہ تراب کی منظوم تصنیف ہے جو مہاراشٹر کے عظیم فلسفی اور مشہور شاعر سمرتھ رام درس کی تصنیف 'شری مناچے شلوک' سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔ اس طویل نظم کو پروفیسر سیدہ جعفر نے دسمبر ۱۹۶۴ء میں مرتب کیا۔ شاہ تراب تمل ناڈو کے صوفی بزرگ اور ایک پرگو شاعر تھے۔ شاہ تراب سلسلۂ چشتیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے پہلی بار مسلمانوں کے متصوفانہ خیالات کو ہندو فلسفہ کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی تھی۔ بقول پروفیسر مسعود حسین خان:

> ''مذہبی فکر کی سطح پر رام اور رحیم کو اس طرح مدغم کرنے کی جرأت شاید ہی کسی دوسرے صوفی نے کی ہو۔ رام اور رحیم کبیر کی اصطلاح میں ایک ہی ذات کے دو نام ہیں۔ لیکن صوفیانہ واردات میں دونوں کے فرق کو مٹا کر صرف رام کے نام سے یاد کرنا متصوفانہ تصورات کی دنیا میں محض ایک قدم آگے کا معاملہ نہیں بلکہ ایک زبردست جست اور جسارت ہے۔''(۱۸)

شاہ تراب کا اصلی نام تراب علی تھا۔ اس نام کے اور بھی دوسرے بزرگ گزرے ہیں۔ جس کی بنا پر اکثر تذکرہ نگاروں کو تسامح ہوا تھا۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے ایسے کئی ناموں کی نشان دہی کی ہے۔ شاہ تراب کی زندگی کے حالات کسی تذکرے میں مذکور نہیں تھے۔ فاضل محقق نے شاہ تراب کے حالات ان کی تصانیف کی داخلی شہادتوں سے اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور کافی تحقیق و تلاش سے شاہ تراب کی حالات زندگی، ان کا سلسلۂ بیعت خلافت، مذہب، ان کا سفر اور ان کی اولاد وغیرہ کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ شاہ تراب کے ہم عصر شعرا میں ولی ویلوری، فراقی، طالب، ندیم، نعیم احمد اور عشرتی کے ناموں کا ذکر کیا ہے۔ شمالی ہند کے ہم عصر شعرا میں میر، سودا، مظہر اور یقین کے نام شامل کیے ہیں۔

شاہ تراب کی تصانیف میں ظہور کل، گنج الاسرار، گلزار وحدت، گیان سروپ، آئینۂ کثرت، مثنوی مہ جبین وملا اور من سمجھاون کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ شاہ تراب کی ایک اور تصنیف 'حجۃ الاسلام' اور مجموعہ

کلام شاہ تراب کا بھی ذکر کرتی ہیں۔ جس کا نسخہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ میں اور ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں مخزونہ ہے جس پر مصنف شاہ عبدالغنی لکھا ہے لکھتی ہیں کہ یہ ابھی تحقیق طلب ہے۔ پروفیسر گیان چند جین نے سیدہ جعفر اور من سمجھاون کی ترتیب کے حوالے سے بات کرتے ہوئے لکھا ہے:

''۱۹۶۵ء میں من سمجھاون کو ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے بھی مرتب کیا ہے۔ عبدالستار دلوی کو مراٹھی زبان پر عبور حاصل ہے۔ دلوی صاحب نے شاہ تراب کی صرف پانچ تصانیف کا ذکر کیا ہے اور شاہ تراب کے حالات بھی وہ مفصل نہ لکھ سکے جیسا کہ سیدہ جعفر صاحبہ نے شاہ تراب کی سات تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے بمبئی کے صرف ایک ہی نسخہ سے 'من سمجھاون' کو مرتب کیا جب کہ سیدہ جعفر نے ۶؍نسخوں کے تقابل سے مرتب کیا ہے۔ ان کا (پروفیسر عبدالستار دلوی) کا کام سیدہ جعفر کے مفصل کارنامے سے بہت پیچھے رہتا ہے۔'' (۱۹)

گیان چند جین نے مذکورہ دونوں محققین کی فروگذاشتوں پر بھی گرفت کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''من سمجھاون کی ابتدا میں نثر کے دو جملے ہیں، ان کے بعد دو شعر۔ ممبئی کے نسخے میں انھیں تین شعر مان کر مسدس کے ایک بند کے طور پر لکھا ہے۔ دلوی نے اسی طرح چھاپ دیا۔ سیدہ جعفر نے جملوں نیز اشعار کو نثر سمجھا اور انھیں نثر کی چار سطروں میں چھاپ دیا۔ دونوں میں سے کسی نے وزن کی بنا پر نثر و نظم کو الگ نہیں کیا۔'' (۲۰)

پروفیسر صاحبہ نے 'من سمجھاون' کا ادبی اور لسانی جائزہ بھی لیا ہے۔ من سمجھاون بارہ مختلف حصوں پر مشتمل ہے۔ ہر حصہ میں بندوں کی تعداد مختلف ہے اور ہر حصہ الگ الگ موضوع پر لکھا گیا ہے۔ من سمجھاون چونکہ 'شری مناچے شلوک' سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی اس لیے ان دونوں میں بہت سی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ پروفیسر صاحبہ نے ان دونوں کا تقابل بھی کیا ہے۔ ان کی مماثلتیں، ان کی ہیئت اور ان کے مشترک نکات و نظریات کا تفصیلی تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔

دکنی رباعیاں: یہ کتاب ۱۹۶۶ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب میں پروفیسر سیدہ جعفر کی تحقیقی اور تدوینی صلاحیتوں کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں رباعی کے فن کے متعلق نہایت ہی جامع اور مبسوط دیباچہ تحریر کیا گیا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں ۳۶ شعرا کی رباعیاں مع تدوینِ متن کے دی گئی ہیں۔ ان کے اختلاف نسخ بھی فٹ نوٹ میں دیے گئے ہیں۔

کتاب کے ابتدائی حصہ میں رباعی کے فن سے بحث کی گئی ہے۔ اس میں رباعی کے مختلف نام، رباعی کی قسمیں، عروضی خصوصیات، ایجاد و ابتدا اور دوسری زبانوں میں رباعی نما اصناف سخن، دکنی رباعیات کی خصوصیات، رباعی کا فن اور دکنی شعرا، دکنی رباعیوں کے موضوعات اور دکنی رباعیاں اور ضرب الامثال وغیرہ جیسے ذیلی عنوانات کے تحت اس موضوع کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ موضوعات رباعی کے فن اور اس کے ابتدا و ارتقا کو سمجھنے میں ایک ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔۔ گویا پروفیسر صاحبہ نے رباعی اور اس کے فن کی جامع تشریح کر دی ہے اور بڑی ہی عرق ریزی سے اس فن کا جائزہ لیا ہے۔ ان سب کے باوجود ان سے چند لغزشیں بھی سرزد ہو گئی ہیں جن کی طرف گیان چند جین نے اپنے مضمون میں نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پروفیسر سیدہ جعفر نے ہندی کی چوپائی کو رباعی کے مماثل قرار دیا ہے۔ جب کہ گیان چند جین کے خیال میں چوپائی کوئی صنفِ سخن نہیں بلکہ ایک بحر کا نام ہے جس میں ۱۶/ماترائیں ہوتی ہیں۔

مختلف زبانوں کی رباعی نما اصناف کا جائزہ لینے کے بعد پروفیسر سیدہ جعفر نے دکنی رباعیات کے ذیلی عنوان سے دکنی رباعی کی خصوصیات اور ان کے موضوعات کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ دکنی رباعیوں کے متعلق وہ لکھتی ہیں:

> ''رباعیات دکنی ادب کی ابتدا ہی سے موجود نظر آتی ہیں۔ دکن میں جہاں مختلف اصناف سخن پروان چڑھی ہیں وہیں رباعی کی داغ بیل پڑی۔ اور یہ فخر بھی دکن کو حاصل ہے کہ یہاں اردو شاعری کی ایسی صنف نے بھی جنم لیا جو اپنی منفرد خصوصیات اور اپنے انفرادی رنگ و آہنگ کی وجہ سے ادب میں ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ دکن کے رباعی گو شعرا نے زندگی کے رنگا رنگ تجربات کو بڑی خوبی کے ساتھ

رباعی میں سمو دیا ہے۔ ان کے یہاں اخلاقی ،صوفیانہ ، عاشقانہ اور
خمریاتی ہر قسم کی رباعیاں موجود ہیں۔'' (۲۱)

رباعی کے مکمل تعارف اور دکن میں رباعی گوئی کی ابتدا اور ارتقا کے متعلق تفصیلات پیش کرنے کے بعد دکنی شعرا کی رباعیاں بلحاظ تاریخی ترتیب کے پیش کی گئی ہیں۔خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی رباعی سے شروعات کی گئی ہے جو اسٹیٹ لائبریری (حیدرآباد) کی مخزونہ ایک بیاض میں موجود ہے اور شاہ کمال کی رباعیوں پر اس کا اختتام ہوا ہے۔ دکن کے قابل ذکر شعرا میں فیروز، قلی قطب شاہ، غواصی، وجہی، علی عادل شاہ ثانی، نصرتی، ولی، داؤد، عاصی، سراج، شہ میر، عزلت، تمنا اور شاہ کمال وغیرہ کی رباعیاں ترتیب دی گئی ہیں۔

سکھ انجن : یہ ایک تفصیلی نظم ہے جس میں شاہ ابوالحسن نے تصوف کے مسائل اور نکات کو'' آنکھ مچانی'' (آنکھ مچولی) کے کھیل کی تمثیل میں بیان کیا ہے۔ دراصل آنکھ مچانی ایک کھیل کا نام ہے جو دکن کی عورتوں اور بچوں کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ آج بھی دیہی علاقوں میں اس طرح کا کھیل کھیلا جاتا ہے۔صوفیائے کرام نے اکثر یہ کوشش کی کہ دکن کی عورتوں کے مشاغل کی تمثیل میں تصوف کے گہرے نکات بیان کیے جائیں تاکہ عوام اور نکات و مسائل کو آسانی سے سمجھ سکیں۔ چنانچہ چکی نامہ، سہاگن نامہ، لوری نامہ اور شادی نامہ وغیرہ اسی طرز اظہار کی نمائندگی کرتے ہیں۔سکھ انجن بھی اسی طرز سخن کی ایک کڑی ہے جسے سیدہ جعفر نے ۱۹۶۸ء میں مرتب کر کے لطف الدولہ اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے شائع کیا۔سکھ انجن کے متعلق وہ لکھتی ہیں:

''سکھ انجن میں شاہ ابوالحسن نے تصوف کے بعض مسائل کو تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔طفلانہ بازی،آنکھ مچانی کھیلنے والے لڑکے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ لڑکا اپنی آنکھیں بند کر کے گرد و پیش سے بے خبر ہو جائے اس کے ذریعے سے شاہ ابوالحسن نے یہ نکتے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔۔۔آنکھ مچانی کا مفہوم یہ ہے کہ جسم مادی سے بے خبر ہو جائے تاکہ عالم ملکوت منکشف ہو سکے۔ شاہ ابوالحسن نے ان تمام نکات کو سیدھے سادے اور عام فہم طریقے سے کھیل کے پیرایے میں

اس طرح بیان کیا ہے۔''(۲۲)

پروفیسر سیدہ جعفر نے شاہ ابوالحسن کے حالات زندگی اوران کی ادبی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے نیز ان کے کلام کا ناقدانہ جائزہ بھی لیا ہے۔ خاص طور پران کے صوفیانہ نکات کا جائزہ لیا ہےاوراس نظم کے مختلف اشعار کو سامنے رکھ کر تصوف کے مختلف نکات کی تشریح و تجزیہ بھی کیا ہے۔ اس نظم کا لسانی جائزہ لے کراس کی اہمیت وافادیت کے تعین کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ اس نظم کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''شاہ ابوالحسن نے اپنی نظم سکھ انجن کو حکایات، پہیلی، اقوال، احادیث اورآیات سے آراستہ کیا ہے۔ کہیں مولانا روم کے اشعار کی تشریح کی ہے تو کہیں حضرت شرف الدین یحیٰی منیری کے مکتوب کا اقتباس پیش کیا ہے، کہیں حضرت ابوبکر صدیق، ابوبکر شبلی اورامام غزالی کے اقوال کی افادیت کو واضح کیا ہےاورکہیں کسی مذہبی تلمیح کی مدد سے اپنے مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔''(۲۳)

مقدمہ کے آخر میں شاہ ابوالحسن کی ایک اورمختصر نظم 'توصیف' بھی ترتیب دی ہے۔ تدوین کے ضمن میں پروفیسر سیدہ جعفر کا یہ ایک اوراہم کارنامہ ہے۔

حواشی:

۱۔محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، مکتبہ کلیاں، بشیرت گنج لکھنؤ،۱۹۶۰ء،ص۴

۲۔محمود شیرانی (مرتب)، پرتھوی راج راسا، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی،۱۹۴۳ء،ص۴۱۷

۳۔مظہر محمود شیرانی (مرتب)، مقالات حافظ محمود شیرانی، جلد سوم مجلس ترقی ادب، کلب روڈ لاہور،۱۹۶۹ء

۴۔محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، مکتبہ کلیاں، بشیرت گنج لکھنؤ،۱۹۶۰ء،ص ب

۵۔سیدمحی الدین قادری زور، مرقع سخن، مکتبہ ابرہیمیہ حیدرآباد،۱۹۳۷ء، پیش لفظ

۶۔سیدمحی الدین قادری زور، اردو شہ پارے، مکتبہ ابرہیمیہ حیدرآباد،۱۹۲۹ء،ص ۷۔۶

۷۔سیدمحی الدین قادری زور، داستان ادب حیدرآباد، طارق پریس حیدرآباد،۱۹۵۱ء،ص ۱۵

۸۔ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ، مرزا علی لطف: حیات اور کارنامے، حیدرآباد،۱۹۵۱ء،ص۱۴۴

۹۔سیدمحی الدین قادری زور، تذکرۂ مخطوطات، جلد اول، حیرآباد،۱۹۴۳ء،ص۱۳

۱۰۔مسعود حسین خان، مقدمہ تاریخ زبان اردو، علی گڑھ،۱۹۸۷،ء ص ۲۳۶

۱۱۔مرزا خلیل بیگ، اردو میں لسانیاتی تحقیق، مشمولہ فکر و نظر، جلد:۳۱، شمارہ:۲،۱۹۹۴ء،ص۳۳

۱۲۔مسعود حسین خان، ''مرتبہ پرت نامہ'' مشمولہ 'قدیم اردو'، حیدرآباد،۱۹۶۵ء،ص ۳۳۶

۱۳۔مسعود حسین خان، بکٹ کہانی، مشمولہ 'قدیم اردو'، حیدرآباد،۱۹۶۵ء،ص ۳۹۵

۱۴۔مسعود حسین خان، دیباچہ طبع ثانی، قاصہ مہر افروز و دلبر طبع دوم، حیدرآباد،۱۹۸۸ء،ص ۱۱۔۱۰

۱۵۔سیدہ جعفر، ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ، حیدرآباد،۱۹۶۰ء،ص۳۲

۱۶۔ایضاً، ص۱۵

۱۷۔ایضاً، ص۵۲

۱۸۔سیدہ جعفر، من سمجھاون، حیدرآباد،۱۹۶۴ء

۱۹۔گیان چند جین، مضمون سیدہ جعفر بہ حیثیت محقق، مشمولہ فکر و نظر، علی گڑھ،۲۶۲

۲۰۔ایضاً،۲۶۲

۲۱۔سیدہ جعفر،دکنی رباعیاں،ساہتیہ اکیڈمی،دہلی،۱۹۶۶ء،ص۳۵۔۳۴

۲۲۔سیدہ جعفر،سکھ انجن،حیدرآباد،۱۹۶۸ء،ص۸۱

۲۳۔ایضاً،ص۹۱

(ب) متنی تحقیق

(سید مسعود حسن رضوی ادیب، قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، مالک رام نورالحسن ہاشمی

(ب) متنی تحقیق

سید مسعود حسن رضوی ادیب:

سید مسعود حسن رضوی ادیب ۲۹ر جولائی ۱۸۹۳ء کو اناؤ میں پیدا ہوئے۔ مڈل کی تعلیم اناؤ ہی میں حاصل کی۔ حالات کی نامساعدت کے باوجود مزید تعلیم کی غرض سے ۱۹۰۸ء میں لکھنؤ آ گئے اور حسین آباد ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا، جہاں مولوی مہدی حسین ناصری اور جوش ملیح آبادی بھی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس اسکول میں سید جواد شاگرد میر عشق دینیات کے استاد اور غیر معمولی ادبی استعداد کے مالک تھے۔ فارسی زبان پر ان کو بڑا عبور حاصل تھا۔ وہ ادیب کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ادیب کو ان کی شخصیت میں ایک حقیقی عالم کا جلوہ نظر آتا تھا۔ ادیب نے یہاں سید صاحب کی صحبت سے بڑا فیض حاصل کیا۔

لکھنؤ کی طالب علمی کے اسی دور نے ایک طرف ادیب کے ادبی ذوق کو جلا بخشی تو دوسری طرف ان کو اس مٹتے ہوئے شہر اور اس کی ختم ہوتی ہوئی ادبی اور تہذیبی روایات نے مسحور کرنا شروع کر دیا۔ ان کی ملاقات بہت سے ایسے لوگوں سے ہوئی جنھوں نے اپنی آنکھ سے واجد علی شاہ کا زمانہ اور ۱۸۵۷ء کا آشوب دیکھا تھا۔ ان سب کے پاس دلچسپ اور عبرتناک حکایتوں کا ایک خزانہ تھا۔ جس سے ادیب یہاں تک متمتع ہوئے کہ اپنی ادبی زندگی میں انھوں نے واجد علی شاہ اور لکھنؤیات پر خصوصی توجہ کر کے ان دونوں موضوع پر سند کی حیثیت حاصل کر لی۔

۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۷ء تک ادیب کیننگ کالج (موجودہ لکھنؤ یونیورسٹی) کے طالب علم تھے۔ ان کے بورڈنگ ہاؤس کے ساتھیوں میں علی عباس حسینی اور مرزا حامد حسین وغیرہ ادب کے شائق اور مطالعے کے دیوانے تھے۔ ان میں ادبی موضوعات پر گرم گرم بحثیں ہوتیں جن میں ادیب کا فیصلہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا۔ مرزا محمد ہادی رسوا، بیخود موہانی اور یاس یگانہ چنگیزی سے ان کے مراسم اسی زمانے میں شروع ہوئے۔ مذکورہ اہلِ قلم ادیب کے وسیع مطالعے بالخصوص ان کے شعری ذوق کے بہت قائل تھے۔

۱۹۱۷ء میں بی۔اے۔ پاس کرنے کے بعد ادیب نے ایم۔اے۔ انگریزی میں داخلہ لیا لیکن شدید

علالت کی وجہ سے امتحان نہ دے سکے اوران کا ایک تعلیمی سال ضائع ہو گیا۔معاشی پریشانیوں کے باعث اسی زمانے میں انھوں نے یو پی حکومت کے محکمۂ تعلیم کے کیٹلاگ ڈیپارٹمنٹ میں بحیثیت مبصر ملازمت اختیار کر لی جوان کی ادبی زندگی کا ایک اہم باب ثابت ہوئی۔اس بابت وہ خود لکھتے ہیں:

''اسی اثنامیں صوبۂ متحدہ کے سررشتۂ تعلیم میں ایک نئی جگہ نکالی گئی،جس کا کام یہ تھا کہ ہر سہ ماہی میں اس صوبے میں جتنی کتابیں چھپیں،ان کی فہرست تمام ضروری تفصیلوں کے ساتھ مرتب کر کے صوبے کے سرکاری اخبار (یو پی گورنمنٹ گزٹ) میں شائع کی جائے اور جمہور کے خیالات کا رجحان دریافت کرنے کی غرض سے کتابوں پر تبصرے لکھ لکھ کراس رپورٹ کے لیے سامان فراہم کیا جائے جوسررشتۂ تعلیم کے ڈائریکٹرکو ہر سال گورنمنٹ کے پاس بھیجنا پڑتی تھی۔اپریل ۱۹۱۸ء میں اس جگہ پر میرا تقرر ہو گیا۔۔۔کوئی ساڑھے تین سال میں نے اس جگہ پر کام کیا۔اس زمانے مین صوبۂ متحدہ میں ہر سال ڈھائی تین ہزار کتابیں چھپتی تھیں۔اس طرح اس ملازمت کی بدولت مختلف موضوعوں پر چھوٹی بڑی تقریباً دس ہزار کتابیں میری نظر سے گزریں۔ مطالعے کی اس کثرت اورتنوع نے میری نظر میں وسعت اوردل میں تصنیف وتالیف کا شوق پیدا کیا اور ادبی مشاغل کی نئی نئی راہیں سجھائیں۔(۱)

اس ملازمت میں ادیب نے ہر مہینے دو ڈھائی سو کتابیں پڑھ پڑھ کر ان پر مبصرانہ نوٹ لکھے۔اس طرح انھیں تیز رفتاری کے ساتھ مطالعہ کرنے اور لکھنے کی اچھی مشق ہوگئی۔اپنی ذاتی ادبی زندگی میں بھی ان کے پڑھنے کی رفتار تیز تھی لیکن زودنویسی کی مشق کوانھوں نے عادت نہیں بننے دیا۔بلکہ اس کے برعکس ان کی تصنیفی وتحقیقی تحریر کی رفتار بہت سست تھی۔یہی نہیں بلکہ اپنے زیرِ قلم موضوع سے متعلق کتابیں بھی وہ خاصی سست رفتاری کے ساتھ پڑھتے تھے۔

۱۹۲۲ء میں ادیب لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے پہلے لکچرر اور چند سال کے بعد فارسی کے ریڈر اور شعبۂ فارسی و اردو کے صدر مقرر ہوئے۔ اب تصنیف و تالیف کا شوق ان کا منصبی فرض بھی بن گیا۔ اسی کے ساتھ ان کو اہم اور کم یاب اردو فارسی کتابوں اور مخطوطوں کی جمع آوری کا ایسا شوق پیدا ہوا کہ وہ پرانے لکھنؤ کے گلی کوچوں میں گھوم گھوم کر کتابوں کے ذخیروں تک پہنچتے اور شہر کے کتب فروش نادر کتابوں کی گٹھریاں لے کر ان کے پاس پہنچنے لگے۔ رفتہ رفتہ ان کے پاس قدیم، نادر اور کم یاب کتابوں اور مخطوطوں کا ایسا ذخیرہ جمع ہو گیا جس کا شمار ملک کے اہم کتاب خانوں میں ہونے لگا۔ ادیب اس ذخیرے کی قریب قریب ہر کتاب کو بہ غور پڑھتے اور بیش تر اہم کتابوں کے بارے میں خود ان کتابوں پر یا علاحدہ یادداشتیں لکھتے تھے۔

منتشر مواد کو ایک منظّم کتاب کی شکل دینے اور اسے مناسب ابواب و مباحث میں تقسیم کرنے کو وہ تحقیقی کام کے مشکل ترین مرحلوں میں شمار کرتے اور اس میں غیر معمولی محنت اور مہارت صرف کرتے تھے۔ اچھوتے موضوعات پر تحقیقی کتاب کی پہلے سے منصوبہ بندی اور تنظیم شاید ممکن بھی نہیں ہے۔ ادیب فراہم شدہ مواد اور اس سے دستیاب معلومات کو بار بار دیکھ کر اسی کی مدد سے کتاب کا نظم درست کرتے تھے۔ اردو ڈراما اور اسٹیج کی تاریخ کے سلسلے میں انھوں نے واجد علی شاہ کے رہس 'رادھا کنھیا کا قصہ'، ان کے تصنیف اور اسٹیج کیے ہوئے دوسرے ڈراموں اور امانت کی اندر سبھا پر کام مکمل کر کے اسے دو مستقل کتابوں کی صورت دے دی تھی۔ لیکن ابھی ان کے پاس قدیم ڈرامے کے مختلف عناصر کے بارے میں بہت سا مواد منتشر صورت میں جمع تھا۔ جس کی تنظیم کا کوئی مناسب نقشہ ان کے ذہن میں نہیں تھا اور اس اہم مواد سے کام لیے بغیر کتاب تیار کر دینے پر ان کا تحقیقی ذہن آمادہ نہیں تھا۔ اس لیے انھوں نے دونوں کتابوں کی طباعت کو برسوں تک روکے رکھا۔

کسی کتاب کی ترتیب شروع کرنے کے بعد ان کا سارا وقت اسی کتاب کے لیے وقف ہو جاتا تھا اور ان کی گفتگوؤں کا موضوع بھی زیرِ ترتیب کتاب ہی رہ جاتی۔ دیوانِ فائز کی ترتیب کے دنوں میں بقول نیر مسعود ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھیں فائز کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کا علم ہی نہیں ہے۔ ترتیب کے زمانوں میں معاصر محققین کے ساتھ ان کی خط و کتابت کی رفتار بھی بڑھ جاتی تھی۔ پٹنہ میں قاضی عبدالودود اور پروفیسر سید

حسن، رام پور میں مولانا امتیاز علی عرشی، الہ آباد میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، حیدرآباد میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور پروفیسر عبدالقادر سروری، دہلی میں خواجہ احمد فاروقی کے علاوہ مالک رام اور پروفیسر نذیر احمد وغیرہ سب کو علم ہوجاتا کہ آج کل وہ کس موضوع پر کام کررہے ہیں اور یہ سب اکابران کی فرمائش پر بھی اور از خود بھی ان کے مفید مطلب معلومات ان کے لیے فراہم کرتے تھے اور یہ سلسلہ کام کی تکمیل کے بعد تک جاری رہتا تھا۔ کبھی بعض اہم مخطوطوں کو دیکھنے کے لیے ادیب خود بھی دوسرے شہروں کے سفر کرتے۔ اکثر اہلِ ادب اور کتاب داران کے ساتھ پورا تعاون کرتے مگر کبھی کبھی اس کے برعکس تجربے سے بھی دوچار ہونا پڑتا تھا۔ میؔر کے فارسی رسالے ''فیض میر'' کی ترتیب کے دوران ان کو جو تجربہ ہوا، اس کی روداد اور اس پر ان کا ردِعمل انھیں کے لفظوں میں یہ ہے:

> ''رسالہ فیض میر کا جو نسخہ میرے کتاب خانے میں ہے وہ بدخط بھی ہے اور کرم خوردہ بھی۔ اس کے پڑھنے میں پوری کوشش کی گئی پھر بھی بعض لفظ مشتبہ رہ گئے۔ جی چاہتا تھا کہ اگر اس رسالے کا کوئی دوسرا نسخہ مل جائے تو اس سے مقابلہ کرکے مشتبہ مقامات کی تصحیح کرلی جائے۔ خدا خدا کرکے پتا لگا کہ رام پور میں ایک صاحب کے پاس یہ رسالہ موجود ہے۔ کامیابی کی یہ صورت جو نظر آئی تو میرا شوق مجھ کو رام پور کھینچ لے گیا لیکن انتہائی کوششوں پر بھی رسالے کا مقابلہ ممکن نہ ہوسکا۔ مقابلے کا کیا ذکر، مالکِ رسالہ نے واقفِ حال لوگوں کو اپنا نام بتانے کی بھی اجازت نہیں دی۔ بہرحال پروفیسر سید محمد نقی صاحب شادماں لکھنوی اور مولوی عزیز اللہ صاحب مدیر ماہنامہ نیرنگ (رام پور) کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس معاملے میں کافی کوشش کی اور مالکِ رسالہ کا بھی کہ ان کے طرزِ عمل کی بدولت انسانی فطرت کا ایک نیا پہلو پیش نظر ہوگیا۔ اب اس کتاب میں جو غلطیاں ہیں ان کا ذمہ دار قارئین مجھ کو نہیں بلکہ انھیں رام پوری حضرت کو قرار دیں جنھوں نے مجھ کو ان

غلطیوں کی تصحیح کا موقع نہ دیا۔'' (۲)

ادیب کی تحقیق وتنقید سے اختلاف بھی کیے گئے۔ وہ اختلاف سے بدمزہ نہیں ہوتے تھے بلکہ سنجیدہ علمی اختلاف کو پسند کرتے تھے۔ مشفق خواجہ نے ان کے مرتب کیے ہوئے تذکرے ''گلشن سخن'' پر اپنے تبصرے میں متعدد اعتراضات کیے جنھیں انھوں نے نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اس تبصرے میں مشفق خواجہ کا جو اعلیٰ تحقیقی معیار سامنے آیا اس کی وجہ سے ادیب ان کو پہلے سے زیادہ عزیز رکھنے لگے۔ سہ ماہی ''تحریر'' کے ادیب نمبر میں شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون ''ہماری شاعری پر نظرِ ثانی'' پڑھ کر بعض لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ یہ ''ہماری شاعری'' کی مخالفت میں ہے۔ لیکن یہ مضمون خود ادیب کی فرمائش پر لکھا گیا تھا اور خود اشاعت سے پہلے ادیب نے اسے پڑھا اور پسند کیا تھا۔ اپنے اوپر تو نہیں البتہ اپنی محبوب ادبی اور تاریخی شخصیتوں مثلاً انیس، محمد حسین آزاد اور واجد علی شاہ پر اعتراضات سے ادیب کو واقعی اور ذاتی تکلیف پہنچتی تھی لیکن ایسے مواقع پر بھی ان کا ردِ عمل غیر متوازن نہیں ہونے پاتا تھا۔

اردو ڈرامے پر جس طرح مسعود حسن رضوی ادیب نے تحقیق کی ہے اور لکھنؤ کا شاہی اسٹیج اور لکھنؤ کا عوامی اسٹیج کی صورت میں اردو ڈرامے کے سلسلے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کو جس طرح دور کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے اردو ڈرامے کے آغاز کا پتہ لگایا اور یہ ثابت کیا کہ واجد علی شاہ اردو کے پہلے ڈراما نگار تھے۔ حقائق کی بازیافت کے لیے انھوں نے جتنی احتیاط کا مظاہرہ کیا، اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ چنانچہ ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ''بالکل ابتدائی ڈرامے پر اردو کے بزرگ محقق سید مسعود حسن رضوی کی کتاب اردو ڈراما اور اسٹیج تحقیق کا شاہکار ہے۔ اردو میں اس معیار کی تحقیق کم ہوئی ہے۔'' (۳)

مرثیہ اور خاص طور پر انیس کے سلسلے میں انھوں نے جو کام کیا ہے اس کی بدولت وہ ماہرِ انیسیات کہلانے کے مستحق ہیں۔ انھوں نے جس طرح انیس کے کلام کو صحیح متن کے ساتھ شائع کیا اس کی بدولت انیس کی شاعرانہ خوبیاں نکھر کر سامنے آئی ہیں۔ اسلاف میر انیس بھی ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ اسی طرح رزم نامۂ انیس بھی ایک شاہکار ہے۔ انھوں نے انیس کا ہر طرح سے دفاع کیا ہے۔ اور دلائل وشواہد کے ساتھ میر

انیس کو عظیم شاعر ثابت کیا ہے۔

واجد علی شاہ پر ان کی کتاب ان کا ایک تحقیقی کارنامہ ہے۔ واجد علی شاہ کے بارے میں تصویر کا دوسرا رخ دکھانے میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا اور اس علم دوست، علم پرور اور صاحب تصنیفات بادشاہ کی خدمات کا بھرپور جائزہ لے کر مخالفوں کے پروپگنڈوں کے اثرات کو زائل کرنے کی کوشش کی ہے۔

فائز اور دیوان فائز ان کا وہ تحقیقی کارنامہ ہے جس پر انھوں نے قاضی عبدالودود جیسے بت شکن محقق سے بھی داد وصول کی۔ دیوانِ فائز کی دریافت اس وجہ سے اہم ہے کہ اس نے شمالی ہند میں اردو شاعری کی تاریخ کو آگے بڑھا دیا۔ اردو کے سبھی مؤرخین شمالی ہند میں امیر خسرو کے ذکر کے بعد گجرات اور دکن کا ذکر کرتے آئے ہیں اور پھر اچانک دہلی میں حاتم، مضمون اور ایہام گو شعرا کا۔ مسعود حسن رضوی نے فائز کا دیوان دریافت کر کے اس سلسلے کی ایک گم شدہ کڑی فراہم کر دی۔ دیوانِ فائز دہلوی کا قلمی نسخہ انھوں نے ۱۹۲۵ء میں دریافت کیا تھا۔ بیس سال کے بعد انھوں نے اسے مرتب کر کے ۱۹۴۶ء میں شائع کیا۔ مزید بیس سال تک وہ مطبوعہ متن و حواشی اور اس کے مقدمے کی حک و اصلاح اور اس میں اضافے کرتے رہے۔ اس کا دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔

تذکرہ گلشن ہند مصنفہ مردان علی خان مبتلا لکھنؤ کا قلمی نسخہ انھیں حکیم سید علی آشفتہ سے ملا تھا۔ اس پر انھوں نے اولاً ایک مضمون ''شعرائے اردو کا ایک تذکرہ'' کے عنوان سے دسمبر ۱۹۳۲ء کے رسالہ 'ہمایوں' لاہور میں شائع کیا۔ اصل تذکرہ اس کے کوئی تیس بتیس سال بعد ۱۹۶۵ء میں انجمن ترقی اردو ہند سے شائع ہوا۔ یہ مدت انھوں نے تذکرے کے کسی اور نسخے کی تلاش اور کتاب کے مسخ شدہ ایڈیشن کو صحیح طور پر پڑھنے اور مغلوط و مصحف الفاظ و کلمات کو درست کرنے میں صرف کی۔ غنیمت یہ ہے کہ انھوں نے اس پر حواشی لکھنے کا خیال ترک کر دیا ورنہ اس کے لیے مزید مدت درکار ہوتی۔

''متفرقات غالب'' مرتب کرنے سے غالب کے قیام کلکتہ، ان کے وہاں کے لوگوں سے تعلقات اور ان کا وہاں کہا ہوا کلام اور اس طرح کی بہت سی چیزیں پہلی بار سامنے آئیں۔ غالبیات کے سلسلے میں یہ خاصا اہم کام ہے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ ''غالب، تب اور اب'' کے نام سے مقبول اکیڈمی لاہور نے شائع کیا

جو غالبیات کے سلسلے میں مباحث کے لیے نئے در وا کرتا ہے۔

قواعدِ زبان کے سلسلے میں ''اردو زبان اور اس کا رسم الخط'' اور لسانیات کے موضوع پر ''نظام اردو'' پر ان کے حاشیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس طرح 'مجالسِ رنگین' اور 'فسانۂ عبرت' کی ترتیب و تدوین کی اشاعت ان کے اہم تحقیقی کارنامے ہیں۔ ان کی تحقیق کے موضوعات میں تنوع بھی ہے اور تازگی بھی۔ نیز ان کا طریقۂ تحقیق ان کو اپنے معاصر محققین سے ممتاز کرتا ہے۔ وہ تحقیق میں جس قدر احتیاط سے کام لیتے ہیں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں:

> ''ان تصانیف سے کہیں زیادہ اہم ہے ان کا اندازِ تحقیق و ترتیب۔ مسعود حسن رضوی ہر مسودے کو کئی بار لکھتے تھے، نقل کراتے تھے، پھر اس پر اضافے کراتے، گھٹاتے بڑھاتے، پھر نقل کراتے۔ ان کی سبھی تصانیف میں ایک ایسا ربط ملتا ہے جو محققین کے لیے قابلِ تقلید ہے۔ یہ منطقی ربط لفاظی سے پاک ہے اور جب تک ضروری نہ ہو اس وقت تک وہ اپنی رائے ظاہر کرنے یا حقائق کے معروضی اظہار سے آگے بڑھ کر کوئی تبصرہ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ گویا تقریباً پوری عبارت ترتیب مقدمات ہوتی ہے اور دلائل کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ دلائل سے اختلاف ممکن ہے مگر مسعود صاحب دلائل یا ادعا کو دلیل کا بدل نہیں بناتے۔''(۴)

جیسا کہ کہیں ذکر کیا گیا کہ ان کا مزاج اپنے ہم عصروں سے مختلف ہے۔ وہ عیب بینی اور نکتہ چینی سے اکثر گریز کرتے ہیں۔ ان کا یہاں تک کہنا ہے کہ شبہ کا فائدہ ہمیشہ زیرِ بحث مصنف کو ملنا چاہیے۔ تحقیق اس مفروضے سے نہیں شروع ہونی چاہیے کہ ہر بات غلط ہے بشرطیکہ صحیح ثابت نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس شریفانہ اعتدال کی رو میں کہیں کہیں وہ بہت آگے بھی نکل گئے ہیں۔ خصوصاً جب واسطہ محمد حسین آزاد یا واجد علی شاہ یا انیس سے ہو یا ذکر لکھنؤ کا ہو تو ان کی عقیدت تحقیق پر جا بہ جا غالب آجاتی ہے۔ یہی صورت اس وقت بھی پیدا ہو جاتی ہے جب وہ واقعات کربلا پر گفتگو کرتے ہیں۔ اس بات کے ثبوت میں روحِ انیس، نقد

انیس اور دیگر متعلقہ کتابوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔

انھوں نے ساری عمر علم و ادب کی تدریس و تحقیق میں گزاری۔ اگر ہم ان کے تحقیقی کارناموں پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے جس موضوع پر بھی کام کیا ہے وہ اس میں اہم ترین حیثیت رکھتے ہیں اور بلا شبہ ان کا شمار اردو کے ان نقادوں اور محققوں میں ہوتا ہے جنھوں نے تنقید کے نئے گوشے اجاگر کیے اور تحقیق کے لیے نئی راہیں نکالیں البتہ ان کی اصل حیثیت ایک محقق کی ہے، اس لیے ان کی تنقید میں بھی تحقیقی انداز ہی پایا جاتا ہے۔ تحقیقی اعتبار سے انھیں جو مقام ملا اور ان کے معاصر محققوں نے جس طرح ان کی خدمات کا اعتراف کیا، وہ بلا شبہ اس سے زیادہ کے حقدار تھے۔

قاضی عبدالودود:

پروفیسر محمد حسن نے لکھا ہے: ''قاضی عبدالودود دراصل ایک شخص کا نام نہیں ایک طرز زندگی کا نام ہے۔''(۵) یہ طرز زندگی کیا ہے؟ اور اس طرز زندگی نے ان کی تصانیف پر کیا اثر ڈالا؟ یہ جاننے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ بصورت دیگر ان کی صحیح قدر و قیمت کا تعین ممکن نہیں ہو سکتا۔

قاضی عبدالودود (۱۸۹۶۔۱۹۸۴) نے پٹنہ کے ایک شدت پسند مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ اس گھرانے میں مذہب کے نام پر قدامت ہی سب کچھ تھی۔ نئی روشنی، نئے علوم، نئے افکار اور نئے زمانے کے تقاضوں کو خلافِ مذہب سمجھ کر ان کا رد اور تکفیر کرنا اس خاندان کا علمی مشغلہ تھا۔ قاضی عبدالودود جو ایک خلاق ذہن اور تحقیقی فطرت لے کر پیدا ہوئے تھے، اس ماحول سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کر سکے۔ ان پر اس ماحول کا ردِ عمل اتنا شدید ہوا کہ وہ مذہب ہی کا انکار کر بیٹھے۔

ان کی ابتدائی تعلیم حسبِ قاعدہ مدرسے سے ہوئی۔ یہاں سے انھوں نے اسکول اور اسکول سے اعلیٰ تعلیم تک کا سفر طے کیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے یوروپ سے بیرسٹریٹ لا کا امتحان بھی پاس کیا۔ کچھ دنوں پٹنہ میں وکالت کرنے کے بعد اس پیشے سے فطری ہم آہنگی نہ ہونے کے سبب وکالت کو خیر آباد کہہ دیا اور تمام عمر علم و ادب کی تحقیق کو اپنا مشغلہ بنایا۔ ان کے مشرقی ذہن میں جب مغربی خمیر شامل ہوا تو اس کی دراکی اور تیزی میں مزید اضافہ ہوا۔ لیکن یہ سارے اضافے اور یہ تربیت و تعلیم صرف ذہن و علم تک محدود نہ تھی بلکہ یہ

ایک مزاج اور مزاج کے ساتھ ہی ایک کردار تیار کر رہی تھی۔اسی مزاج و کردار نے انھیں زندگی میں کارفرما علمی اصولوں، ضابطوں کی دریافت اور ان کی علمی ترتیب و تنظیم پر مجبور کیا۔

انھوں نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد آرام و آرائش، وسیلۂ معاش اور سماجی منصب و مرتبہ کی خواہش نہیں کی بلکہ صرف علمی و تحقیقی زندگی کو اختیار کیا اور تاعمر تلاش و تحقیق کو مشغلے کے طور پر اپنایا۔ نہ جانے کتنے ہی ارمانوں اور خواہشات، ضروریات، سہولت و مراعات کو تج دیا اور مطالعۂ کتب و علمی انہاک کو ہی زندگی کا حاصل جانا۔انھوں نے اپنی زندگی کا اکسٹھ سالہ ادبی سفر (۱۹۲۳۔۱۹۸۴) اس طرح طے کیا جس طرح طے کرنا اس علمی زندگی کے لیے ضروری تھا۔مختصر یہ کہ انھوں نے علمی میدان میں تحقیق کو ایک طرز زندگی کی طرح اپنایا اور ایک گوارہ دیوانگی و مقدس سنجیدگی اختیار کی۔

وہ تمام عمر کتابی زندگی جیے۔انھوں نے اپنے لیے علمی و عقلی بنیادوں پر کچھ عقائد، کچھ افکار اور کچھ اقدار منتخب کر لیے اور انھیں کی روشنی میں اپنی شخصی زندگی کے لیے بھی کچھ اصول و معیار متعین کیے جن پر وہ تمام عمر عامل رہے۔مذہب کے تعلق سے انھوں نے دین اسلام کی سب سے بڑی سچائی حقیقت یا حق گوئی کی شناخت کو اپنا ایمان قرار دیا۔ وہ زندگی بھر سچ کی تلاش میں سرگرداں رہے اور سچ ہی دوسروں تک پہنچاتے رہے۔ان کا قلم ان کی زبان ہی نہیں بلکہ وہ مکمل طور پر سچ کے ترجمان بن گئے تھے۔اسی ایمان و عقیدت کے تحت وہ عمل اور نیت، قول اور فعل دونوں کے درست ہونے پر زور دیتے ہیں۔مصلحت اور منافقت ان کے یہاں شدید جرم ہے اور ناقابلِ معافی بھی۔انھوں نے اپنے تحقیقی کارناموں کی بنیاد اپنے اصولوں پر استوار کی ہے۔

قاضی عبدالودود نے معلوم سے نامعلوم کا انکشاف بھی کیا اور علمی توضیح وتشریح بھی لیکن ان کی تحقیقات کا بڑا حصہ ارباب ادب کے علم اور نیت عمل، قول و فعل کے تضاد اور حقیقت امر کے خلاف پائے جانے والے مفروضات و بیانات کی نفی و تردید اور صحت و تصحیح کے لیے مختص ہے۔انھوں نے علم کے نام پر کی جانے والی اجارہ داری کا طلسم توڑا، شخصیات پرستی کی نفی کی، ذہن و فکر پر روایت کے بوجھ کو کم کیا، اصولوں اور معیاروں کی موجودگی میں جرأت و بے باکی کا درس دیا، احتیاط پسندی اور جزرسی کو فروغ دیا اور بقول نذیر احمد ''اردو

تحقیق کو نئی جہات سے آشنا کیا۔‘‘(۶)

قاضی صاحب کے تحقیقی سفر کی ابتدا ستائیس سال کی عمر میں ایک تحقیقی مقالے سے ہوئی جو پٹنہ کے ایک رسالے’’المصباح‘‘ کے اپریل ۱۹۲۳ء کے شمارے میں ذکر خواجہ معین الدین امین ۔ذکر حضور وسلیم کے عنوان سے شائع ہوا۔ کچھ عرصہ بعد انھوں نے چند اصحاب کے ساتھ مل کر ایک انجمن بنام’’انجمن ترقی اردو‘‘ بنائی۔ ۱۹۳۶ء میں اسی انجمن کی جانب سے ایک ماہنامہ’’معیار‘‘ جاری کیا۔معیار کی اشاعت کے ساتھ ہی انھوں نے خود کوادب و تحقیق کے لیے وقف کر دیا۔معیار کی اشاعت بند ہو جانے کے بعد کلیم الدین احمد کے رسالے’معاصر‘ کو اپنی تحقیقات کے لیے منتخب کیا۔

تبصروں ومضامین کے دو مجموعے عیارستان (پٹنہ ۱۹۵۷ء) اور اشتر وسوزن (پٹنہ ۱۹۶۴ء) کے علاوہ ان کے چند مرتبات بھی ان کی زندگی میں شائع ہوئے۔ان کی چھوٹی بڑی تحریروں کی تعداد جمیل احمد خان کے مرتبہ اشاریہ کے مطابق تقریباً ۲۹۰ ہے۔(۷)

گزشتہ چند سالوں میں قاضی صاحب کی تمام تحریروں کو ماضی کے گم شدہ اوراق سے تلاش کر کے موضوعات کی صورت میں یکجا کتابی شکل میں شائع کرنے کا عمل خدا بخش لائبریری پٹنہ نے انجام دیا ہے۔ اس طرح اس علمی ورثے کا تحفظ ہو گیا جو تاریخ کی بعض گم شدہ کڑیوں کو مضبوط کرنے میں معاون ہوا ہے۔ ان تمام کتب کو بیک نظر دیکھنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ قاضی صاحب کے موضوعات تحقیق عام طور پر تاریخ ادب، متنی تنقید، نقد فرہنگ، تصحیح کتب وصحت مفروضات ومسلمات رہے ہیں۔

قاضی عبدالودود نے اردو کے علمی وادبی سرمایے کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور جستہ جستہ اردو کے اہم و غیر اہم مصادر ومنابع تلاش کر کے تاریخی، لسانی اور تصحیحی مطالعے پیش کیے۔انھوں نے ریزہ ریزہ دریافت و بازیافت کے عمل کو جاری رکھا اور معلومات وحقائق کے دفتر کے دفتر لگا دیئے۔ اس سلسلے میں انھوں نے موضوع کے انتخاب میں اہم اور غیر اہم کی تمیز کو بھی ختم کر دیا۔انھوں نے ترتیب متن کے جو کام کیے وہ ان شعرا پر ہیں جن کا نہ اس وقت تک تاریخ ادب میں کوئی مرتبہ تھا اور نہ قاضی صاحب کی محنت شاقہ کے بعد انھیں کوئی مرتبہ حاصل ہو سکا۔ مثلاً دیوان جوشش عظیم آبادی (۱۹۴۱) اور دیوان رضا عظیم آبادی (۱۹۵۶)۔

انھوں نے کسی بھی موضوع پر مستقل کوئی کام نہیں کیا۔ ان کی علمی زندگی کا شاید سب سے تاریک پہلو یہی ہے۔ اہم وغیر اہم کی تمیز، موضوعی اہمیت و معنویت ہی کا ان کے یہاں فقدان نہیں بلکہ وہ اپنے مقالوں میں مواد کی خاکہ بندی، تاریخی یا ارتقائی کیفیت کا بھی لحاظ نہیں رکھتے۔ معلوم حقائق کی پیش کش کے سوا ان کی توجہ کسی چیز پر نہیں رہتی۔ ان تمام کمزوریوں کے باوجود وہ ''محققوں کے محقق'' اور تحقیق کے معلم ثانی سمجھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر شمس بدایونی کے مطابق اس کے دو اسباب ہیں:

> ''اول یہ کہ انھوں نے تحقیق کو موضوع کا پابند نہیں اصول و طریق استدلال کا خوگر بنایا۔ دوم یہ کہ اپنی علمی و تحقیقی زندگی میں انھوں نے غیر معمولی مگر حتمی تحقیق کو اپنا مقصود بنایا اور اردو کے علمی سرمایے کو اس کا ہدف بنایا۔''(۸)

تحقیق قاضی صاحب کی نگاہ میں کسی امر کو اس کی اصل شکل میں دیکھنے کا نام ہے۔ محقق کا منشا صرف اور صرف حقائق کی دریافت ہونا چاہیے۔ اس کے لیے جس اخلاقی بلندی کی ضرورت ہوتی ہے اس میں وہ محقق کی پسند و ناپسند اور رعایت و مصلحت پسندی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ سہیل عظیم آبادی کے ایک سوال کے جواب میں قاضی صاحب نے کہا تھا کہ ''جب مختلف شعبہ ہائے زندگی میں ہمارا اخلاقی معیار بلند ہوگا تو تحقیق کا معیار بھی بلند ہو جائے گا۔''(۹)

بات صاف ہے: ادبی تحقیق کی اخلاقیات اور بنیادی اخلاقیات میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ جس سماج میں بنیادی اخلاقیات میں پستی موجود ہو، جس سماج میں منافقت، ریاکاری اور بزدلی کو بلاتردد اپنا لیا جاتا ہے، جہاں ضمیر کی آواز کے بجائے ہمیشہ طاقت، شہرت اور سستی ہردلعزیزی کی آواز پر آواز دینے والوں کا جم غفیر ہو، جہاں کوئی قدر آخری قدر نہ رہ گئی ہو اور ہر قلم و ہر زبان کی قیمت لگ سکتی ہو، جہاں بے ضمیری کامیابی کی تنہا سیڑھی بن چکی ہو اور خوشامد محنت سے بچنے کا آسان ترین وسیلہ۔ وہاں تحقیق جو کردار کا بلند ترین نقطہ ہے۔ حق یا سچ کی تلاش اور سچ مل جائے تو اس کا بے روک اظہار، اس سماج میں یہ توقع ایسی خوش فہمی ہے جس کی سرحدیں معصومیت سے ملنے لگتی ہیں۔

قاضی صاحب نے جو تحقیقی کام کیے ہیں ان کی موضوعات کے اعتبار سے اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی

اصول وطریق کاراورطرز استدلال واستنباط کے اعتبار سے ہے۔اوراس میں کوئی شک نہیں کہ قاضی صاحب نے اپنے معاصراہل قلم کے شعور تحقیق کو بیدار کرنے میں اہم کردارادا کیا ہے۔

جیسا کہ کہیں ذکر کیا گیا کہ قاضی صاحب نے موضوع کی اہمیت ومعنویت پر زور دینے کے بجائے صرف سچ کی تلاش اوراس کے اثبات سے سروکار رکھا۔اسی لیےان کے بیش تر تحقیقی کارنامے ادب کی تاریخ میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے، البتہ ان کے کارناموں کی روشنی میں تحقیق کے زریں اصول ومعیار ترتیب دیے جاسکتے ہیں۔انھوں نے دوسروں کے ذریعے انجام پانے والے تحقیقی کارناموں پر اپنی تنقیدوں کے ذریعے گرفت کی ہےاور محقق کی فروگذاشتوں کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ اصل حقائق سے پردہ اٹھانے کا کام بھی کیا ہے۔ان کے کارناموں میں تبصرے وتنقیدیں زیادہ ہیں۔قاضی صاحب کے اس رویے پر نثار احمد فاروقی یوں رقم طراز ہیں:

> ''قاضی صاحب جب کسی کی نفی کرنے پرآ جائیں تو ان کا قلم خوب چلتا ہےاور مطالعہ کے آفاق بھی وسیع تر ہوجاتے ہیں۔لیکن مثبت تحریروں میں وہ چند جملوں سے آگے نہیں جاسکتے۔دراصل وہ اپنی انا کے حصار سے باہر نہیں آسکتے۔محمد حسین آزاد، مولوی عبدالحق، مرزا غالب اور شاد عظیم آبادی کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا ہے مگر وہ یکطرفہ ہے۔ان حضرات کی خوبیوں کا وہ شاذ ہی اعتراف کرتے ہیں۔''(۱۰)

قاضی صاحب کی اس عیب جوئی اور مشکوک فطرت کو کئی محققین نے تنقید کا نشانہ بنایا ہے مگر کیا کیا جائے کہ یہی تشکیک، تحقیق کے لیے راستہ ہموار کرتی ہے۔قاضی صاحب کی عیب جوئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گیان چند جین نے لکھا ہے:

> ''قاضی عبدالودود نے اپنے وقت کا ۹۵ فیصد دوسروں کی عیب جوئی میں صرف کیا۔شاید ۵ (پانچ) فیصد ہی اپنی طرف سے کسی کام میں دیا ہو۔نتیجہ یہ کہ اغلاط شماری سے ہٹ کر ان کی اپنی کوئی کتاب نہیں جسے مثالی کارنامے کے طور پر پیش کیا جاسکے۔تصحیح کی اہمیت مسلم لیکن یہ

اپنے وقت اور صلاحیت کا بہترین استعمال نہیں۔محمود شیرانی کی 'تنقید شعرالعجم' طاقِ نسیاں میں پڑی ہے۔ان کے دوسرے کارنامے زندہ ہیں۔(۱۱)

قاضی صاحب کے مزاج کی شدت وقطعیت اور اپنے معیاروں پر اصرار ہی نے ان کے مخالف پیدا کیے۔انھوں نے بلاشبہ اغلاط شماری کی لیکن یہ کام تو عطا کاکوی، رشید حسن خان اور عابد پشاوری نے بھی کیا ہے ۔حقیقت یہ ہے کہ قاضی صاحب نے اردو میں احتساب کے عمل کو جاری کیا اور محاسبہ اور محاکمہ کی ایک فضا بنائی جو اغلاط کی نشان دہی اور ان کی صحت کے بغیر ممکن نہ تھا۔اس سلسلے میں انھوں نے ادب اور تاریخ ادب کی ہر سمت، ہر پہلو اور ہر سطح کو دیکھا۔

باوجود اپنی ترجیحات و معیارات پر اصرار کے ''اخلاقیات تحقیق'' سے انھوں نے کبھی روگردانی نہیں کی۔جن چیزوں کے بارے میں وہ نہیں جانتے ان سے اپنی لاعلمی کا ظہار کر دیتے ہیں اور جہاں ان کی رسائی نہیں وہاں اپنا حدودِ علم بیان کر دیتے ہیں۔اگر دلائل وشواہد یا واقعات ان کے اپنے مزعومات و خیالات کو بدلنے پر مجبور کرتے ہیں تو وہ اس سے بھی نہیں ہچکچاتے۔ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے لکھا ہے کہ:

''غالب کی راست گفتاری لکھ کر غالب کو کاذب بلکہ کذاب ثابت کر چکے تھے اور بحیثیت محقق کے بالکل جاہل بھی۔اب کچھ دنوں سے اس خیال میں تبدیلی آ رہی ہے اور کبھی کبھی کہتے ہیں کہ اس قسم کی باتیں کسی ہوش مند کے قلم سے نکل ہی نہیں سکتیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دماغی توازن باقی نہیں رہا تھا۔''(۱۲)

اپنی تحقیقات پر نظر ثانی کرتے رہتے تھے اور نئے مصادر و منابع کی موجودگی میں پرانی تحریروں کو کالعدم قرار دیتے تھے۔غلط نامہ کو معذرت کے طور پر کتاب یا مضمون کا حصہ بنا دیتے اور کبھی کبھی غلط نامہ کا بھی ایک غلط نامہ ہوا کرتا، ادبی رسائل کی تاریخ میں شاید ان کا پہلا اور آخری رسالہ ''معیار'' تھا جس کے ہر شمارے کا اغلاط نامہ، شمارے میں شامل دوسری تحریروں کی طرح شاملِ اشاعت ہوتا۔

اخلاقیات تحقیق میں ان امور کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ان کے تحقیقی رویے کو وسیع تر معنی میں

سمجھنے اور سمجھانے کے لیے بڑے علم، مطالعے اور فرصت کی ضرورت ہے۔

امتیاز علی عرشی:

امتیاز علی عرشی ۸؍دسمبر ۱۹۰۴ء کو محلّہ پھلواڑ رام پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ثانوی تعلیم کے لیے ۱۹۱۸ء میں مدرسہ مطلع العلوم میں داخلہ لیا۔ یہاں چار سال مکمل ہونے کے بعد ایک سال کے لیے مدرسہ عالیہ میں تعلیم مکمل کی۔ ۱۹۲۳ء میں اورینٹل کالج لاہور سے مولوی عالم کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ۱۹۲۴ء میں اسی کالج سے مولوی فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ اسی سال پہلی غزل کہی اور تاج تخلص اختیار کیا۔ بعد میں تخلص تبدیل کر کے عرشی کر لیا۔ ۱۹۲۶ء میں صرف ایک مضمون انگریزی میں امتحان دے کر انٹرنس کی سند حاصل کی۔ ۱۹۲۸ء میں پہلی تصنیفی کوشش پنجاب یونی ورسٹی کے بی۔ اے۔ کے نصاب کی عربی کتاب کا اردو ترجمہ کی صورت میں منظر عام پر آئی۔ ۱۹۲۹ء میں ندوہ کے سفیر کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد ۱۹۳۰ء میں جرمنی کمپنی نومان سلائی مشین کی ایجنسی لی اور تجارت کا آغاز کیا۔ جولائی ۱۹۳۲ء میں رضا لائبریری رام پور میں ناظم کتب خانہ کی حیثیت سے تقرری ہوئی۔ یہیں سے ان کی تحقیقی و تصنیفی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ ۲۵؍فروری ۱۹۸۱ء کو چھہتر برس کی عمر میں انتقال کیا اور کتب خانہ سے متصل نواب محمد سعید خان اور نواب یوسف علی خان کے مقبرے کے پاس مدفون ہوئے۔

امتیاز علی عرشی ان معدودے چند لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اردو اور فارسی زبان و ادب سے متعلق اہم تحقیقی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ شبلی و شیرانی کی روایت کو جن لوگوں نے آگے بڑھایا، مولانا عرشی کا نام ان میں سرِ فہرست ہے۔ اردو، فارسی، عربی اور پشتو زبان و ادب کے علاوہ تاریخ و اسلامیات سے متعلق ان کے سوا سو سے زائد مقالات ہندو پاکستان کے ادبی و تحقیقی مجلوں اور رسالوں میں شائع ہوئے۔

اگرچہ مولانا عرشی کی تعلیم مشرقی طرز پر ہوئی تھی اور انھیں کسی کالج یا یونیورسٹی میں باضابطہ تعلیم حاصل کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ تاہم انھوں نے مغرب کے جدید تحقیقی اصولوں کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان سے بھی بڑی اچھی آگاہی حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مخصوص روایتی ماحول کے برخلاف اپنے لیے نئی راہ کا تعین کیا۔

عرشی کے تحقیقی مقالوں میں ان کی وسعت علمی، وسیع النظری اور پاکیزہ بیانی کی چھاپ واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ان کی اس عظمت کو تمام محققوں نے قبول کیا ہے اوران کی گراں قدر خدمات کو سراہا ہے۔ بقول نذیراحمد وہ ''بعض اعتبار سے ہندوستان کے اکثر محققین سے ممتاز ہیں۔'' (۱۳) اورانھیں یہ امتیاز عربی ،فارسی اوراردو پر زبردست عبور کے ساتھ ساتھ پشتو اور انگریزی سے بخوبی واقفیت کی بنا پر حاصل ہے۔ان کے تحقیقی کارناموں میں جو وسعت نظر آتی ہے وہ ان کے انھیں کمالات کی رہینِ منت ہے۔اگر ہندوستان میں ادبی تحقیق کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو بہت کم حضرات نظر آئیں گے جوان علمی اوصاف کے امین ہوں۔اسی کے ساتھ ساتھ جو چیز عرشی جیسے محققوں کو تحقیق کی حرمت اوراس کے معیار کا محافظ بناتی ہے، وہ علمی و تحقیقی صلاحیتوں کے ساتھ اس فن سے ان کا عشق اور شہرت طلبی و زرونقد سے ان کی بے نیازی ہے۔یہی چیز ایسے حضرات کو رشید حسن خان کے لفظوں میں:

> ''دردر کی خاک چھاننے اور آستانوں پر سجدہ کرنے سے باز رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے اور یہ لوگ قناعت پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔تحقیق کو وہ علمی فریضہ سمجھتے ہیں،اس کو دولت وشہرت حاصل کرنے کا وسیلہ نہیں سمجھتے۔'' (۱۴)

خود عرشی صاحب کی زندگی اس حقیقت کی گواہ ہے کہ اگرچہ انھوں نے کسب معاش کے لیے مختلف ذرائع کو آزمایا مگر دولت وشہرت کی پرواہ نہیں کی۔انھیں زندگی میں تین بار بڑے عہدوں کی پیش کش ہوئی اور انھوں نے تینوں بار انکار کیا۔پہلی مرتبہ انھیں ثقافت اسلامی کی طرف سے ایران، افغانستان اور عرب ممالک کی سفارت کی ثقافتی خدمات کی پیش کش ہوئی اور انھوں نے انکار کر دیا۔ ۱۹۴۸ء میں کشمیر میوزیم کے ڈائریکٹرشپ کے لیے شیخ عبداللہ نے دعوت دیا اور عرشی صاحب نے انکار کر دیا۔اسی سال چیپ مین کی طرف سے انڈیا آفس کا کیٹلاگ مرتب کرنے کی پیش کش بھی انھوں نے ٹھکرا دی۔ان کا میلان طبع انھیں تحقیق کی طرف کھینچ لایا اور انھوں نے اپنی پوری زندگی اسی کام کے لیے وقف کر دی۔خوش قسمتی سے رضا لائبریری رام پور کے علمی خزانے کی ذمہ داری ان پر آئی اور اسے انھوں نے اپنے لیے سعادت سمجھا۔ کتابوں بالخصوص مخطوطات کی تلاش وشناخت، ترتیب وتدوین اور تعارف ان کی زندگی کا مشغلہ بن گیا۔عرشی

نے بعض مروجہ روایات سے انحراف کرتے ہوئے مضبوط دلیلیں پیش کیں اور نئے معانی و مطالب اور نکات بیان کیے۔ جس کی تصدیق ان کے مقالات کے مطالعے سے بخوبی ہو جاتی ہے۔

مولانا عرشی کے تحقیقی مقالات کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں تحقیق کی نئی راہیں کھلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اول وہ کسی تحقیقی و علمی بحث کے دوران تمام ممکنہ دلائل و براہین جمع کرتے ہیں اور اپنی دلیل کو حتی الامکان پختہ اور نتیجہ خیز بناتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان کی تحقیقی کاوشوں کا امتیاز یہ بھی ہے کہ جہاں کہیں بھی شک و شبہ کی گنجائش رہ جاتی ہے تو وہ خود بھی مزید تحقیق کی دعوت دیتے ہیں تاکہ حقائق کی بازیافت کا عمل جاری رہے۔ وہ اپنی بات کو ہی حرف آخر قرار دینے کے حق میں نہیں رہتے۔ یہ ایک مخلص اور سچے محقق کی بنیادی خوبی ہے۔ چنانچہ سید احمد علی خاں یکتا کی کتاب ''دستور الفصاحت'' کی تاریخ تصنیف کے بارے میں مدلل اور عالمانہ بحث کے باوجود رقم طراز ہیں کہ:

> ''میں نے کوشش کی ہے کہ حتی الامکان اس مسئلے سے سیر حاصل بحث کروں۔ چونکہ خود مجھے بھی غلط فہمی ہونے کا امکان ہے، اس لیے چاہتا ہوں کہ ملک کے ارباب تحقیق اس حصے پر گہری نظر ڈال کر اپنی رائے کا اظہار فرمائیں اور آئندہ کام کرنے والوں کو مزید دقت اٹھانا نہ پڑے۔''(۱۵)

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کی تحقیقات میں تساہلی یا کسی قسم کا ڈھیلا پن ہے۔ وہ چھوٹے سے چھوٹے نکتہ کو بھی بڑی خوبی سے اٹھاتے ہیں اور اس کی مدد سے بعض اہم مطالب و معانی کے حل کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ اپنی تحقیقی و تنقیدی تحریروں میں وہ کسی نکتہ سے اختلاف کرتے وقت جارحانہ انداز اختیار نہیں کرتے۔ اس سے قطع نظر تحقیق کے غالب اصولوں کو برتتے وقت وہ عموماً بے اعتدالی کے شکار نہیں ہوتے۔ جیسا کہ ان کے معاصرین میں خاص طور سے قاضی عبدالودود کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ جو معیار کو اعلیٰ رکھنے کے لیے یا بالکل کسی غلطی یا سہو سے پاک رکھنے کے لیے اپنی متشددانہ روش کی وجہ سے بہت سارے تحقیقی کارناموں کو شائع نہیں کر سکے۔ لیکن اس کے برعکس عرشی اپنے معتدل رویہ کے سبب متعدد اہم کتابوں اور نسخوں کی ترتیب اور بلا تاخیر اشاعت میں کامیاب رہے۔ جن میں غالب سے متعلق دواوین اور دیگر کتب

وآثار کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا جاسکتا ہے۔ اس کے باوجود ان کی بعض اہم تحقیقات ہنوز منتظر اشاعت ہیں، جن میں سب سے اہم حضرت عمر فاروق کے خطوط ہیں، جن پر ترتیب وتحقیق کا کام انھوں نے اوائل عمر ہی سے شروع کر دیا تھا اور پوری زندگی اس موضوع پر کام کرتے رہے۔

عرشی غالباً ہندوستان کے ان اولین محققین میں ہیں جنھوں نے جدید تحقیقی اصولوں کی پیروی کی اور انھیں خطوط پر اپنی تحقیق کی بلند وبالا عمارت کھڑی کی۔ انھوں نے اپنے منابع اور مآخذ کا حوالہ پوری راست گفتاری کے ساتھ دیا۔ وہ اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرتے وقت تمام قدیم وجدید حوالوں سے اسے محکم بناتے ہیں۔ جدید حوالوں کی روشنی میں ممکن ہے، ان کی بعض آرا سے اتفاق نہ کیا جاسکے لیکن ان کی دلیلوں کو پوری طرح سے خارج بھی نہیں کیا سکتا۔

مولانا عرشی کی تحقیقات کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے ان کی تحریروں میں اندازِ بیان کی وضاحت، صفائی، صراحت، استدلال اور سادگی کے ساتھ ساتھ سلاست اور شیرینی بھی نظر آتی ہے۔ عام طور سے تحقیقی موضوعات اور مباحث خشک ہوتے ہیں لیکن عرشی صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے خاص اندازِ بیان سے اس میں پھیکا پن نہیں آنے دیتے۔ ساتھ ہی ان کی تحریر کسی تلخی کا شکار نہیں ہوتی۔ عموماً وہ کسی کی تنقید نہیں کرتے اور اگر ایسا مرحلہ ناگزیر ہوجائے تو بڑی صفائی اور سادگی سے بیان کر دیتے ہیں، جس سے کسی کو ان کی بات گراں نہیں گزرتی اور ان کی تنقیدی تحریریں بھی ہر طرح کی بدمزگی سے محفوظ رہ جاتی ہیں۔

مالک رام:

مالک رام کا شمار اردو کے معتبر محققین میں ہوتا ہے۔ تحقیق کے اصولوں پر عبور اور اس کے تاریخی ارتقا پر گہری نظر ان کی تحقیق کو معتبر اور بصیرت افروز بنا دیتی ہے۔ اسی سلسلے میں ان کے دو مضمون خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۔ عصری تحقیق کے کچھ اصول۔ ۲۔ اردو میں تحقیق۔

مذکورہ پہلے مضمون میں مالک رام صاحب نے اس تحقیق سے بحث کی ہے جس کا تعلق تصنیف وتالیف سے ہے۔ اس مضمون کو انھوں نے دو عمومی عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے۔ قدیم متون کی ترتیب وتدوین اور اساتذۂ قدیم کی سوانح حیات کی تحقیق وتکمیل۔

’اردو میں تحقیق‘ اس مضمون میں انھوں نے اردو ادب میں تحقیق کے آغاز وارتقا سے بحث کی ہے۔ چند صفحات میں تحقیق کی پوری تاریخ کو سمیٹ لینا انھیں کا کام ہے۔ تحقیق کے آغاز وارتقا سے بحث کرتے ہوئے ہم انھیں محققوں کے ناموں کو دہراتے رہتے ہیں جو عام طور پر مشہور ہیں مگر ان اصحاب کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن کے کارنامے تو وقیع ہیں مگر کسی وجہ سے انھیں شہرت نصیب نہیں ہوسکی ہے۔ اس ذیل میں انھوں نے پروفیسر محمد شفیع اور ان کے کارناموں کو پہلی مرتبہ اردو دنیا سے روشناس کرایا ہے۔ مذکورہ مضمون کے آخر میں انھوں نے ان موضوعات سے بحث کی ہے جو کسی تحقیقی کام کے بنیادی میدان کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ مذکورہ دونوں مضامین کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ یہی ان کا تحقیقی میدان بھی ہے یعنی سوانحی تحقیق جو تصنیف کے زمرے میں آتی ہے۔ اس میدان میں ان کا اختصاص غالب تک محدود ہے۔ البتہ تذکرۂ معاصرین، تذکرۂ ماہ وسال اور وہ صورتیں الٰہی اس اختصاص سے مستثنیٰ ہیں۔ مذکورہ تینوں کتابوں میں شخصیات سے متعلق بنیادی معلومات پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ترتیب وتدوین میں ابوالکلام آزاد کی تحریریں ان کی مرکز نگاہ ہیں۔ اس کے علاوہ کربل کتھا کی تدوین میں مختار الدین احمد کے شریک کار رہے ہیں۔

مالک رام کی پیدایش ۲۲/دسمبر ۱۹۰۶ء پھالیہ ضلع گجرات (پاکستان) میں ہوئی۔ ان کے والد لالہ سوداگرمل تھے۔ خاندانی اعتبار سے اروڑہ کھتری ہیں۔ ابھی ان کی عمر چار برس کی تھی کہ والدہ سے ضد کر کے سکھوں کے مقامی گرودوارہ میں پڑھنے کے لیے جانے لگے۔ سال بھر بعد اپریل ۱۹۱۲ء میں مقامی ڈسٹرکٹ بورڈ مڈل اسکول میں داخلہ لیا۔ یہیں سے ۱۹۲۰ء کے شروع میں یونیورسٹی سے مڈل کی سند لی۔ ۱۹۲۴ء میں پنجاب یونیورسٹی کی دسویں کی سند لی۔ گجرات گورنمنٹ انٹر کالج سے ۱۹۲۶ء میں انٹر پاس کیا۔ ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج لاہور سے بی۔ اے۔ (۱۹۲۸) اور ۱۹۳۰ میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے۔ (تاریخ) کی سند حاصل کی۔

مالک رام نے جس زمانے میں تحقیق کی طرف توجہ کی، اس زمانے میں یہ سراسر گھاٹے کا سودا تھا۔ آزادی کے بعد تحقیق نے جس تیزی کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کی ہیں اس کی مثال دوسری اصناف پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ مالک رام نے آزادی سے بہت پہلے ہی اس وادیٔ پرخار میں قدم رکھ دیا تھا۔ اس

زمانے میں تحقیق کے سلسلے کی بہت سی معمولی سہولتیں بھی مہیا نہیں تھیں اور مواد کی نشان دہی بھی کارِ دشوار ہی تھا۔ مالک رام کے لیے تحقیق ان کا فرض منصبی تھی نہ بیکاری کا مشغلہ۔ انھیں اہم منصبی کاموں سے وقت نکال کر چراغ نیم شب روشن کرنا اور بہت سا مواد زرِ کثیر خرچ کر کے اور بڑی جد و جہد کے بعد حاصل کرنا پڑتا۔ ان کی راہ میں دشواریاں نسبتاً زیادہ تھیں، صرف شوقِ بے پایاں ان کا راہ بر اور معاون تھا۔

اس میں شک نہیں کہ مالک رام نے بہت کچھ لکھا ہے اور مختلف موضوعات پر لکھا ہے۔ ضخامت، تنوع اور وسعت ہر اعتبار سے ان کا کام توجہ کے قابل ہے۔ لیکن ان تمام موضوعات میں اولیت اور فضیلت غالبیات کو حاصل ہے۔ اس سلسلے کی ان کی پہلی کتاب ذکر غالب ہے جو ۱۹۳۸ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس کے پانچ ایڈیشن ان کی زندگی ہی میں شائع ہوئے اور ہر ایڈیشن میں پہلے کے مقابلے میں زیادہ مواد منظر عام پر آیا۔ ظاہر ہے اس میں دوسری تصانیف سے استفادہ بھی ہے اور ان کی ذاتی تحقیقات بھی۔ انھوں نے سارے معلوم مواد کو سلیقے سے یکجا کر دیا ہے۔ بعض جگہ حوالہ جات کی کمی کھٹکتی ہے۔ تاہم یہ کتاب حیات غالب کا مکمل طور پر احاطہ کر لیتی ہے۔ طبع دوم پر تبصرہ کرتے ہوئے قاضی عبدالودود نے بعض امور کی طرف توجہ دلائی تھی۔ بعد کے ایڈیشن میں ان کو پیش نظر رکھ کر رفک واضافہ ہوا ہے۔ اس سے ان کے کھلے تحقیقی مزاج کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ غالب پر متعدد کتابوں کے بعد ایک ایسی کتاب کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا جس میں غالب کے حوالے سے تمام ضروری مواد اور معلومات مل جائیں۔ یہ کام مالک رام نے ذکر غالب کے ذریعہ سے انجام دے کر ایک کمی کو پورا کر دیا ہے۔

غالبیات کے سلسلہ میں مالک رام کا دوسرا کارنامہ تلامذۂ غالب ہے۔ اس میں غالب کے ۱۸۱ شاگردوں کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ حواشی میں چالیس سوانحی معلومات ان اصحاب کے بارے میں یکجا کر دیے گئے ہیں جن کا ذکر ضمناً آ گیا ہے۔ تلامذۂ غالب جب پہلی بار چھپی تو اس کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا۔ یہ سلسلہ بعد تک چلتا رہا اور حنیف نقوی پر آ کر ختم ہوا۔ اس کے بارے میں مالک رام ہی کی زبان سے ان کا ردعمل سنیے:

> ''ان پچیس برسوں میں ''تلامذۂ غالب'' سے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کتاب سے متعلق بھی اور بعض شاگردوں سے متعلق انفرادی

طور پر بھی۔ ان میں سب سے مفید اور مفصل مضمون ڈاکٹر حنیف نقوی کا تھا۔ میں نے کم و بیش سب مضامین سے استفادہ کیا ہے اور میں ان اصحاب کا احسان مند ہوں۔ اگرچہ افسوس ہے کہ ان کے سب مشورے قبول نہ کر سکا۔۔۔ پہلے ایڈیشن کے دو ایک نام حذف کرنا پڑے کیوں کہ مزید غور کرنے پر ان کے تلمذ کے لیے کافی ثقہ شہادت موجود نہیں۔"(۱۶)

تدوین سے متعلق بھی ان کے کارناموں پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اس سلسلے کی اہم کڑی مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیفات کی تدوین جدید ہے۔ ان متون میں تذکرہ، غبار خاطر اور خطبات آزاد خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے مولانا کی شخصیت، علمی مقام اور خدمات کے بعض پہلوؤں پر بلند پایہ مقالات بھی لکھے ہیں۔ اس تناظر میں وہ مولانا آزاد کے ایک بڑے محقق کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔

جناب مالک رام نے غبار خاطر کی زبان اور اسلوب تحریر کا جائزہ نہایت دقت نظر سے لیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ متن کی خصوصیات پر بھی گہری نظر ڈالی ہے، لیکن ان کا کمال فن اس کی تدوین و تہذیب میں نمایاں ہوا ہے۔ انھوں نے اس کے متن کی صحت کا جو اہتمام کیا ہے اور حواشی کی تحقیق و تالیف میں جس ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال اردو تحقیق کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔

غبار خطر اگرچہ مولانا آزاد کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ لیکن اس میں اردو فارسی کے اشعار جس کثرت سے استعمال ہوئے ہیں اور طرز تحریر کی آرائش میں اشعار اور اشعار کے مفہوم سے جس طرح کام لیا گیا ہے اس کی مثال اردو ادب کی تاریخ میں اس سے پہلے نظر نہیں آتی۔ جناب مالک رام نے آیاتِ قرآنی اور احادیث نبوی کی تخریج میں بڑی مشقت اٹھائی ہے۔ لیکن ان کی اصلی آزمایش ان نادر الوجود سیکڑوں اشعار کے حوالوں کی تلاش میں تھی جو مولانا نے ان خطوط میں استعمال کیے تھے۔ مالک رام اس آزمایش سے سرخرو گزرے ہیں۔ غبار خاطر میں تقریباً سات سو اشعار استعمال ہوئے ہیں اور بیش تر جگہوں پر شاعر کا حوالہ نہیں دیا گیا تھا۔ مالک رام نے ساہتیہ اکیڈمی کے لیے جب اس کا پہلا ایڈیشن پریس کے حوالے کیا تو صرف

۱۸۰/۷۰ اشعار رہ گئے تھے جن کے شاعروں کا سراغ نہیں لگ سکا تھا۔ لیکن ۱۹۸۳ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو یہ تعداد گھٹ کر برائے نام رہ گئی۔

غبارِ خاطر مولانا آزاد کی بہترین علمی اور فنی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ لیکن اس کا افادہ وفیضان کا دائرہ مکمل نہ تھا۔ اس دائرے کی تکمیل مالک رام کے حواشی سے ہوتی ہے۔ نادرالوجود اشعار کی طرح جو مولانا نے اس میں استعمال کیے ہیں، سیکڑوں اشخاص وکتب تھیں جن کے وجود پر کوئی روشنی نہ پڑتی تھی اور بے شمار منقولات تھے جن کی صحت مشکوک تھی۔ مالک رام کی تحقیق نے ہمیں ان کے وجود وکمال سے آشنا کیا ہے۔ اب یہ حواشی غبارِ خاطر کے متن کا ناگزیر حصہ ہیں اور اسی لیے ان کا مرتبہ یہ ایڈیشن غبار خاطر کا مکمل ترین ایڈیشن کہلانے کا مستحق ہے۔

غبارِ خاطر کی تدوین کے سلسلے میں جو اعتراضات مالک رام پر وارد ہوتے ہیں وہ ہیں غبارِ خاطر کے مرتب اول محمد اجمل خان مرحوم کے مقدمہ کا اس ایڈیشن سے اخراج اور دو خطوط کا حاشیہ میں شامل کر دینا۔ اس سلسلے میں علی جواد زیدی مالک رام کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس میں شک نہیں کہ اشاعت اول میں محمد اجمل خان کا تعارفی مضمون موجود ہے، اس کو باقی رکھنے کا جواز بھی ہے اور اگر یہ شائع کر دیا جاتا تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ لیکن محمد اجمل خان کے مضمون کی اشاعت کے بعد جو کچھ جدید مواد دستیاب ہو گیا تھا، جس کی بنا پر بعض مندرجات مزید تفصیل کے خواہاں ہوتے۔ اس سے گریز کرنا محشی کے لیے ناگزیر ہوتا۔ شاید مالک رام نے اس صورت کو گوارا نہ کیا ہو۔ اس فیصلے سے اختلاف رائے کی گنجائش ہے مگر مدون کا نقطۂ نظر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ آخر انھیں مالک رام نے تذکرہ میں اسی نوعیت کی ایک تحریر فضل الدین احمد کے نام سے شائع کی تھی۔ محمد اجمل خان کا نام تو پھر بھی جانا پہچانا تھا اور اسے شائع کرنے میں نہ ترفع کی خواہش کو دخیل کرنا مناسب ہوگا اور نہ کسی اور معنی خیزی کو۔ بہر حال ان سے پہلے بھی ایسے دیباچوں اور

مقدمات کے حذف کرنے کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ذاتی طور سے میں اس کا قائل ہوں کہ اس تعارفی تحریر کا شامل کر لینا ہی مناسب ہوتا۔ لیکن اس سلسلے میں ایک اور بات بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ مالک رام کا مرتب کردہ نسخہ ''غبار خاطر'' محمد اجمل خان مرحوم کی زندگی میں شائع ہوا تھا اور انھوں نے اس میں سے اپنے مقدمے کے حذف کیے جانے پر اعتراض یا احتجاج نہیں کیا۔(۱۷)

مالک رام کے تحقیقی سفر کی اگلی منزل مولانا آزاد کی تصنیف کردہ تذکرہ ہے۔ اگرچہ یہ کتاب مولانا آزاد کی خاندانی روایات کا بظاہر تذکرہ ہے مگر اس کتاب میں جس قدر عربی و فارسی ادبیات کے نمونے، اسلامی علوم وفنون سے متعلق معلومات اور تاریخ اسلام کے مختلف ادوار اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ در آئے ہیں اس کے لیے ضروری تھا کہ اس کا مرتب بھی مذکورہ علوم وفنون سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب نقد ونظر بھی ہو۔ اردو ادب کی خوش قسمتی کہیے کہ اس کام کے لیے بھی مالک رام کا نام ہی منتخب ہوا۔

مالک رام تذکرہ کے متن کی صحت کے اہتمام سے لے کر حواشی کی تحقیق وتالیف تک جن مشکل مراحل سے گزرے ہیں، اس کے لیے بڑی جفاکشی کی ضرورت پڑتی ہے۔ انھیں ایک ایک حوالے کی تلاش اور ایک ایک شخصیت کے حالات کی جستجو میں ہفت خواں طے کرنے پڑے ہیں۔ تب کہیں جا کر کمال تحقیق اور حسن و جامعیت کا یہ شاہ کار وجود میں آیا ہے۔ تدوین کے موجودہ معیار وانداز کے مطابق کتاب کے آخر میں اعلام، بلاد واماکن، کتب ورسائل، آیاتِ قرآنی واحادیث نبوی کی فہرستیں بھی شامل کی گئی ہیں اور ایک طویل فہرست ان عربی، فارسی اور اردو کتب ورسائل کی ہے جن سے حواشی کی تیاری میں مدد لی گئی ہے۔ غبارِ خاطر کی ترتیب وتدوین جدید کی طرح یہ کام بھی مالک رام کو تحقیق وتدوین کے میدان میں اعتبار عطا کرتا ہے۔

مالک رام نے اس ایڈیشن پر ایک جامع پیش لفظ تحریر کیا ہے، جس میں تذکرہ کی تصنیف کی تاریخ، اس کے اسلوب نگارش کی دل آویزیوں، اس کے ادبی خصائص، علمی حیثیت، اس ایڈیشن کی تیاری کے اہتمام اور اس کی املائی خصوصیات پر بحث کی ہے اور مرزا افضل الدین احمد کے مقدمہ سے پیدا ہونے والی علامہ اقبال کے بارے میں اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کی مثنویاں اسرار خودی اور رموزِ بے خودی در

اصل الہلال کی بازگشت ہیں۔

متنی تحقیق کے ذیل میں مالک رام کا ایک تحقیقی کارنامہ 'دیوان غالب' (صدی ایڈیشن) کی تدوین بھی ہے۔انھوں نے اس کی تہذیب وترتیب میں سائنٹفک اندازِ تحقیق سے کام لیا ہے۔ابتدا میں غالب کی مشہور تصویروں اوران کی خودنوشتہ غزل کے عکس دیے ہیں، جن سے غالب کے خدوخال اوران کے اندازِ تحریر سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔اس کے بعد دیوان کا مقدمہ ہے جسے دیوان کی روح کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔اس میں انھوں نے غالب کی تحریروں کی مدد سے یہ ثابت کیا ہے کہ ان کی شعرگوئی کی ابتدا کب ہوئی، آغاز میں کن شعرا کا اثر قبول کیا اوران کی روش میں تبدیلی کب ہوئی۔اس کے بعد غالب کے مطبوعہ دیوان کی تاریخی خصوصیات سے بحث کر کے یہ دکھایا ہے کہ مطبع نظامی کانپور کا مطبوعہ دیوان سب سے معتبر ہے، جس میں نسخۂ حمیدیہ کا انتخاب بھی شامل ہے۔اس حصے کی قدروقیمت اس کے حواشی کی وجہ سے ہے جن میں مختلف ایڈیشنوں کے فرق کی نشان دہی کی گئی ہے۔

مذکورہ تحقیقی کتابوں کے علاوہ ان کے مضامین مختلف رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں جنھیں اگر ترتیب دیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ان کی تحقیقی خدمات کو اردو ادب میں ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

نورالحسن ہاشمی (۲۱/اگست ۱۹۱۱):

پروفیسر نورالحسن ہاشمی اردو محققین کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے اردو تحقیق کو روایتی تحقیق و تدوین کے دائرے سے نکال کر سائنٹفک فکر اور جدید علمی بصیرت سے آشنا کیا۔اردو میں ایک زمانے تک تحقیق وتنقید کو الگ الگ خانوں میں رکھا جاتا تھا اور تحقیق کو 'کوہ کندن وکاہ برآوردن' کے مصداق سمجھا جاتا تھا۔یا بعض لوگوں کی نگاہ میں یہ 'کارِگورکنی' سے زیادہ نہیں تھا۔دوسری طرف یہ سوال زیرِ بحث تھا کہ تحقیق کے لیے تنقید ضروری ہے یا نہیں۔قاضی عبدالودود جیسے محقق بھی تحقیق کے لیے تنقید کو غیر ضروری خیال کرتے تھے، لیکن صحیح یہ ہے کہ تحقیق بغیر اعلیٰ تنقید اور تنقید بغیر اعلیٰ تحقیق ممکن نہیں ہے اور جن چند محققین نے اپنی تحریروں کے ذریعہ اس بنیادی سوال کا جواب دیا ان میں نورالحسن ہاشمی کا نام نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

پروفیسر نورالحسن ہاشمی نے اردو تحقیق وتنقید میں بعض بنیادی کام کیے ہیں ان کا مقالہ 'دلی کا دبستان شاعری' اپنے موضوع پر تنہا مقالہ ہے۔اس لیے آج بھی اردو ادب کی تاریخ وتنقید میں اس کی وہی اہمیت ہے جو آج سے ستر برس پہلے تھی۔ ادب کا طالب علم ہو یا باذوق قاری، اس عہد کو (جس میں دہلوی دبستان کی تشکیل ہورہی تھی) سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری خیال کرتا ہے۔ حالانکہ دبستان کا تصور ہی بعض ناقدین (علی جواد زیدی وغیرہ) کی نگاہ میں درست نہیں ہے، لیکن یہ کتاب صرف ادبی دبستان کے تصور پر نہیں ہے بلکہ دلی میں شاعری کے فروغ، دہلی کی زبان اور اظہار اور اس امتیازی خصوصیات کی شناخت پر ہے جسے صرف دہلی ہی نہیں اس پورے علاقے کی ادبی ولسانی شناخت قرار دیا جاسکتا ہے۔ پروفیسر نورالحسن ہاشمی نے اس کی شناخت کے اسباب کو ثابت کیا اور لکھا کہ: ''دہلویت نام ہے ایک نقطۂ نظر کا، ایک افتادِ ذہنی کا، ایک مزاجِ شعری کا۔'' (۱۸)

انھوں نے پہلی بار لکھنؤ اور دہلی کے لسانی اور خاص طور پر مزاجی فرق کو واضح کیا اور اس طرح دبستان دہلی کی شناخت کا تعین کرنے کی کوشش کی۔ اس لیے آج بھی دہلی اور لکھنؤ کے سلسلے میں بعض تہذیبی اور لسانی رویوں کے بارے میں اس کتاب سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ دہلی کی خصوصیات اور فکر کا ذکر کرتے ہوئے نورالحسن ہاشمی صاحب نے بعض اہم باتیں ادب کی تہذیبی اقدار کے بارے میں لکھی ہیں۔ آج کی تنقید انھیں اقدار کے مطالعہ پر زور دیتی ہے جن کا ذکر انھوں نے 'دلی کا دبستان شاعری' میں ان الفاظ میں کیا تھا:

> ''ہر تہذیب وتمدن ایک فلسفۂ زندگی رکھتا ہے جو اسے ذہنی غذا پہنچاتا ہے، اسی فلسفۂ زندگی سے اس کی قدریں بنتی ہیں۔ کبھی خالص مذہبی، کبھی متصوفانہ، کبھی رندانہ رجحانات قوموں کی زندگی میں سرایت کرتے رہتے ہیں اور شاعری کا تعلق چونکہ زندگی سے ہے اس لیے یہ تفکرات شاعری میں بھی تراوش کرجاتے ہیں۔'' (۱۹)

دبستان دلی اچانک وجود میں نہیں آگیا تھا بلکہ صدیوں کے فکری وتہذیبی عمل سے اس کا وجود ہوا اور اس کو غذا اس تہذیب وثقافت اور لسانی رویے سے ملی تھی جو پشتوں سے چلی آرہی تھی۔ ہمارے ادب میں دہلی ولکھنؤ کے ادبی دبستانوں کا ذکر کچھ اس طرح سے کیا جاتا ہے کہ بادی النظر میں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ

دبستانی تفریق محض مطالعے کی سہولت کے لیے کر دی گئی ہو۔لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ یہ فکر کے طویل اور تہذیبی و ثقافتی قدروں کے عمل اور ردعمل کے طور پر وجود میں آیا ہے۔دہلی کی ادبی خصوصیات کس طرح پرورش پائیں، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے نورالحسن ہاشمی نے لکھا ہے کہ:

''دہلوی شاعری فقر وفاقہ میں پروان چڑھی۔اہلِ حال وقال، درویش اور فقیر منشوں کی صحبت میں پلی۔تصوف دہلی کے تمدن کا خاص طریقۂ فکر ونظر رہا ہے اور اس میں کیا ہندو کیا مسلمان سب ہی شریک تھے۔ وحدتِ وجود، ہمہ اوست، ہمہ از وست، فنا فی اللہ، تزکیۂ نفس، تجرید وغیرہ وغیرہ تمام موضوعات تصوف دہلی کو ایران کی تمدنی وادبی تقلید میں حاصل ہوئے تھے۔یہاں کی سیاسی ابتری اور بدحالی نے اس میراث کو اور بھی تقویت دی۔''(۲۰)

فکر کی نمو اور شعری رویوں کی تشکیل میں تہذیب وثقافت کی کیا اہمیت ہے اس کا اندازہ ہاشمی صاحب کی تحریروں سے لگایا جاسکتا ہے۔انھوں نے کسی بھی عہد کے شعر وادب کے مطالعہ میں اس ثقافت اور اس کی وراثت کو پیش نظر رکھا ہے۔ان کا کہنا ہے:

''پرانی دہلی کی ادبیت، اس کی شعریت، شاعرانہ لطافتیں اور ادبی نزاکتیں، اس کی رنگینی اور صناعی پرانی دہلی ہی کی تہذیب سے وابستہ تھی۔''(۲۱)

ہاشمی صاحب ہمیشہ اپنے تحقیقی کاموں میں مصروف رہے۔میؔر کے بارے میں ایک واقعہ مشہور ہے کہ کسی نے ان سے کہا کہ آپ اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر دیکھیے سامنے کتنا خوبصورت باغ ہے تو میر نے جواب دیا مجھے اپنے دل کے داغوں کی بہار دیکھنے سے کب فرصت ہے کہ میں ان گل بوٹوں کو دیکھوں۔اس واقعہ میں کتنی صحت ہے یہ ایک الگ موضوع ہے۔لیکن ہاشمی صاحب کے بارے میں اتنی بات ذمہ داری کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے تحقیقی وتنقیدی کاموں میں اس طرح مصروف رہے کہ بیرونی دنیا سے کبھی کوئی تعلق نہیں رکھا۔وہ بڑی خاموشی سے اپنا کام کرتے اور ان کے کام کے بارے میں اس وقت معلوم ہوتا جب

کتاب چھپ کر سامنے آجاتی۔

دلی کا دبستانِ شاعری کے علاوہ ان کی تحقیقی تصانیف میں 'کلیات ولی' کی تدوین نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ انھوں نے کلیات کی ترتیب و تدوین میں تحقیق کے اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے حد درجہ تلاش و تفحص سے کام لیا اور آغاز کلیات میں ایک طویل مقدمہ تحریر کیا، جس میں نسخوں کی کیفیت سے لے کر طریقۂ کار وغیرہ کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ انھوں نے متن کے صفحات اور سطریں گن کر یا لفظ کے املا یا اختلاف نسخ کی نشان دہی ہی نہیں کی بلکہ تحقیق میں خردہ گیری کے عمل سے اجتناب کرتے ہوئے اس عہد کے سماجی و ثقافتی حالات کی روشنی میں کلام ولی کی اہمیت اور قدر و قیمت کا تعین کیا۔ آج یہ کام شاید اتنا مشکل نہیں، اس لیے کہ ان موضوعات پر تحقیق و تدوین کا کام بہت حد تک مکمل ہو چکا ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے اس کی بنیاد پر فیصلے کرنا آسان ہو گیا ہے۔ لیکن جس وقت ہاشمی صاحب نے یہ کام کیا اس وقت نہ یہ سہولتیں تھیں اور نہ پیش رووں نے اس طرح کام کر رکھا تھا۔ جس وقت ہاشمی صاحب نے کلیات ولی کی تدوین کا کام شروع کیا اس وقت تک ولی کے بارے میں بہت سی باتیں طے نہیں ہو پائی تھیں۔ ہاشمی صاحب کی تحقیق سے بعض اہم باتوں کو طے کرنے میں مدد ملی اور ولی کے وطن، ان کی دہلی آمد، ان کے انتقال اور ان کے کلام کے بارے میں بعض حقائق سامنے آئے۔ ولی کا کلام سے الحاقی کلام کو علاحدہ کرنا بھی آسان کام نہیں تھا۔ اس لیے کہ ہر شخص ولی کی نقل میں اس طرح کے شعر کہہ رہا تھا۔ زبان کے ساتھ اگر اظہار بیان بھی ایک جیسا ہو تو شناخت کا مسئلہ اور زیادہ دشوار ہو جاتا ہے، لیکن ہاشمی صاحب نے بڑی محنت سے ایسے کلام کی نشان دہی کی جو ولی کے شاگردوں کا تھا اور کلیات ولی میں شامل ہو گیا تھا اور کلیات کے ہر ایڈیشن میں اس طرح کی ترمیم و اضافے کرتے رہتے تھے۔

ہاشمی صاحب کے تحقیقی کارناموں میں مذکورہ دونوں کتابوں کے علاوہ نوطرزِ مرصع، ایک نادر روزنامچہ، کلیات حسرت، مثنوی طوطی نامہ، مثنوی سراپا سوز وغیرہ بہت اہم ہیں۔ ان قدیم متون کی تدوین میں بھی انھوں نے صرف متن کو پیش کر دینے کا کام نہیں کیا بلکہ ان کے تحقیقی ایڈیشن تیار کرنے کے ساتھ ان کتابوں کی ادبی قدر و قیمت کو متعین کرنے کی کوشش کی اور اردو ادب کی تاریخ اور نثر و نظم کے ارتقا میں ان تصنیفات کی

اہمیت پر روشنی بھی ڈالی۔ دیوانِ مبتلا کی تدوین کے وقت ان کے سامنے یہ دشواری تھی کہ مبتلا تخلص کے کئی شاعر ہوئے ہیں۔اردو تذکرہ نگاروں نے قدیم شعرا کے بارے میں کوئی تفصیل تو لکھی نہیں ہے جس کی روشنی میں ایک مبتلا کو دوسرے مبتلا سے علاحدہ کیا جا سکے۔اس کے علاوہ جب ایک تخلص کے دو شعرا کا عہد بھی ایک ہی ہو تو مشکل اور دو چند ہو جاتی ہے۔ ہاشمی صاحب نے اس نازک موڑ پر کلام کی اندرونی شہادتوں کی بنیاد پر دونوں کی شناخت قائم کرنے کی کوشش کی۔

حواشی:

۱۔ پروفیسر نذیر احمد (مرتب)،سید مسعود حسن رضوی ادیب، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی،۱۹۹۳،ص ۲۹

۲۔ پروفیسر نذیر احمد (مرتب)،سید مسعود حسن رضوی ادیب، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی،۱۹۹۳،ص ۳۶

۳۔رسالہ آج کل (اردو نمبر،اگست ۱۹۶۸) نئی دہلی، ۱۹۶۸،ص ۱۶

۴۔ پروفیسر نذیر احمد،سید مسعود حسن رضوی ادیب،ص ۶۴

۵۔ پروفیسر نذیر احمد (مرتب)، قاضی عبدالودود تحقیقی وتنقیدی جائزے، غالب انسٹی ٹیوٹ،۱۹۹۱،ص ۱۷

۶۔ پروفیسر نذیر احمد (مرتب)، قاضی عبدالودود تحقیقی وتنقیدی جائزے، غالب انسٹی ٹیوٹ،۱۹۹۱،ص ۶

۷۔ پروفیسر نذیر احمد (مرتب)، قاضی عبدالودود تحقیقی وتنقیدی جائزے، غالب انسٹی ٹیوٹ،۱۹۹۱،ص ۲۳۲

۸۔ پروفیسر نذیر احمد (مرتب)، قاضی عبدالودود تحقیقی وتنقیدی جائزے، غالب انسٹی ٹیوٹ،۱۹۹۱،ص ۱۲۸

۹۔ پروفیسر نذیر احمد (مرتب)، قاضی عبدالودود تحقیقی وتنقیدی جائزے، غالب انسٹی ٹیوٹ،۱۹۹۱،ص ۱۱۲

۱۰۔ پروفیسر نذیر احمد (مرتب)، قاضی عبدالودود تحقیقی وتنقیدی جائزے، غالب انسٹی ٹیوٹ،۱۹۹۱،ص ۱۱۹

۱۱۔ گیان چند جین، تحقیق کا فن، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۸،ص ۵۷۶

۱۲۔ پروفیسر نذیر احمد (مرتب)، قاضی عبدالودود تحقیقی وتنقیدی جائزے،ص ۱۰۴

۱۳۔ پروفیسر نذیر احمد، مولانا امتیاز علی عرشی: ادبی و تحقیقی کارنامے، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی۔۱۹۹۱،ص ۵

۱۴۔رشید حسن خان، ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ،۱۹۹۰،ص ۴۷

۱۵۔امتیاز علی عرشی، دستور الفصاحت، ہندوستانی پریس رامپور،۱۹۴۳،ص ۵

۱۶۔علی جواد زیدی، مالک رام: ایک مطالعہ، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۸۶،ص ۱۲

۱۷۔علی جواد زیدی، مالک رام: ایک مطالعہ، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۸۶،ص ۱۶

۱۸۔نور الحسن ہاشمی، دلی کا دبستان شاعری، اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ، ۲۰۰۹،ص ۳۶۷

۱۹۔نور الحسن ہاشمی، دلی کا دبستان شاعری، اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ، ۲۰۰۹،ص ۴۱۴

۲۰۔نورالحسن ہاشمی، دلی کا دبستان شاعری، اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، ۲۰۰۹، ص۴۱۵۔۴۱۴
۲۱۔نورالحسن ہاشمی، دلی کا دبستان شاعری، اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، ۲۰۰۹، ص۴۸۴

باب سوم

اردو تحقیق کا معاصر منظر نامہ

اردو تحقیق کا معاصر منظر نامہ

پروفیسر مختار الدین احمد ۱۹۱۸ء تا ۳۰/جون ۲۰۱۰ء

پروفیسر مختار الدین احمد عربی اور اردو زبان و ادب کے ایک مایۂ ناز محقق اور دانشور ہیں۔ حالانکہ ان کا تعلق شعبۂ عربی علی گڑھ سے تھا لیکن اردو زبان و ادب سے آپ کو جو لگاؤ تھا، اس کی وجہ سے انھیں ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام اردو دنیا میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ غالب پر ان کی گراں قدر تحریروں کی بنیاد پر بجا طور پر ایک صاحب نظر غالب شناس کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ کربل کتھا کی تحقیق ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو انھیں اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

وہ اگست ستمبر ۱۹۱۸ء کو سہسرام میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ پیدائش و مقام پیدائش کو لے کر اردو دنیا میں غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ مالک رام نے بھی ان کی تاریخ پیدائش ۱۴/نومبر ۱۸۲۴ء اور مقام پیدائش پٹنہ لکھا ہے۔ پروفیسر حنیف نقوی اس غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ان کی وفات پر مختلف اخبارات و رسائل میں جو تعزیتی نوٹ شائع ہوئے ہیں، ان میں اور اس سے پہلے بھی کئی تحریروں میں ان کی تاریخ ولادت بالاتفاق ۱۴/نومبر ۱۹۲۴ء لکھی گئی ہے۔ اس حساب سے انتقال کے وقت ان کی عمر کل چھیاسی سال ہوئی۔ لیکن یہ روایت صریحاً غلط ہے۔ مزید برآں غلطی صرف تاریخ ولادت اور اس کی رو سے عمر کے بیان ہی میں نہیں پائی جاتی، نام اور مقام ولاست کے تعین میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ سارا فساد دراصل ہائی اسکول سرٹیفکیٹ کا پیدا کردہ ہے۔۔۔ واقعہ یہ ہے کہ پیدائش کے بعد ہفتے عشرے کے اندر ہی ان کے دو نام رکھے گئے تھے ایک 'غلام معین الدین' اور دوسرا 'مختار الدین'۔ یہ دونوں نام تاریخی ہیں جن سے ۱۳۳۶ھ برآمد ہوتا

ہے۔ پہلا نام مرحوم کے والد کا تجویز کردہ تھا، دوسرا نام مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے تجویز فرمایا تھا۔اس دوسرے نام سے متعلق حوالہ 'تذکرۂ علمائے اہلِ سنت' (مرتبہ مولانا محمود احمد قادری) میں موجود ہے۔ اس تذکرے سے یہ اہم اطلاعات بھی ملتی ہیں کہ مرحوم کی ولادت سہسرام میں اور ماہ ذیقعدہ ۱۳۳۶ھ میں ہوئی تھی۔ذیقعدہ ازروئے تقویم اگست، ستمبر ۱۹۱۸ء کے مطابق ہے۔جائے پیدائش سہسرام کے بجائے پٹنہ قرار دینے کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ مختار الدین احمد صاحب کے والد محترم ظفرالدین قادری ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۱ء کے درمیان حضرت شاہ سید ملیح الدین سجادہ نشین خانقاہ کبیریہ، سہسرام کے مدرسے میں مدرس اول کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے تھے لیکن ۱۹۲۱ء میں وہاں سے ترک ملازمت کر کے مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ چلے آئے تھے۔اس لیے سال ولادت بدل کر ۱۹۱۸ء کی بجائے ۱۹۲۴ء کر دینے کی صورت میں سہسرام کو جائے ولادت قرار دینے کا کوئی منطقی جواز باقی نہیں رہا تھا۔''(۱)

ان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں ہوئی۔عربی مدارس کی تعلیم سے فراغت کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ یہاں سے اعلیٰ اسناد حاصل کرنے کے بعد شرق اوسط اور یورپ گئے اور آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی۔اس سے ان کی اصلاحیتوں میں چار چاند لگ گئے۔انھوں نے مشرقی علما کے سامنے برسوں زانوئے تلمذ تہ کیا۔ان کی ابتدائی عمر کا بیشتر حصہ اپنے والد محترم ظفرالدین قادری کی زیر تربیت گزرا۔ان کے والد اپنے وقت کے جید عالم اوار صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔پھر علی گڈھ سے انھیں فیضان ملا جہاں علامہ عبدالعزیز المیمنی جیسا متبحر عالم ان کا استاد اور ان کی ڈاکٹریٹ (پی۔ایچ۔ڈی۔) کا نگراں مقرر ہوا۔پھر یورپ کے مستشرقین کی صحبت نے ان کی صلاحیت میں بڑا نکھار پیدا کیا۔

مختار الدین احمد کی ادبی و تحقیقی زندگی کا آغاز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طالب علمی کے زمانے میں علی

گڑھ میگزین کے 'غالب نمبر' کی اشاعت سے ہوا۔ جو ۴۹۔۱۹۴۸ء کے تعلیمی سال کے دوران شائع ہوا تھا۔ اس نمبر میں اس دور کے تمام معروف غالب شناسوں کے مضامین شامل تھے۔ چونکہ اس خاص نمبر کا معیار طالب علمانہ نہیں بلکہ عالمانہ اور محققانہ تھا، اس لیے اسے علمی حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے 'احوال غالب' اور 'نقد غالب' کے ناموں سے غالب سے متعلق نہایت بلند پایہ مضامین کے دو مجموعے مرتب کر کے شائع کیے۔ مذکورہ مضامین کے مجموعوں کی اشاعت کے بعد غالب شناس کی حیثیت سے ان کی حیثیت مستحکم ہو گئی۔

اردو ادب کی تاریخ میں ان کا اہم ترین کارنامہ جو انھیں ہمیشہ زندہ رکھے گا، کربل کتھا کی بازیافت اور اس کی تدوین و اشاعت ہے۔ انھوں نے اس کتاب کے نایاب قلمی نسخے کو ڈھونڈ نکالنے میں جس غیر معمولی ذوق و شوق اور تگ و دو کا مظاہرہ کیا وہ مثالی حیثیت کا حامل ہے اور ان لوگوں کے لیے جو تحقیق کی صبر طلبی اور حوصلہ آزمائی سے ہمت ہار جاتے ہیں، ہمیشہ مہمیز کا کام دیتا رہے گا۔

علمی نقطۂ نظر سے 'کربل کتھا' کے بعد ان کا دوسرا اہم کارنامہ 'تذکرۂ آزردہ' کی دریافت ہے۔ شیفتہ کی 'گلشن بے خار' اور لالہ سری رام کے 'خمخانۂ جاوید' کے علاوہ اس تذکرے کا حوالہ کسی اور جگہ نہیں ملتا۔ مختارالدین احمد نے اپنے قیام انگلستان کے زمانے میں کورپس کرسٹی کالج کیمبرج کی لائبریری میں اس تذکرے کا بھی ایک ناقص الآخر نسخہ ڈھونڈ نکالا اور ہندوستان آنے کے بعد اسے ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کر کے اس سے استفادے کی راہ ہموار کر دی۔ حیدر بخش حیدری کے تذکرے 'گلشن ہند' کی بھی کم و بیش یہی کیفیت ہے۔ ان کی شائع کی ہوئی بعض اور کتابیں بھی اہم ہیں لیکن علمی درجہ بندی کے لحاظ سے انھیں وہ مقام حاصل نہیں جو کربل کتھا کو اور اس کے بعد تذکرۂ آزردہ گلشن ہند اور علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر کو حاصل ہے۔

مختارالدین احمد کی دو کتابوں 'احوالِ غالب' اور ط 'نقد غالب' میں غالب کے بارے میں جو مواد فراہم کیا گیا ہے اس سے غالب کی زندگی اور آثار پر نہ صرف نئی روشنی پڑتی ہے بلکہ غالب پر مزید تحقیقی کام کرنے کے امکانات بھی روشن ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے زبان و بیان کی سادگی اور صراحت سے جن علمی مسائل اور

تحقیقی امور سے بحث کی ہے اس کی وجہ سے آپ کی تصانیف کو قبول عام نصیب ہوا۔ انھوں نے غالب کی شخصیت، ان کے معاصرین اور ان کے تلامذہ پر بڑی تعداد میں اور اہم مضامین لکھے اور ان کی متعدد نادر تحریروں اور غیر مطبوعہ مکتوبات کا انکشاف کیا اور انھیں ادبی دنیا کے سامنے پیش کیا۔ تمام مضامین کی تفصیل بیان کرنا میرا مقصد نہیں ہے البتہ چند ایک مضامین کا ذکر کر دینا چاہتا ہوں جو غالبیات کے نقطۂ نظر سے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد ہمیشہ غالب کی زندگی اور فن کے بارے میں نئے مواد کی تلاش میں رہتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا ایک مضمون 'غالب کا ایک غیر مطبوعہ فارسی مکتوب' بہت اہم ہے۔ انھیں ایک فارسی مخطوطہ 'برہان اودھ' میں دو فارسی خطوط ملے تھے۔ ایک خط ابن حسن خان کا غالب کے نام اور دوسرا غالب کا خط جو سید ابن حسن کے خط کے جواب میں ہے۔ ابن حسن نے اپنے خط میں درخواست کی ہے کہ وہ انھیں اپنا شاگرد بنالیں۔ غالب نے اس خط کے جواب میں یہ درخواست قبول کرتے ہوئے انھیں اپنا شاگرد بنالیا۔ غالب کے سوانح پر کام کرنے والے محققین نے غالب کے دہلی سے کلکتہ سفر پر خاصی تحقیق کی ہے اور بہت کچھ لکھا ہے، لیکن کوئی بھی محقق یہ ثابت نہیں کر سکا کہ غالب سفر کلکتہ کے دوران لکھنؤ کب پہنچے اور انھوں نے کتنے دن وہاں قیام کیا۔ مختار الدین احمد کے دریافت کیے ہوئے خط سے پہلی مرتبہ بعض حقائق پر روشنی پڑتی ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ غالب ۱۲۴۲ھ کے لگ بھگ لکھنؤ پہنچے اور پانچ مہینے تک وہ لکھنؤ میں مقیم رہے۔ اس خط کے ذریعہ پہلی مرتبہ غالب کے ایک نئے شاگرد ابن حسن کا پتہ چلتا ہے۔

مختار الدین احمد ایک مخطوطہ شناس، مرتب متن اور غالب کے محقق کے طور پر اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے مذکورہ کارناموں سے اردو ادب کے ذخیرے میں قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے۔ بالخصوص کربل کتھا کی تحقیق نے پوری ادبی تاریخ کو متاثر کیا ہے۔ یہ علمی کارنامے ادب میں ان کی بقائے دوام کے ضامن ہیں۔

رشید حسن خان دسمبر ۱۹۲۵ء تا ۲۶ر فرور ۲۰۰۶ء:

رشید حسن خان اردو تحقیق و تدوین کی دنیا کا ایک معتبر نام ہے۔ ان کی ولادت ۱۰ر جنوری ۱۹۳۰ء (تعلیمی اسناد کے مطابق) کو شاہجہاں پور، یوپی میں ہوئی۔ (رشید حسن کے اپنے بیان کے مطابق دسمبر ۱۹۲۵ء

ہے تاریخ یاد نہیں) ان کے والد امیر حسن خان کٹر انگریز مخالف تھے اور جدید مغربی تعلیم کو برا سمجھتے تھے، اس لیے جب رشید حسن خان اسکول جانے کی عمر کو پہنچے تو ان کا داخلہ مقامی عربی مدرسہ بحرالعلوم میں کرا دیا گیا۔ جہاں ۱۹۳۹ء تک وہ زیر تعلیم رہے مگر درس نظامی کی تکمیل نہ کر سکے۔ گھر کی معاشی حالت مستحکم نہ ہونے کے سبب ۱۹۳۹ء کے اواخر میں انھوں نے شاہجہاں پور کی آرڈننس فیکٹری میں ایک معمولی ملازم کی حیثیت سے بھرتی ہوگئے۔ چند سال بعد فیکٹری میں ہڑتال ہوئی تو یہ بھی اس میں شریک تھے۔ اس جرم کی پاداش میں انھیں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ بعد ازاں مدرسہ فیض عام شاہجہاں پور اور اسلامیہ ہائر سکینڈری اسکول شاہجہاں پور میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۵۹ء میں شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ اسسٹنٹ کے عہدے پر ان کا تقرر ہوا اور یہیں سے ۳۱ر دسمبر ۱۹۸۹ء کو سبک دوش ہوئے۔

ان کی ادبی زندگی کا آغاز مضمون نگاری سے ہوا مگر انھوں نے بہت جلد اپنے سمت سفر کا تعین کر لیا اور باقاعدہ تحقیق کی طرف مائل ہوگئے۔ اردو املا اور زبان وقواعد سے انھیں خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ مذکورہ دونوں موضوعات پر ان کی دو مستقل کتابیں ادبی دنیا میں نہایت شہرت کی حامل ہیں۔ اس کے علاوہ 'اردو کیسے لکھیں'، 'انشا اور تلفظ' ان موضوعات پر ان کی دوسری کتابیں ہیں۔

رشید حسن خان کا خاص موضوع ادبی تحقیق ہے۔ نیز انھیں ادبی تحقیق کے مسائل کا ادراک بھی ہے۔ اپنی کتاب 'ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ' میں انھوں نے اپنے تحقیقی مطالعے کے فکری نتائج اور اس سے استنباط کردہ اصول ونظریات کو پیش کیا ہے۔ اس کتاب کے مشمولات میں وہ مضامین شامل ہیں، جنھوں نے اردو تحقیق کی دنیا کو چونکایا ہے اور بار بار اس بات کا احساس دلایا ہے کہ تحقیق کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔

رشید حسن خان نے اس موضوع پر بار بار اپنی تحریروں میں اس بات پر زور دیا ہے کہ تحقیق تنقید سے الگ ہے۔ یہ بات وہ غیر مبہم اور شگاف لہجے میں شاید اس لیے کہنا چاہتے ہوں کہ آج کل دانش گاہوں میں ریسرچ کے نام پر ہر طرح کی ادبی کارگزاریوں کو تحقیق کے دائرے میں شامل کر لیا گیا ہے اور جس نوعیت کا کام اس عنوان سے کیا جا رہا ہے وہ تحقیق اور تنقید دونوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اس سے خلط مبحث کے لیے بڑی گنجائشیں پیدا ہوگئی ہیں۔ انھوں نے تحقیق کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ادبی تحقیق میں کسی امر کا وجود بطور واقعہ اس صورت میں متعین ہوگا جب اصول تحقیق کے مطابق اس کے متعلق معلومات حاصل ہوں۔ واقعے کا چھوٹا بڑا ہونا، اہم یا غیر اہم ہونا، ادبی تحقیق میں کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ صفاتی الفاظ اس صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں اس واقعے سے کام لیا جا رہا ہے۔ تحقیق ایک مسلسل عمل ہے۔ نئے واقعات کا علم ہوتا رہے گا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کون سی حقیقت کتنے پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اکثر صورتوں میں ہوتا یہ ہے کہ حجابات بتدریج اٹھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق میں اصلیت کا تعین اس وقت تک کی حاصل شدہ معلومات پر مبنی ہوتا ہے۔ اس سے آئندہ کے امکانات کی نفی نہیں ہوتی۔ لیکن محض آئندہ امکانات پر ان باتوں کو بطور واقعہ نہیں مانا جاسکتا جو اس وقت تک محض قیاس آرائی کا کرشمہ ہوں۔''(۲)

اس یک گونہ تفصیلی اظہار رائے کے ساتھ آخر جملے تک آتے آتے یہ بحث ایک نئے موضوع فکر و نظر سے جا ملتی ہے اور وہ یہ کہ تحقیق کو صرف واضح شہادت اور استخراجی نتائج تک محدود سمجھنا چاہیے۔ استقرائی سطح پر اخذ نتائج اور استنباط اس سے الگ دید و دریافت کا عمل ہے۔ جس کے دائرے میں تنقیدی فکر و فہم اور تعبیرات کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ رشید حسن خان نے اس پہلو سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

''تعبیرات کو واقعات نہیں کہا جاسکتا اور تحقیق کا مقصد حقائق کی دریافت ہے۔ اس لیے ایسے موضوعات جن میں تنقیدی بصیرت کا عمل دخل ہو، تحقیق کے دائرے میں نہیں آتے۔ تنقیدی صداقت تنقیدی تعبیرات کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی مسئلے پر دو مختلف افراد دو مختلف رائیں رکھ سکتے ہیں۔ جب کہ تحقیق میں اس طرح کے اختلاف کی گنجائش نہیں۔''(۳)

اصولیات تحقیق کے سلسلے میں رشید حسن خان کا ایک اہم کارنامہ (جسے ان کی اولیات میں شمار کرنا

چاہیے) تذکروں اور بیاضوں پر ان کی تحقیقی گفتگو ہے۔جس میں انھوں نے ان مآخذ کی استنادی حیثیت پر شک کا اظہار کیا ہے اور اس مسئلے کو پہلی بار اہلِ علم اور ارباب تحقیق کے سامنے رکھا ہے۔اپنے مقالہ تحقیق سے متعلق بعض مسائل میں انھوں نے اس طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے:

''بیش تر مطبوعہ تذکروں کے متن پر پوری طرح اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اکثر مطبوعہ تبصرے اس قدر غلط چھپے ہیں یا ان میں ایسی غلطیاں راہ پا گئی ہیں کہ ان کا ازسرِ نو مرتب کیا جانا ضروری ہے۔ ان میں وہ تذکرے بھی شامل ہیں جن کو ایک زمانے میں انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا اور وہ بھی جو اس زمانے میں بعض حضرات کے مقدموں کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ایسی صورت میں احتیاط کا تقاضا یہ ہوگا کہ امکان کی حد تک تذکروں کے اہم خطی نسخوں سے بھی استفادہ کیا جائے۔بعض مطبوعہ تذکروں کے جو خطی نسخے اب ملے ہیں، ان میں ایسے اضافے ہیں جن سے مطبوعہ تذکرے خالی ہیں۔''(۴)

اردو میں تحقیقی روایت نمایاں حیثیت سے دو اہم مکاتب فکر میں منقسم نظر آتی ہے۔ایک وہ روایت ہے، جس کے تحقیقی کارناموں کی امتیازی شکل میں امتیاز علی عرشی اور ڈاکٹر گیان چند جین جیسے محققین کے ممتاز کارناموں میں ملتی ہے۔ یہ حضرات کسی دوسرے کے کام پر اعتراض یا احتساب نہیں کرتے۔ان کا مطمح نظر اپنے ذاتی کاموں میں خوب سے خوب تر کی تلاش ہے۔ دوسری روایت جو اس مقابلے میں آئی ہے وہ تحقیقی تنقید کی صورت ہے جس میں علمی کاموں کے تحقیقی جائزے اور احتساب کو ضروری خیال کیا جاتا ہے، تاکہ غلطیوں کو فروغ پانے کا موقع نہ ملے اور تحقیقی کام کرنے والے اپنی علمی ذمہ داریوں کو فراموش نہ کریں۔ پروفیسر شیرانی اور قاضی عبدالودود جیسے اکابرین اسی دوسری روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔ رشید حسن خاں کا تعلق بھی اسی روایت سے ہے۔ وہ بھی علمی احتساب کو تحقیق کا ناگزیر تقاضا خیال کرتے ہیں۔اس کی سب سے بہترین مثالیں ان تحقیقی تبصروں میں سامنے آتی ہیں جو 'علی گڑھ تاریخ ادب اردو'، 'دیوان غالب مرتبہ مالک رام'، 'اردو شاعری کا انتخاب مرتبہ محی الدین قادری زور اور 'تاریخ ادب اردو' مولفہ جمیل جالبی پر کیے گئے

ہیں۔ان تبصروں نے پڑھنے والوں کو متوجہ کیا اور لکھنے والوں کو متنبہ کیا ہے اور تحقیقی نگارشات میں احتیاط کے معنی کی طرف لوگوں کی نظر گئی ہے۔

رشید حسن خان کی تحقیقی زندگی کا سب سے روشن پہلو کلاسیکی متن کی تدوین ہے۔ مکتبہ جامعہ نے معیاری سیریز کے تحت ان سے باغ و بہار، سحرالبیان، گلزارِ نسیم انتخاب ناسخ، موازنۂ انیس و دبیر، حیات سعدی، انتخاب مضامین شبلی، دیوان درد اور مقدمہ شعروشاعری کے معیاری متن تیار کروائے۔اس سیریز میں انتخاب ناسخ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں تقریباً سوا سو صفحات کا مقدمہ ہے۔اس مقدمے کے کئی پہلو قابلِ ذکر ہیں جن میں اہم ترین یہ ہے کہ رشید حسن خان نے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے کہ ناسخ نے اصلاح زبان کے ضابطے بنائے تھے۔انھوں نے کئی اقتباسات سے ثابت کیا کہ یہ ضابطے ناسخ کے بعد ان کے شاگردوں نے بنائے تھے۔مقدمے کا اتنا ہی اہم حصہ ناسخ کے رنگ سخن کا تعین ہے۔مگر اس طرح کی کتابیں تیار کرنے کے اپنے حدود و قیود ہوتے ہیں۔ اس لیے رشید حسن خان کا رنگ تحقیق ان کتابوں میں ابھر کر سامنے نہیں آ سکا ہے۔انھوں نے فسانۂ عجائب، باغ و بہار، سحرالبیان اور گلزار نسیم وغیرہ کے جو تنقیدی ایڈیشن تیار کیے ہیں وہ اردو تحقیق و تدوین کی دنیا میں منارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔

فسانۂ عجائب جیسی مشکل کتاب کا تنقیدی ایڈیشن تیار کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ یہ رشید حسن خاں ہی کا حوصلہ تھا جو وہ اس دشوار گزار مرحلے سے سرخ رو گزرے ہیں۔اول تو اس کی مشکل زبان اس پر مزید یہ کہ مختلف ایڈیشنوں میں مصنف کی ترمیم و اضافے۔رشید حسن خان سے پہلے بھی کئی محققوں نے اس کتاب کی ترتیب کی مگر جب ان کی مرتبہ کتاب منظر عام پر آئی تو معلوم ہوا کہ اس کی تدوین کیسے کی جانی چاہیے تھی۔ چند صفحات میں اس کے محاسن کا احاطہ مشکل ہے۔ نیر مسعود نے لکھا ہے:

> ''یہ خبر خاصی دلچسپی کے ساتھ سنی گئی تھی کہ رشید حسن خان خود ایک کلاسیکی متن اور وہ بھی 'فسانۂ عجائب' سا خطرناک متن مرتب کر رہے ہیں۔ یہ تجسس ہونا فطری تھا کہ رشید حسن خان متن کی تحقیقی تدوین کے جس معیار کا مطالبہ دوسروں سے کرتے ہیں اسے خود کہاں تک رکھ پاتے ہیں۔اس ایڈیشن کی اشاعت کے بعد یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی

ہے کہ انھوں نے اپنی تنقیدی اور احتسابی تحریروں میں تدوینِ متن کے جس مثالی نمونے کا تصور پیش کیا تھا، عملاً اس سے بھی کچھ بہتر نمونہ پیش کر دیا ہے۔" (۵)

رشید حسن خان نے اعراب اور رموز اوقاف کے التزام سے اس کی قرأت کو آسان بنا دیا ہے۔ اس متن پر جو مقدمے، ضمیمے اور فرہنگ انھوں نے دیئے ہیں (جن کا مجموعی حجم فسانۂ عجائب کے متن سے زیادہ ہے۔) اس کے لیے کتنی محنت کی گئی ہے اس کا اندازہ آسان نہیں۔ اس کتاب پر رشید حسن خان نے سات ضمیمے اور ایک فرہنگ کا اضافہ کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک ضمیمہ بذات خود ایک کتاب کا درجہ رکھتا ہے۔

خاں صاحب نے فسانۂ عجائب کے بعد 'باغ و بہار' کو منتخب کیا اور اسی احتیاط و اعتماد اور بالغ نظری کا ثبوت دیا۔ انھوں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ گل کرسٹ نے میر امن سے چار درویش کی تالیف کی فرمائش ان کے فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہونے سے پہلے کر دی تھی اور میر امن نے اصلاً اس کا کام شروع بھی کر دیا تھا۔ اس کتاب میں ایک مبسوط مقدمہ ہے پھر 'باغ و بہار' کا متن اور پھر تین ضمیمے اور سب سے آخر میں فرہنگ شامل ہے۔

مقدمہ ۱۳۶ رصفحات کو محیط ہے۔ اس میں میر امن کی محتاط سوانح بھی شامل ہے۔ رشید حسن خان نے حیات میر امن کی ان کڑیوں کو اپنے بیان کے دائرے سے باہر رکھا ہے جو غیر مستند ہیں۔ باغ و بہار کا متن پوری احتیاط سے تیار کیا گیا ہے۔ پہلے ضمیمے میں تشریحات، اختلاف نسخ، انتساب اشعار، افراد، مقامات اور عمارتوں پر روشنی دالی گئی ہے۔ یہ کام ظاہر ہے آسان نہیں اور اس کا پوری طرح حق رشید حسن خان ہی ادا کر سکتے تھے۔ دوسرے ضمیمے میں تلفظ اور املا کی بحث کو رکھا گیا ہے۔ یہ بھی رشید حسن خان کا خاص میدان ہے اس لیے یہ بحث اتنی جامع ہے کہ اس پر اضافہ بظاہر مشکل نظر آتا ہے۔ تیسرا ضمیمہ بعنوان الفاظ اور طریق استعمال ہے۔ اس طرح باغ و بہار کا یہ ایڈیشن نہ صرف اس متن بلکہ پوری اردو نثر کے مطالعے میں انتہائی اہم اضافہ ہے۔

'باغ و بہار' کے بعد ان کی اگلی منزل 'گلزارِ نسیم' قرار پاتی ہے۔ نثری متون کی ترتیب میں فسانۂ عجائب اور شعری متون کی ترتیب میں گلزارِ نسیم کو ان کے کارناموں کی معراج کہا جانا چاہیے۔ اس مختصر سی مثنوی پر

انھوں نے ڈیڑھ سو صفحات کا مقدمہ لکھ کر مثنوی کی ادبی و نصابی اہمیت، قصے سے وابستہ روایات اور اس کی چھان پھٹک، اس کے تمثیلی پیرایۂ اظہار کا جائزہ اور پھر نسیم کی ادبی خدمات کا احاطہ کیا ہے۔ نیز گلزارِ نسیم کی مختلف اشاعتوں کی کیفیات کو بھی بالتفصیل بیان کیا ہے۔ قصے کی اصل تلاش کرنے میں انھوں نے افسوس کی مذہب عشق اور اصل فارسی متن سے بھی بحث کی ہے اور مذہب عشق کا تقابل ریحان کی مثنوی باغِ بہار سے بھی کیا ہے۔ معرکۂ چکبست و شرر کا پورے پس منظر میں نہایت غیر جانبدارانہ جائزہ بھی لیا ہے۔ اس غیر جانبدارانہ رویے کی داد مشہور غالب شناس کالی داس گپتا رضا نے بھی دی ہے۔ مقدمے کے بعد اصل متن پھر دو ضمیمے تشریحات اور تلفظ و املا کے تحت دے کر فرہنگ درج کی گئی ہے۔ سب سے آخر میں اس قصے کی اصل عزت اللہ بنگالی کے فارسی متن کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اس طرح سات سو چوبیس صفحات پر مشتمل اس ایڈیشن میں اصل متن پچاسی صفحات کو محیط ہے، بقیہ چھے سو انتالیس صفحات تحقیقی مباحث اور متعلقات کا احاطہ کرتے ہیں۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس ایڈیشن کا معیار کس پائے کا ہوگا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے بالکل درست لکھا ہے کہ:

> ''اس ایڈیشن کے ضمیمہ و تشریحات میں رشید حسن خان نے (ص ۲۳۷ تا ۵۲۰) جس شرح و بسط کے ساتھ زبان اور بیان کے نکات پر بحث کی ہے، اس سے لغات، لفظیات اور صناعت کے بہت سے باریک پہلو ابھرتے ہیں۔ موجودہ دور کہ جب تعلیم کے اعلیٰ مراکز خاص طور پر یونیورسٹیوں میں لسانی، فنی اور ذوقی تربیت کا رجحان معدوم ہوتا جارہا ہے، رشید حسن خان کی یہ دیدہ ریزی اردو کے طلبہ (اور ان سے زیادہ اساتذہ) کے لیے ایک مدرسۃ الاصلاح کی حیثیت رکھتی ہے۔ یوں بھی بنیادی متن پر اعراب کی نشان زدگی، تلفظ و املا کی تفصیلات اور فرہنگ پر مبنی ضمیمے (ص ۵۲۱ تا ۶۰۰۰) کی شمولیت نے اس ایڈیشن کو ایک مکمل، قائم بالذات اور نہایت کارآمد نسخے کی حیثیت دے دی ہے۔'' (۶)

گلزارِنسیم کی تدوین واشاعت کے بعد رشید حسن خان نے مثنویات شوق کی تدوین کا بیڑا اٹھایا اور اسے اپنی سابقہ روایات کے مطابق نہایت دیدہ ریزی کے ساتھ تیار کر کے شائع کیا۔ اس میں شوق کی تینوں مثنویوں کو شامل کرلیا گیا ہے۔ تینوں مثنویوں کا متن صرف ۱۰۴ صفحات کو محیط ہے جب کہ مقدمہ ۱۶۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ چار ضمیمے ہیں جن میں پہلا ضمیمہ 'تشریحات' ہے جو خان صاحب کی دیدہ ریزی کو ظاہر کرتا ہے۔ دوسرا ضمیمہ بعنوان تلفظ اور املا ہے۔ تیسرا ضمیمہ اختلاف نسخ اور چوتھا 'الفاظ اور طریقۂ استعمال' ہے اور آخر میں فرہنگ۔

مذکورہ متون کے علاوہ رشید حسن خان نے مثنوی سحر البیان اور زٹل نامہ کے تنقیدی ایڈیشن بھی اسی طرز پر شائع کیے ہیں جو رشید حسن خان کا خاصہ ہے۔ اس کے علاوہ ۲۰۰۳ء میں ان کی تالیف کردہ کلاسیکی ادب کی فرہنگ بھی شائع ہوئی۔ کلاسیکی ادب کی فرہنگ جلد اول کی شکل میں ان تمام فرہنگوں کو ضروری اضافوں کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے جو ان کی مرتبہ کتابوں کے آخر میں شامل تھیں۔ انھوں نے کلام غالب کی فرہنگ بھی تیار کرنا شروع کیا تھا، جس کا نام انھوں نے 'گنجینۂ معنی کا طلسم' رکھا تھا۔ اس کے تقریباً آٹھ سو صفحات وہ کمپوز کروا چکے تھے کہ ان کا انتقال (۲۶ رفروری ۲۰۰۶ء) کو ہو گیا۔

مشہور محقق پروفیسر گیان چند جین نے ان کی مرتبہ دو کتابیں 'فسانۂ عجائب' اور 'باغ و بہار' پر تبصرہ کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے رشید حسن خان کی محققانہ اور تدوینی بصیرت پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ یہاں پر ان کے تبصرے سے ایک اقتباس پر قناعت کی جاتی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''حضرت امیر حمزہ نے 'طلسم ہوش ربا' فتح کیا تھا۔ تدوین کے ہفت خواں میں رشید حسن خان کی تسخیر اس سے کم نہیں۔ اگر تدوین کوئی ملت ہوتی تو یہ کتابیں اس کے دو مقدس صحیفے قرار پاتے اور ان کا مدون ان کا نبی، لیکن میں انھیں پیغمبرِ تدوین کہنے پر قانع نہیں، انھیں خدائے تدوین کہوں گا۔(۷)

تنویر احمد علوی ۱۶؍جنوری ۱۹۳۳ء تا ۲۰؍فروری ۲۰۱۳ء

تنویر احمد علوی کا تعلق کیرانہ، ضلع مظفر نگر، مغربی اتر پردیش سے تھا۔ کیرانہ ایک معروف اور مردم خیز خطہ رہا ہے۔ انھوں نے عربی و فارسی کی تعلیم دیو بند کے ایک مدرسے سے حاصل کی۔ اس کے بعد پٹیالہ طبیہ کالج سے فن طب میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں علم و ادب کا شوق پیدا ہوا۔ اسی ادبی شوق نے انھیں ہندی، انگریزی اور دوسرے مضامین کے مطالعے کی طرف راغب کیا۔ زمانۂ طالب علمی میں ’الجمیعۃ‘ دہلی کے کالموں میں کئی اہم مضامین لکھے۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ کا رخ کیا اور دو سال کی قلیل مدت میں ’ذوق‘ پر اپنا تحقیقی مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے لیے مکمل کیا۔ بعد ازاں یہیں سے ڈی لٹ کی سند بھی حاصل کی۔ یہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی پہلی ڈی لٹ کی ڈگری تھی جو تنویر احمد علوی کو تفویض ہوئی۔

تنویر احمد علوی بنیادی طور پر محقق تھے۔ ان کی بیش تر تصانیف تحقیق و تراجم سے متعلق ہیں۔ ان کی مطبوعہ کتابیں اور مقالات و مضامین کی فہرست طویل ہے۔ چند اہم کتابوں میں ’اردو میں اصول تحقیق و ترتیب متن، کلیات ذوق، ذوق سوانح اور انتقاد، انتخاب دواوین، رسالہ تذکرات کی ترتیب، اردو میں بارہ ماسہ کی روایت مطالعہ و متن اور ’آزادی ے بعد دہلی میں اردو تحقیق‘ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مؤخر الذکر کتاب دہلی اردو اکیڈمی کے ایک منصوبے کے تحت انھوں نے مرتب کیا۔ اس میں اصولِ تحقیق اور تحقیقی مضامین شامل ہیں۔ حرف آغاز کے بعد تنویر احمد علوی کا ’دہلی میں اردو تحقیق کا ایک منظر نامہ‘ کے نام سے ایک جامع مضمون شامل کتاب ہے۔ انھوں نے اس مقالے میں ’دہلی کالج، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے علاوہ شعبۂ فارسی و عربی سے وابستہ اہلِ قلم کی خدمات پر گفتگو کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ’’دہلی میں یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں کے ساتھ فارسی اور عربی شعبوں سے وابستہ اہلِ علم نے بھی اردو زبان کے تمول میں اپنی تحقیقی نگارشات سے گراں قدر اضافے کیے۔‘‘(۷)

دہلی میں اردو تحقیق کے سلسلے میں سرسید احمد خان کی آثارالصنادید اور آئین اکبری وتزک جہانگیری کی ترتیب وتدوین کا ذکر ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے ایسے اداروں کا بھی ذکر کیا ہے جہاں سے علمی و تحقیقی کارنامے شائع ہوکر منظر عام پر آئے ان میں انجمن ترقی اردو ہند، ترقی اردو بورڈ، غالب انسٹی ٹیوٹ، غالب اکیڈمی، اردو اکیڈمی دہلی اور مکتبہ جامعہ اہم ہیں۔صرف ان اداروں سے منسلک حضرات نے ہی تحقیقی کام نہیں کیے بلکہ اکیڈمیوں اور یونیورسٹیوں سے باہر رہنے والوں نے بھی ناقابل فراموش کارنامے انجام دیئے ہیں۔تنویر احمد علوی لکھتے ہیں:

> ''یونیورسٹیوں سے باہر جن لوگوں نے دہلی میں رہتے ہوئے تحقیق اور علمی کاموں سے اپنے گہرے شغف اور دلچسپی کا اظہار کیا ہے ان میں مالک رام صاحب کے علاوہ جو اردو کے نامور محقق اور ماہر غالبیات ہیں، عتیق صدیقی، مولانا امداد صابری (مرحوم)، مولانا واصف (مرحوم) اور عبداللطیف اعظمی، کمال احمد صدیقی کا نام لیا جاسکتا ہے۔
> کئی اعتبار سے اس سلسلے میں شمس الرحمٰن فاروقی کے کام اور نام کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔''(۸)

اس کتاب میں 'متن وروایت متن' کے عنوان سے علوی صاحب کا ایک مضمون ہے جو ان کی معروف کتاب اردو میں اصول تحقیق وترتیب متن' میں بھی شامل ہے۔اس کے علاوہ مالک رام، محمد حسن، رشید حسن خاں، خلیق انجم، خواجہ احمد فاروقی، واصف دہلوی، قمر رئیس، کمال احمد صدیقی، فضل الحق، عنوان چشتی، مظفر حنفی اور اسلم پرویز کے تحقیقی مضامین شامل کیے گئے ہیں۔

تنویر احمد علوی کا ایک بڑا کارنامہ کلیات ذوق کی ترتیب وتدوین ہے۔ان کے اس کام پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انھیں ڈی۔لٹ۔کی ڈگری سے سرفراز کیا۔اس کی ترتیب وتدوین کے ساتھ انھوں نے ایک نہایت جامع اور اہم مقدمہ تحریر کیا جو ترقی اردو بیورو سے ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔یہ مقدمہ انسٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔اس میں انھوں نے ذوق کی مختصر سوانح کو نہایت تحقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔نیز ذوق کے کلام پر گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے مطبوعہ دواوین کا تحقیقی جائزہ بھی لیا ہے۔

ذوق کی زندگی میں ان کے کلام کی طباعت نہیں ہوسکی۔ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے شیخ محمد اسماعیل فوق اور محمد حسین آزاد نے ذوق کے دیوان کی ترتیب کی طرف توجہ کیا مگر ۱۸۵۷ء کے غدر میں ان کی محنت ضائع ہوگئی۔اس ہنگامے میں ان کے کلام کا بہت سا حصہ تلف ہوگیا۔جو حصہ بچ رہا تھا اسے بعد میں مرتب کیا گیا۔محمد حسین خان تحسین کی تحریک پر کلام ذوق کی تدوین شروع ہوئی۔اس ضمن میں تنویر احمد علوی لکھتے ہیں:

> ''جب غدر کا ہنگامۂ ہوش ربا ختم ہوا اور دہلی والے اپنے اجڑے دیار کی طرف واپس آئے تو محمد حسین خان تحسین مہتمم مطبع مصطفائی کی تحریک پر ذوق کے کلام کی تدوین کی ذمہ داری حافظ غلام رسول ویران نے قبول کی۔۔۔ان کے ساتھ کلام ذوق کی جمع آوری وتدوین میں ظہیر دہلوی اور ان کے چھوٹے بھائی امراؤ مرزا انور نے بھی تعاون کیا۔''(۹)

غلام رسول ویران کے نسخے کے بعد اسی نسخے کی بنیاد پر کئی مطابع نے دیوان ذوق کے دوسرے ایڈیشن شائع کیے۔تنویر احمد علوی نے کلیات ذوق کے مقدمے میں ان تمام نسخوں اور ایڈیشنوں کے تحقیقی انداز میں گفتگو کی ہے۔انھوں نے کلام ذوق میں موجود الحاقی کلام کو ذوق کے کلام سے الگ بھی کیا اور ایسے بہت سے کلام تلاش کر کے موجودہ کلیات میں شامل بھی کیے جو دیوان ذوق کی اس سے پہلے کی اشاعتوں میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے۔

ذوق کی زندگی میں جو تذکرے ترتیب دیئے گئے وہ کلام ذوق کے ماخذ کی حیثیت سے نہایت اہم ہیں۔تنویر احمد علوی نے ان تمام تذکروں کا بہت گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور ان میں موجود ذوق کے کلام کو نہایت دیدہ ریزی کے ساتھ چھان پھٹک کے بعد اپنے مرتبہ کلیات میں شامل کیا ہے۔کلام ذوق میں بہت سارا کلام الحاقی تھا جو ان کے شاگردوں اور معاصرین کا تھا،جس کی شناخت کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔تنویر علوی نے نہایت محنت ومشقت کے ساتھ ایسے کلام کی نشان دہی کی اور بہت حد تک ان کے کلام کو الحاق سے پاک کرنے کی کوشش کی۔اب بھی ممکن ہے کہ کچھ کلام الحاقی رہ گئے ہوں تاہم انھوں نے کلیات ذوق کی

تدوین جس جانفشانی کے ساتھ کی ہے اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔

متن کی ترتیب میں انھوں نے مقدمے کے بعد حروف تہجی کے اعتبار سے سب سے پہلے غزلوں کو ردیف وار ترتیب دیا ہے۔ بعد ازاں غزلوں کے متفرق اشعار، ابیات، قطعات، رباعیات اور مثنوی کے اشعار کے بعد قصائد کو ترتیب وار جمع کیا ہے۔کلیات ذوق کے دوسرے حصے میں محمد حسین آزاد کی روایت کے مطابق ابیات غزل اور قصائد کو پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں حواشی حصہ اول، حواشی حصہ دوم اور مصادر بالترتیب پیش کیے گئے ہیں۔اس سلسلے میں تنویر احمد علوی لکھتے ہیں:

> ''شروع میں غزلیات کو شامل کیا گیا ہے۔اس کے بعد قصائد کو جگہ دی گئی ہے۔اصول ترتیب متن کے مطابق قدیم تر روایت کو مرجح قرار دیا گیا ہے۔حواشی میں ماخذ کی نشان دہی کردی گئی ہے۔''(۱۰)

تنویر احمد علوی کا ایک اور تحقیقی کارنامہ 'انتخاب دواوین' کی تدوین نو ہے۔ یہ چند معروف شعرا کے کلام کا انتخاب ہے جسے امام بخش صہبائی نے ترتیب دیا تھا۔ مذکورہ انتخاب میں شمس ولی اللہ، خواجہ میر دردؔ، سوداؔ، میر، جرأت، میر حسن، نصیر، ممنون، ناسخ، مول چند، ذوق اور مومن کا کلام شامل ہے۔اس انتخاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے دیباچے میں صہبائی نے مختلف اصناف سخن اور بیان و بلاغت کے اصولوں پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ یہ انتخاب نایاب ہو چکا تھا۔تنویر احمد علوی نے اس کی تدوین نو کر کے ماضی کی گم ہوتی ہوئی وراثت کو محفوظ کر دیا ہے۔ مذکورہ انتخاب کو 'اردوئے معلی سیریز' کے تحت شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے شائع کیا ۔اس کم یاب تذکرہ وانتخاب کی اپنی تاریخی اہمیت ہے۔اس کی بازیابی کے سلسلے میں تنویر علوی لکھتے ہیں:

> ''اس کے نسخے بہت کمیاب ہیں۔۱۹۷۸ء میں اپنے سفر حیدرآباد کے دوران راقم الحروف نے عاریتاً اسے کچھ وقت کے لیے جامعہ عثمانیہ کی لائبریری سے حاصل کیا اور دہلی میں اس کا زیروکس تیار کرلیا۔جس کے بعد اسے جامعہ عثمانیہ کی لائبریری کو واپس کر دیا۔اس کے حصول کے لیے میں محترمہ شاکرہ خاتون اسسٹنٹ لائبریری کا سپاس گزار ہوں جن کے خصوصی اعتماد پر یہ نسخہ دہلی لایا جاسکا اور اس کی عکسی نقل ممکن

ہوئی۔‘‘(۱۱)

ادب کی تحقیق تنویر احمد علوی کے مزاج میں رچی بسی ہوئی تھی۔ وہ ہر وقت حقائق کی تلاش میں لگے رہتے تھے۔ ان کے تحقیقی و تصنیفی کارناموں میں ’اردو میں اصول تحقیق و ترتیب متن‘ ان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ اصولِ تحقیق و ترتیب متن پر یہ ایک مفصل کتاب ہے۔ نو واردان تحقیق کے لیے یہ کتاب ایک مشعل راہ کا درجہ رکھتی ہے۔ ’نوائے ادب‘ بمبئی کے مدیر عبدارزاق قریشی کی فرمائش پر تنویر احمد علوی نے اس کتاب کے مشمولات کو بالاقساط لکھا جو تواتر کے ساتھ نوائے ادب میں شائع ہوتے رہے۔ صرف ایک باب ’تالیف متن‘ غالب نامہ میں شائع ہوا۔ اس کے مشمولات میں متن اور روایت متن، تالیف متن، تنقید متن، تحقیق متن، تاریخ متن، تاریخ کتابت متن، تاریخ طباعت، تصحیح متن، ترتیب متن، تحشیہ نگاری اور تعلیقات سے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور اس فن سے متعلق بہت سے الجھے ہوئے مسائل و مباحث کو واضح کیا گیا ہے۔ انھوں نے اس فن سے متعلق پرانی اصطلاحات کے مفہوم کو متعین بھی کیا اور نئی اصطلاحات بھی وضع کیں۔ اس کتاب کا خاص اور توجہ طلب حصہ ’تنقید متن‘ ہے۔ اس میں انھوں نے تنقید متن اور ادبی تنقید کے مابین فرق کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ تنقید متن اور ادبی تنقید میں امتیاز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’تنقید متن (Textuala Criticism) جیسا کہ اس کے اصطلاحی نام سے ظاہر ہے۔ اپنی نوعیت اور مقصد کے اعتبار سے اس تنقید سے مختلف ہے جسے ادبی تنقید (Literary Criticism) کہا جاتا ہے۔ ادبی تنقید میں ادب اور مقصد ادب سے متعلق مختلف زاویہ ہائے نگاہ کے تحت کسی شعری یا ادبی تصنیف کی فکری اور فنی قدر و قیمت کے تعین کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور اس کے خوب و ناخوب کے بارے میں فیصلہ دیا جاتا ہے۔ لیکن تنقید متن کی صورت میں کسی غیر تحقیقی نقطۂ نظر کو دخل نہیں ہوتا۔ ذاتی یا جماعتی پسند و ناپسند سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ یہاں تو متن سے متعلق خارجی و داخلی حقائق سے گفتگو کی جاتی

ہے اور کسی متن کی تحقیقی اہمیت اور ترتیب متن کے نقطۂ نظر سے اس کی
افادیت پر کوئی فیصلہ دیا جاتا ہے۔'' (۱۲)

اس کتاب کی ضرورت واہمیت کا اندازہ پروفیسر قمر رئیس کی اس تحریر سے لگایا جا سکتا ہے:

''یہ تصنیف موضوع کی تفہیم وتعبیر اور مباحث کی جامعیت کے لحاظ سے
بلاشبہ ایسی ہے جس پر اردو زبان بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ جہاں تک
میری معلومات کا تعلق ہے، اس موضوع پر نہ صرف فارسی میں بلکہ
ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں بھی ایسی مستند اور معیاری کتاب
اب تک شائع نہیں ہوئی'' (۱۳)

علوی صاحب نے اس موضوع پر لکھنے کے لیے کسی انگریزی یا غیر ملکی ادب کی کتاب کو مشعل راہ نہیں بنایا اور نہ ہی تقلیدی روش اختیار کی۔ یہ کتاب ان کے وسیع مطالعے اور آزادانہ غور وفکر کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے اس موضوع سے متعلق تمام مباحث کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس میں خلط مبحث اور انتشار کا شائبہ تک نہیں۔ یہی سبب ہے کہ آج بھی یہ کتاب بہ نظر استحسان دیکھی جاتی ہے اور علمی اور تحقیقی ذوق رکھنے والے اس سے استفادہ کرتے ہیں بلاشبہ یہ کتاب علمی اور تحقیقی کام کرنے والے نہ صرف طلبا بلکہ اساتذہ کے لیے بھی مشعل راہ کا حکم رکھتی ہے۔

خلیق انجم (۲۲/دسمبر ۱۹۳۵ء تا ۱۸/اکتوبر ۲۰۱۶ء):

بیسویں صدی کے ربع آخر میں جن حضرات نے اردو تحقیق وتنقید میں ممتاز مقام حاصل کیا ہے ان میں خلیق انجم کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ انجم صاحب کی پہلی کتاب غالب کی نادر تحریریں گزشتہ صدی کی چھٹی دہائی میں شائع ہوئی تھی اور اب تک ان کی تین درجن سے زائد تحقیقی وتنقیدی نگارشات شائع ہو چکی ہیں۔ انجم صاحب نے 'مرزا مظہر جان جاناں' پر تحقیقی مقالہ لکھ کر دلی یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ان کی اہم تحقیقی کتاب 'مرزا محمد رفیع سودا' ہے۔ یہ کتاب تحقیق وتنقدی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ آل احمد سرور

نے اس کتاب کے مقدمے میں لکھا تھا کہ ''جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تحقیق کا معیار گر رہا ہے انھیں ڈاکٹر خلیق انجم کی یہ معرکتہ الآرا کتاب دیکھنی چاہیے۔'' 'غالب اور شاہان تیموریہ' میں انجم صاحب نے غالب اور ذوق کے ادبی معرکوں کے نئے نئے گوشے تلاش کیے ہیں اور قلعۂ معلیٰ سے غالب کے تعلقات کی تفصیل بیان کی ہے۔ انجم صاحب کی ایک نہایت قابل قدر کتاب 'متنی تنقید' ہے۔ کلاسیکی متون کی ترتیب و اصول وضوابط پر اردو میں اسے پہلی کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اگر چہ اس موضوع پر اب تک کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں، لیکن انجم صاحب نے اس انتہائی خشک موضوع کو ایسے شگفتہ انداز تحریر میں پیش کیا ہے کہ آج بھی ہندوستان و پاکستان کی بیش تر یونیورسٹیوں کے ایم۔ فل۔ کے نصاب میں یہ کتاب شامل ہے۔

انجم صاحب کا ایک غیر معمولی ادبی کارنامہ خطوط غالب کا تحقیقی و تنقیدی ایڈیشن ہے جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ خطوط غالب کا یہ ایڈیشن متنی تنقید کے جدید ترین اصولوں کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اردو کے صف اول کے ادیب ظ۔ انصاری نے انجم صاحب کو دادِ تحقیق دیتے ہوئے لکھا کہ:

> ''اس کتاب کا مقدمہ ہی بجائے خود ایک علمی و تحقیقی مقالہ کا وزن رکھتا ہے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ تو خلیق انجم پہلے ہی سے ہیں۔ اس مقالے پر انھیں کوئی علمی ادارہ ڈی۔ لٹ۔ دے نکلے تو بے جا نہیں برحق ہوگا۔'' (۱۴)

اسی طرح پاکستان کے مشہور شاعر و ادیب جمیل الدین عالی نے خطوط غالب کے اس ایڈیشن کے بارے میں لکھا کہ:

> ''اب تک خطوط غالب پر اتنا بڑا کام میرے علم کی حد تک کسی اور نے نہیں کیا۔ شاید پہلی بار یہ ہوا ہے کہ کسی اردو متن کی تدوین جرمن طریقے پر کی گئی ہے۔ جرمن اس معاملے میں پورے یورپ کے لیے مثال اور امریکہ سے بہت آگے ہے۔ غالب کے خطوط کی تدوین جرمن انداز پر بالکل سائنٹفک ہے۔'' (۱۵)

مذکورہ کتابوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انجم صاحب بنیادی طور پر متنی نقاد اور محقق ہیں۔ انھوں نے فارسی سے اردو میں جن کتابوں کا ترجمہ کیا ہے ان کے حواشی بھی بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے تیار کیے ہیں۔ یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے جو بنیادی طور پر محقق ہو۔

انجم صاحب کی معرکتہ الآرا تحقیقی کتاب 'مرزا محمد رفیع سودا' ۱۹۶۶ء میں انجمن ترقی اردو علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ یہ تقریباً سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔ پوری کتاب کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں سودا کی سوانح سے متعلق مواد پیش کیا گیا ہے جب کہ دوسرا حصہ سودا کے ادبی خدمات کے بنیادی جائزے پر مشتمل ہے۔ کتاب کی ابتدا میں اصل موضوع کے پس منظر کے طور پر اٹھارویں صدی عیسوی کے سیاسی اور سماجی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے مندرجات کے اہم عنوانات پر نظر ڈالنے سے اس مقالہ کی جامعیت اور ہمہ گیری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سودا کی سوانح کے سلسلے میں سب سے اہم مسئلہ ان کے تاریخ ولادت کا ہے۔ مختلف سوانح نگاروں اور تذکرہ نویسوں نے ان کی ولادت کی مختلف تاریخیں بتائی ہیں۔ اس لیے حتمی طور پر ان کے سال ولادت کے تعین کا کام خاصا مشکل ہوگیا تھا۔ شیخ چاند اور ڈاکٹر خلیق انجم دونوں نے اس مسئلہ سے تفصیلی بحثیں کی ہے۔ دونوں نے دستیاب ماخذ سے ان کے سال ولادت کا تعین کیا ہے۔ لیکن ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں الگ الگ نتیجوں پر پہنچے ہیں۔ شیخ چاند نے محمد حسین آزاد، قائم چاند پوری اور میر حسن کی فراہم کردہ معلومات کا تجزیہ کر کے ۱۱۰۶ھ متعین کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے قائم چاند پوری کی رائے کو راجح مانا ہے۔ انجم صاحب نے ان سے اختلاف کیا ہے۔ انھوں نے آب حیات، مخزن نکات، کلیات سودا (مرتبہ آسی) گل رعنا (عبدالحیٔ) خوش معرکۂ زیبا، سودا (شیخ چاند) دلی کا دبستان شاعری، مضامین قاضی عبدالودود جیسے بنیادی اور اہم ماخذ کی ورق گردانی کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سودا ۱۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے لکھتے ہیں:

> ''نقش علی نے بقول قاضی عبدالودود مرزا کا ترجمہ ۱۱۷۴ھ کے لگ بھگ لکھا ہے۔ جس سے مرزا کا سن ولادت ۱۱۱۸ھ نکلتا ہے۔ اس کی تصدیق میر حسن کے بیان سے بھی ہوئی ہے۔ مرزا ۱۱۸۵ھ میں فرخ آباد سے فیض آباد گئے تھے۔ میر حسن نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے

کہ مرزا آج کل نواب شجاع الدولہ بہادر کی سرکار میں وسیلۂ فن شاعری سے سرفراز ہیں۔ نواب شجاع الدولہ کا انتقال آخر ذیقعدہ ۱۱۸۵ھ میں ہوا۔ ظاہر ہے کہ میر حسن نے مرزا کا ترجمہ ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان لکھا ہے۔ جب مرزا فیض آباد آئے تھے۔ میر حسن اکثر ان سے ملاقات کرتے تھے جس کا ذکر انھوں نے تذکرے میں کیا ہے۔ اس کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ مرزا کا ترجمہ لکھتے ہوئے انھوں نے مرزا سے ان کی عمر دریافت نہ کی ہو۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مرزا کا سن شریف ستر سال کو پہنچ گیا ہے۔ چوں کہ یہ عبارت ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان لکھی گئی ہے اس لیے مرزا کا سن ولادت ۱۱۱۵ھ اور ۱۱۱۸ھ کے درمیان قرار پاتا ہے۔ اگر ہم تسلیم کرلیں تو نقش علی کے بیان کی بھی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اس لیے ۱۱۱۸ھ ہی قرار دینا مناسب ہوگا۔'' (۱۶)

شیخ چاند اور خلیق انجم کی تحقیقوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا اور اسے حرف آخر تصور کرنا دشوار کام ہے۔ خود خلیق انجم صاحب نے کوئی آخری بات نہیں لکھی ہے۔ انھوں نے بہت ہی محتاط انداز اختیار کیا ہے اور صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ ۱۱۱۸ھ ہی قرار دینا مناسب ہے۔ اس سلسلہ میں حتمی طور پر اتنا تو ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس اہم مسئلہ پر انجم صاحب نے تحقیق کا حق پورا ادا کیا ہے۔

انجم صاحب نے سودا کے مختلف ناموں سے بھی بحث کی ہے۔ شیخ چاند نے اس مسئلے کو موضوع بحث نہیں بنایا۔ اردو تذکروں میں سودا کا نام مختلف طریقوں پر ملتا ہے۔ کسی نے ان کا نام مرزا رفیع لکھا ہے تو کسی نے مرزا رفیع الدین اور کسی نے مرزا احمد رفیع بتایا ہے۔ خود سودا اپنا مرزا محمد رفیع لکھا کرتے تھے۔ انجم صاحب نے ان سب پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ اصلاً ان کا نام مرزا محمد رفیع تھا۔ یہ بات اس لیے اور بھی زیادہ قرین قیاس ہے کہ ان کے والد کا نام مرزا محمد شفیع تھا۔

کتاب کا دوسرا حصہ تنقید پر مشتمل ہے۔ اس میں سودا کے فارسی اور اردو کلام اور نثری تصانیف کا

تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔اس میں ان کی غزل گوئی قصیدہ نگاری، ہجو گوئی، مرثیہ نگاری، قطعات، رباعیات اور شہر آشوب وغیرہ سے علاحدہ علاحدہ بحث کی گئی ہے۔سودا قصیدہ اور ہجو گو کی حیثیت سے اتنے مشہور ہو گئے تھے کہ دوسری اصناف سخن میں ان کی مہارت ماند پڑ گئی ہے۔ حالانکہ ان میں بھی انھوں نے اپنی مہارت اور قدرت کاملہ کے جوہر دکھائے ہیں۔انجم صاحب نے ان سب سے الگ الگ بحث کی ہے اور ہر حیثیت سے ان کا مقام اور قدر و قیمت کا تعین کیا ہے۔ان کی قصیدہ نگاری کے بارے میں انجم صاحب کی رائے ہے:

''سودا کا ادبی کارنامہ قصیدہ گوئی اور ہجو گوئی ہے، جن میں داخلیت کے بجائے خارجیت کو دخل ہوتا ہے۔ اس سے قبل ہی یہ دونوں اصناف اردو میں رائج تھیں۔لیکن یہ صرف سودا تھے جنھوں نے اس کو باقاعدہ فن کی صورت دی اور فنی اعتبار سے ان اصناف کو انتہا پر پہنچا دیا۔ یہ بات بغیر کسی شک وشبہ کے کہی جاسکتی ہے کہ اس میدان میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔''(۱۷)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''سودا اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے قصیدہ نگاری کو باقاعدہ فن کی حیثیت سے انتہائی بلندی پر پہنچایا۔ سودا کے بعد اردو ادب کی تاریخ میں صرف ذوق ہی وہ شاعر ہیں جنھیں دوسرا بڑا قصیدہ گو کہا جا سکتا ہے، لیکن قصائد ذوق میں وہ تنوع، نیرنگی، قدرت اظہار اور وہ پرشور انداز بیان نہیں ہے جو اچھے قصیدے کے لیے لازم ہے۔ اور یہی وہ خصوصیات ہیں جنھوں نے سودا کو انفرادیت بخشی ہے۔قصیدے کا انداز بیان دوسرے اصناف سخن مختلف ہوتا ہے۔مضمون آفرینی، جوش بیانی، پختگیِ کلام، مشکل زمینیں، شکوہ الفاظ، روانی وسلاست اور جدت ادا وغیرہ قصیدے کی خصوصیات ہیں۔ سودا کے قصائد میں یہ تمام خصوصیات موجود ہیں۔قصیدے کے لیے خارجیت بہت ضروری ہے۔سودا کے عہد میں دلی کے تمام شاعر دل کی دنیا میں کھوئے ہوئے

تھے۔سودا پہلے ایسے شاعر ہیں جو اپنے اندر کی دنیا سے نکل کر باہر آئے ہیں۔'' (۱۸)

انجم صاحب سودا کو غزل گو کی حیثیت سے بڑا شاعر تسلیم نہیں کرتے۔ اس نازک مرحلہ پر بھی انجم صاحب نے تحقیق وتنقید کے اصولوں کا لحاظ کرتے ہوئے بڑی خوبصرتی اور چابک دستی سے جانبداری اور بے جا تعریف سے اپنے دامن کو آلودہ ہونے سے بچالیا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ سودا نیا اردو غزل کو بہت کچھ دیا۔انھون نے اس کے دامن کو زورِ بیان، خارجیت اور نشاط آمیز لہجہ عطا کیا۔انجم صاحب نے سودا کی اس عطا کا فراخدلی سے اعتراف بھی کیا ہے۔انھیں کصوصیات کی بنا پر وہ سودا کو ایک عظیم غزل گو شاعر بھی بتا سکتے تھے،لیکن انھوں نے یہاں بھی اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور غزل گو کی حیثیت سے ان کا وہی مقام متعین کیا جس کے وہ مستحق تھے۔یہی روش انھوں نے دوسری اصناف سخن پر بحث کرتے ہوئے اپنائی ہے۔

خلیق انجم کی ایک اور اہم کتاب 'متنی تنقید' ہے۔ یہ اردو میں ایسی پہلی کتاب ہے جو تصحیح متن کے طریقوں پر شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالتی ہے۔اس کے ترتیب متن کے حدود کا تعین بھی ہوتا ہے اور اس کی تشریح وتوضیح کے وہ پیمانے مقرر ہوتے ہیں جن سے ذوق وشعور کی پرورش اور ترقی کا سامان فراہم ہوتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ تصحیح متن دراصل تحقیق کا وہ بنیادی کام ہے جس پر تنقید کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو متنی تنقید بیک وقت تحقیق وتنقدی دونوں میدانوں میں شامل ہے اور علم وادب کے ان دونوں دائروں کا ارتقا اسی پر منحصر ہے۔

ایسے کلیدی موضوع پر بحث آسان نہیں۔ اس سلسلے میں دو اہم ترین مسائل کی نشان دہی کافی ہوگی اول یہ کہ موضوع کی تمام جہتوں اور ان کے مضمرات کا احاطہ بہت دشوار ہے۔جس کے لیے نہایت باریک بینی کے ساتھ حقائق کے مفصل تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔دوم یہ کہ اس تجزیے میں تکنیکی امور کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ کم ہی لوگ اس کے مطالعے کی طرف راغب ہوتے ہیں اور عام قارئین کے لیے اس کا قابل مطالعہ ہونا بھی مشکوک ہوتا ہے۔اس لیے کہ اصطلاحی الفاظ اور اعداد وشمار کی فراوانی وضاحت بیان میں حائل ہوسکتی ہے۔لیکن انجم صاحب ان دونوں مسائل سے اس کمال کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں کہ مباحث بسا

اوقات قصے کی طرح دلچسپ ہوگئے ہیں۔ خاص کر متن کی تحریف وتصحیح کی جو مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ قاری کی معلومات میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس کے تجسس کو پیہم بیدار کرتی رہتی ہیں اور اس کے ذہن پر ایسے اسرار و رموز کا انکشاف ہوتا رہتا ہے کہ اس کی دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔ یہ بات صرف اس لیے ممکن ہوسکی کہ انھوں نے موضوع کے پورے مواد کی فراہمی کے ساتھ ہی اس پر کافی غور وفکر کر کے اس کے سارے پیچ کھول دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے نہایت سادہ و سلیس اندازِ بیان سے کام لے کر اپنے قاری کو اعتماد میں لیا ہے۔

دراصل 'متنی تنقید' میں ان کا انداز ایک ایسے صاحب اسلوب شخص کا ہے جو ایک خاص فن کی گویا بنیاد رکھ رہا ہے اور اس کے ہر ہر پہلو کی چھان بین کر لی ہے۔ لہٰذا وہ پورے اعتماد اور بے ساختگی کے ساتھ اپنے نتائج افکار پیش کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ انھوں نے دیگر علمائے تحقیق سے تبادلۂ خیال نہیں کیا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے متعلقہ موضوع پر کسی بھی جہت سے اظہار خیال کرنے سے پہلے اپنے پیش رووٴں کے متعدد حوالے دیئے ہیں اور بعض اوقات ان کی رایوں پر محاکمہ بھی کیا ہے۔ استفادے اور افادے کا یہ طریقہ تخلیقی حد تک نتیجہ خیز ہے، جس میں مناسب مواقع پر سارے ضروری نکات کی تفتیش کر کے انھیں بہت سوچ سمجھ کر بالکل نئے انداز میں مرتب کیا گیا ہے۔ یہ بجائے خود اپنے آپ میں ایک علمی و تحقیقی کارنامہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے تنقید متن کے متعلق موجود حقائق و افکار کی ایک نئی تدوین کی ہے اور اپنے مطالعات کا حاصل ایک خاص تنظیم سے پیش کیا ہے۔ وہ موضوع کے مختلف پہلووٴں کی تبویب اور ان پر بحث اس منظّم طریقے سے کرتے ہیں کہ مجموعی طور پر متعلقہ مواد کا ایک مربوط ہیولا تیار ہو جاتا ہے اور قاری بہت آسانی کے ساتھ ایک تکنیکی مضمون کی پیچیدگیوں اور باریکیوں سے نہ صرف واقف ہوتا ہے بلکہ لطف اندوز بھی ہوتا ہے، اس لیے کہ مصنف صراحت کے ساتھ تدریجی طور پر تمام تفصیلات ایک رواں انداز سے سامنے لاتا ہے۔ وہ اس سلسلے میں نہ تو بے جا طوالت سے کام لیتا ہے نہ پریشان کن اختصار سے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ بھاری بھر کم اصطلاحات کے چکر سے نکل کر سادہ و عام فہم لفظوں میں اپنا مافی الضمیر صاف صاف بیان

کر دیتا ہے۔اگر چہ منطقی استدلال اور نکتہ سنجی اس کی ہر تشریح سے عیاں ہے۔ یہ ایک اچھا تدریسی اسلوب بھی ہے، جس میں تجزیے کی قوت ترکیب کی صلاحیت سے ہم آہنگ ہے اور دونوں علمی طریقوں کا ارتباط تصنیف کی جامعیت و ثروت کا باعث ہوتا ہے۔

'متنی تنقید' میں خلیق انجم موضوع کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے ہوئے بعض ایسے حقائق کی نشان دہی بحسن و خوبی کرتے ہیں جن کی ادبی تنقید میں بڑی اہمیت ہے۔ جب کہ جدید تنقید کا ایک حلقہ عصر حاضر میں ان کو نظر انداز کر رہا ہے۔ ماضی اور کلاسیکی ادب پر ان کا یہ اظہارِ خیال ان کی علمی بصیرت اور ادبی آگہی کا ایک نمایاں ثبوت ہے:

> ''مہذب قوم کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اس کے پاس اپنے بزرگوں کی ذہنی اور فکری سفر کے ارتقا کی پوری تاریخ محفوظ ہوتی ہے۔ ہمارے حال کو فکر کی جن شمعوں نے روشن کیا ہے، ان میں کوئی شمع ایسی نہیں جس کا رشتہ ماضی سے نہ ہو۔ کوئی سائنس اور کوئی فن ایسا نہیں جو ماضی کی پروا کیے بغیر ترقی کر سکے۔ وقت کے تیز اور تند دھارے ہر چیز کو مٹاتے ہوئے چلتے ہیں۔ انسان ازل سے ان دھاروں پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جن ایجادوں کے ذریعے انسان نے اپنے مقصد میں تھوڑی بہت کامیابی حاصل کی ہے، ان میں تحریر سرِ فہرست ہے۔ کتابوں اور مختلف اشیا پر لکھی گئی تحریروں ہی سے ہم ماضی کی بازیافت کرتے ہیں۔ الہامی کتابوں کے بعد اگر کوئی چیز مقدس ہے تو وہ بزرگوں کے وہ فکری کارنامے ہیں جو کتابوں کی صورت میں ہمیں ورثے میں ملے ہیں۔'' (۱۹)

خلیق انجم کی یہ کتاب ۱۹۶۷ء میں سامنے آئی۔ اس کتاب کے ذریعہ اصول ترتیب و تدوین مرتب صورت میں پوری شرح و بسط کے ساتھ اردو حلقوں میں پہلی مرتبہ متعارف ہوئے۔ یہ اپنے موضوع پر باقاعدہ پہلی کتاب ہے اور اپنی جامعیت کے اعتبار سے اب تک کوئی دوسری کتاب اس کی جگہ نہیں لے سکی

ہے۔اس کی اہمیت کے پیش نظر آج تک یہ کتاب ہندوپاک کی یونیورسٹیوں میں ایم۔فل۔کے نصاب میں داخل ہے۔اس کے مشمولات سے موصوف کا اس موضوع سے انہماک کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

تدوین متن کے سلسلے میں ان کا ایک اہم کام سرسید احمد خان کی کتاب 'آثارالصنادید' ہے۔اس کتاب میں سرسید نے دلی کے آثار قدیمہ کی تاریخ مرتب کردی ہے۔اس کی تدوین نو کے لیے انجم صاحب نے قدیم فن تعمیر کو سمجھنے کے لیے بڑی تعداد میں مختلف زبانوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ بعدازاں انھوں نے مذکورہ کتاب کا ایک تنقیدی ایڈیشن تیار کیا اور دوسو صفحات پر مشتمل ایک طویل مقدمہ تحریر کیا۔اس مقدمے میں ماہرانہ انداز میں مسلم فن تعمیر کے آغاز وارتقا پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور ہندوستان کے قدیم فن تعمیر کا جائزہ لیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ان دو مختلف انداز تعمیر کی آمیزش سے ایک نیا فن تعمیر وجود میں آیا۔ یہ تمام تفصیلات بیان کرنے کے بعد انجم صاحب نے دلی کے اہم آثار قدیمہ کا ماہرانہ انداز میں جائزہ لیا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ انجم صاحب نہ صرف متنی تنقید کے جدید ترین اصول وضوابط کے ماہر ہیں بلکہ 'غالب کے خطوط' کی شکل میں عملی تنقید کا نمونہ بھی پیش کیا ہے۔انھوں نے آثار الصنادید کے جدید ترین اصولوں کے مطابق مرتب کیا ہے۔انھوں نے تقریباً ساڑھے تین سو اردو، فارسی اور انگریزی کتابوں کی مدد سے جو حواشی لکھے ہیں، وہ خاصے کی چیز ہیں۔پہلی جلد میں مقدمہ اور آثار الصنادید کا عمارتوں سے متعلق متن ہے۔ دوسری جلد میں عمارتوں کے وہ خاکے اور کتبے ہیں جو سرسید نے پہلے ایڈیشن میں شامل کیے تھے لیکن دوسرے ایڈیشن کو مختصر کرنے کے خیال سے نکال دیئے۔ چونکہ سرسید کے بنوائے ہوئے عمارتوں کے یہ خاکے اور کتبے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔اس لیے انھیں دوسری جلد میں شامل کرلیا گیا ہے۔

خلیق انجم کی تحقیقات وتدوین کا سلسلہ نہایت وقیع ہے۔ یہاں ان کی چند اہم تحقیقی کاوشوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا گیا۔ مذکورہ کتابوں کے علاوہ انھوں نے معراج العاشقین ،مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، غالب کی نادر تحریریں، رسوم دہلی، مولانا ابوالکلام آزاد، دلی کی درگاہ شاہ مرداں، دلی کے آثار قدیمہ کے علاوہ اردو کے کئی شعرا وادبا پر کتابیں ترتیب دے کر اردو ادب وتحقیق کی ناقابل فراموش خدمات انجام

دی ہیں۔ ان کی خدمات کا ان کی زندگی میں ہی ادبی حلقوں نے اعتراف بھی کیا اور انھیں مختلف اداروں کی جانب سے انعامات سے بھی نوازا گیا۔

حنیف نقوی ۱۷/۱/اکتوبر ۱۹۳۶ء تا ۲۲/دسمبر ۱۹۱۲ء):

پروفیسر حنیف نقوی کا شمار ان محققین میں ہوتا ہے جن کے یہاں احتیاط پسندی، دلیلوں اور دعووں کی بنیاد پر استنباطِ نتائج اور تحقیق کو ترتیب مقدمات اور فکری تنظیم سے آشنا کرنے کی روایت پائی جاتی ہے۔ اردو میں اس روایت کی بنیاد ڈالنے کا سہرا حافظ محمود شیرانی کے سر ہے، جسے بعد میں امتیاز علی عرشی اور قاضی عبدالودود نے نہ صرف تقویت بخشی بلکہ اردو تحقیق کو سائنٹفک طریقۂ کار اور بین العلومی مطالعے کی اہمیت سے بھی روشناس کرایا۔ قاضی صاحب کے بعد اس طرزِ تحقیق کی پیروی کرنے والوں میں رشید حسن خان اور حنیف نقوی کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ دونوں محققین میں فرق یہ ہے کہ جہاں رشید حسن خان کی تحقیق کا اصل مرکز تدوین متن ہے وہیں نقوی صاحب کی تمام تر توجہات و ترجیحات مختلف نوعیت کی تحقیقات پر رہی ہے۔ تاہم ان دونوں کا یہ اختصاص بھی قابل ذکر ہے کہ دونوں کی اپنی تحقیقات کی بنیاد کلاسیکی متون پر استوار کی ہے۔ دونوں نے تاعمر کلاسیکی شعر و ادب کی تحقیق میں خود کو مصروف رکھا اور جدید شعر و ادب اور تنقید کو کبھی لائقِ اعتنا نہیں سمجھا۔ خصوصاً حنیف نقوی نے زندگی بھر اپنی توجہ کلاسیکی فن پاروں، ادبی شخصیات اور ان کے کارناموں سے متعلق نئی دریافت یا ان کے متعلق محققین کی فروگذاشتوں کی نشان دہی پر مرکوز رکھی اور اپنی دیدہ ریزی، تبحر علمی اور وسعت مطالعہ کی بدولت متقدمین اور متاخرین کے متعین کردہ مفروضات اور قیاسی نتائج کو دلائل و براہین کی روشنی میں رد کر کے اصل صورت واقعہ سے روشناس کراتے رہے۔

پروفیسر حنیف نقوی تحقیق کی دنیا میں اپنے زمانۂ طالب علمی کے کارناموں کی بدولت ہی قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے تھے۔ پروفیسر ابو محمد سحر کی نگرانی میں 'شعرائے اردو کے تذکرے' کے عنوان سے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کا مقالہ لکھ کر انھوں نے اپنی تحقیقی زندگی کا آغاز کیا۔ مذکورہ کتاب ۱۹۷۴ء میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب آج بھی اپنے موضوع پر حالہ جات کی حیثیت رکھتی ہے۔ تذکراتی تحقیق کے ضمن میں آج بھی کتاب مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ فہرست مندرجات سے ہی اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ

لگایا جاسکتا ہے۔انھوں نے مختلف عنوانات کے تحت تذکرہ نگاری بحیثیت فن،عربی وفارسی میں تذکرہ نگاری کی روایت،اردو میں تذکرہ نگاری اوراس فن کے مراکز کا جائزہ لیا ہے۔بعدازاں تیئس (بعد کی اشاعتوں میں اٹھائیس) تذکروں کا تنقیدی مطالعے کے ذریعہ ان کے مقام واہمیت کے تعین کی کوشش کی ہے۔

پروفیسر حنیف نقوی نے تذکروں کے علاوہ سوانحی تحقیق سے بھی دلچسپی لی۔اس ضمن میں تحقیق و تعارف، غالب احوال وآثار، رجب علی بیگ سرور چند تحقیقی مباحث، مآثر غالب (تصحیح وترتیب جدید)، پنج آہنگ قدیم نسخہ، دیوان ناسخ نسخۂ بنارس، رائے بینی نرائن دہلوی: سوانح اورادبی خدمات، میر ومصحفی، غالب کی فارسی مکتوب نگاری، تحقیق وتدوین: مسائل ومباحث، تذکرہ شعرائے سہسوان، حیات العلما اورآخری کتاب جہانِ غالب جیسی کتابیں ان کی روشن مثالیں ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ نقوی صاحب ان کلاسیکی ادبی شخصیات کی تحقیق وجستجو میں ہمیشہ مصروف رہے جو تاریخ کے اوراق میں دفن ہوکر ہماری ادبی تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔اس نوع کی تحقیق تاریخ کی گم شدہ کڑیوں کو جوڑ کر ادبی تاریخ کو مرتب کرنے میں ہماری مدد کرتی ہے۔حنیف نقوی نے رجب علی بیگ سرور، منشی احمد حسن مہر، مرزا حاتم علی بیگ اور بینی نارائن جہاں جیسی ادبی شخصیات سے متعلق جو نئی تحقیقات پیش کی ہیں اس کی بنا پر ان ادیبوں سے متعلق نہ صرف یہ کہ ہماری معلومات میں اضافہ ہوا ہے بلکہ کئی قیاسی اور گمراہ کن خیالات بھی رد ہوئے ہیں۔مثلاً حنیف نقوی نے فسانۂ عجائب کے مصنف رجب علی بیگ سرور کی تاریخ وفات کی نہ صرف قطعی تاریخ متعین کی بلکہ تاریخ بنارس کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ بنارس میں جو قبر سرور کے نام سے منسوب کی جاتی ہے وہ اصلاً کسی دوسرے رجب علی بیگ کی ہے۔

حنیف نقوی کی کتاب 'میر ومصحفی' تحقیقی نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہے۔اس میں شامل مضمون 'مصحفی سے منسوب دو تذکرے' اس لحاظ سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ مصحفی سے منسوب ان تذکروں 'ید بیضا' اور 'نورازل' کے وجود سے ہی نقوی صاحب نے انکار کیا ہے۔انھوں نے داخلی اور خارجی شہادتوں کی بنیاد پر یہ ثابت کیا ہے کہ متذکرہ تذکرے جو مصحفی سے منسوب کیے گئے ہیں، یہ اصلاً ان کے تذکرے 'تذکرۂ ہندی' کی تحریف شدہ شکلیں ہیں۔

غالب اور متعلقات غالب کے ضمن میں تحقیقات کے پہلو بہ پہلو غالبیات کے تعلق سے دوسرے محققین تسامحات اور فروگذاشتوں کی نشان دہی بھی ان کی تحقیق کا خاصہ رہا ہے۔انھوں نے غالب کے سلسلے میں محض مبتدیوں اور نیم محققوں کی خامہ فرسائیوں کی گرفت نہیں کی بلکہ قاضی عبدالودود، مالک رام، کالی داس گپتا رضا اور خلیق انجم جیسے ممتاز محققین اور ماہر غالبیات بھی ان کی زد سے بچ نہ سکے۔ آثر غالب مولفہ قاضی عبدالودود کی تدوین نو جن خطوط پر نقوی صاحب نے کی ہے وہ مثالی ہے۔انھوں نے نہ صرف مقدمہ اور حواشی لکھا بلکہ قاضی صاحب کی تحریروں میں تصحیحات کے انبار لگا دیے۔اسی طرح مالک رام کی تالیف 'تلامذۂ غالب' پر انھوں نے جو مضامین لکھے،اس کی رو سے تلامذۂ غالب کے سیاق میں مالک رام نے حقائق کی غلط تعبیر کی ہے۔ نیز انھوں نے اہم ماخذات سے استفادہ نہیں کیا ہے۔نقوی صاحب نے متعدد شعرا کے تراجم میں قابلِ ترمیم اور وضاحت طلب مقامات کی نشان دہی کے علاوہ غالب کے مزید دس شاگردوں کے ناموں کے اضافے بھی کیے۔

ادبی تحقیق میں نقوی صاحب کا طریقۂ کار یہ رہا ہے کہ کسی موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے اس سے متعلق دستیاب مواد اور معلومات کا مطالعہ گہرائی کے ساتھ کیا جائے گا۔اس سلسلے میں اہم اور غیر اہم کی تخصیص نہیں تھی۔ وہ تمام مواد کی بڑی عرق ریزی اور انہماک کے ساتھ دستاویزی شہادتوں کی روشنی میں جانچ پرکھ کرتے اور منصفانہ تجزیے و جرح و تعدیل کے بعد ہی استخراج نتائج کرتے تھے۔ غالب اور متعلقات غالب کے سلسلے میں ان کے تحقیقی مقالات ان کے اسی نقطۂ نظر کا ثمرہ قرار دیے جاسکتے ہیں جن میں انھوں نے اپنے پیش روؤں کے قائم کردہ تصورات کو تاریخی حقائق کی روشنی میں جانچا پرکھا ہے اور ان سے انحراف بھی کیا ہے نیز غالب کی سوانح سے متعلق اہم تحقیقات پیش کی ہیں۔غالب کا سال ولادت، غالب کا سفر کلکتہ، غالب اور معارضۂ کلکتہ کی گتھیاں جس طرح دلائل و براہین کے ساتھ ساتھ انھوں نے سلجھائی ہیں، وہ انھیں کا حصہ ہے۔مثلاً غالب کی تاریخ پیدائش ہی کو لیں تو عام طور پر محققین کی رائے یہ ہے کہ ان کی ولادت ۸/رجب ۱۲۱۲ھ کو ہوئی۔نقوی صاحب نے اس پر اعتراض کیا اور غالب کی مختلف تحریروں کتب اور خطوط کی روشنی میں غالب کی سال پیدائش ۸/رجب ۱۲۰۸ھ مطابق ۹/فروری ۱۷۹۴ء درج کی ہے۔ غالب کی

ولادت سے متعلق یہ تحقیق صرف مالک رام ہی نہیں بلکہ تمام غالب شناسوں کے خیالات کو باطل کر دیتی ہے۔

حنیف نقوی نے تحقیق کی مبادیات اور اس کے اطلاق سے بھی دلچسپی لی ہے۔ ہر چند کہ اردو کے اہم محققین مثلاً قاضی عبدالودود، مالک رام، گیان چند جین اور رشید حسن خان وغیرہ کی کوششیں اس ضمن میں اہم ہیں، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نقوی صاحب اردو میں مبادیات تحقیق کے تعلق سے پیش کردہ تصورات کی تائید کرنے کے باوجود جدید تقاضوں کے تحت اس میں وسعت چاہتے ہیں نیز جامعات اور دانش گاہوں میں تدریس متن اور تحقیق و تدوین سے مطمئن نہیں۔ ان کی کتاب 'تحقیق و تدوین: مسائل و مباحث' کے مضامین اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ حنیف نقوی تحقیق کو حقائق کی بازیافت، تاریخ کی بھولی بسری سچائیوں کو از سر نو منظّم و مربوط کرنے کے علاوہ تہذیبی تشخص کے عرفان کا بھی ایک اہم ذریعہ تصور کرتے ہیں جس کے بغیر نہ علوم و فنون کا کارواں نئی جہتوں سے آشنا ہوسکتا ہے اور نہ نئے آفاق سے روشناس ہونا ممکن ہے۔ اردو کی حد تک تحقیق کے سیاق میں یہ خیال بالکل نیا اور عصری تقاضوں کا زائیدہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ اس لیے کہ حنیف نقوی کا رشتہ محض ادب کے بجائے زندگی فہمی، فن اور تہذیب کی قدر شناسی اور شعور حیات کے ادراک سے جوڑتے ہیں اور یہی فہم و بصیرت ہماری زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ نیز تحقیق کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے۔

اس طرح دیکھا جائے تو حنیف نقوی کو حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود کے سلسلے کی آخری کڑی کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے جہاں ایک طرف اردو تحقیق کے ذخیرے میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے وہیں دوسری طرف اردو تحقیق سے شغف رکھنے والوں کی ذہنی و فکری تربیت بھی کی ہے۔ اس لحاظ سے ان کی ادبی و تحقیقی خدمات ہمارے لیے مشعل راہ کا حکم رکھتی ہیں۔

کالی داس گپتا رضا:

اردو تحقیق میں کالی داس گپتا رضا کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے غالب کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور غالب پر درجن بھر سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں۔ جس میں ''دیوان غالب کامل'' (تاریخی ترتیب سے) نہایت بسیط اور لائق تحسین کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ دعائے صباح (۱۹۷۷)،

متعلقات غالب ۱۹۷۸ء، غالبیات چند عنوانات (۱۹۸۲)، دیوان غالب (عکسی مطبوعہ اکتوبر ۱۸۴۱ء طبع اول) ۱۹۸۶ء، دیوان غالب عکسی مطبوعہ ۱۹۶۴ء چوتھا ایڈیشن ۱۹۸۷ء، غالب درون خانہ ۱۹۸۹ء، پنج آہنگ میں مکاتیب غالب ۱۹۸۹ء، غالب کی بعض تصانیف کے بارے میں ۱۹۹۰ء، دیوان غالب متداول تاریخی ترتیب سے ۱۹۹۱ء، اسداللہ خان غالب مرد ۱۹۹۱ء، غالب کا ایک مشاق شاگرد بال مکند بے صبر ۱۹۹۲ء، تفہیم غالب کے دو حرف (اور دوسرے مضامین) ۱۹۹۹ء ان کی اہم تحقیقی کتابیں ہیں۔

کالی داس گپتا رضا ۲۵/ اگست ۱۹۲۵ء کو پنجاب ضلع جالندھر کے ایک گاؤں مکند پور میں ایک ساہوکار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ دستور کے مطابق تحصیل علم کے بعد ۱۹۴۹ء میں اپنے والد شنکر داس گپتا کے اصرار پر بغرض تجارت افریقہ چلے گئے اور وہاں کے شہر نیروبی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہیں ۴/ اگست ۱۹۵۶ء کو لاجپت رائے گپتا کی بیٹی ساوتری دیوی سے ان کی شادی ہوگئی۔ قیام افریقہ کے دوران تجارت کے علاوہ مطالعہ ان کا خاص مشغلہ تھا۔ کثرت مطالعہ نے ان کے علم کو وسعت بخشی نیز مختلف ممالک اور مذاہب کے لوگوں سے میل جول نے ان میں وسیع النظری کا جوہر پیدا کیا۔ نیز ان کے مذہبی افکار و نظریات میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی جس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے:

> ''میرے خیالات میں بہت زیادہ تبدیلی تو آئی مطالعے و مشاہدے سے، لوگوں کے میل جول سے۔ چونکہ میں پنجاب سے نکلا تھا اور نکل کر ایسے لوگوں میں چلا گیا جہاں مختلف دھارے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ افریقہ میں مطالعے کا موقع بھی بہت ملا لہٰذا پڑھا بھی بہت۔ اچھے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ میں سخت و شدید آریہ سماجی نہ رہا۔ مجھے یہ سوچنے اور سمجھنے کا گر ہاتھ آ گیا کہ کوئی بھی چیز حرف آخر نہیں ہے۔ مذہب کے معاملے میں بھی۔ اس میں ہمیں کچھ ڈھیل ضرور دینی چاہیے۔۔۔ ایک ایڈجسٹمنٹ کی طبیعت پیدا ہوگئی جس سے مزاج میں وسعت بہت زیادہ آ گئی۔'' (۲۰)

۱۹۷۰ء میں انھوں نے افریقہ کو خیر باد کہہ کر بمبئی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہاں بھی تجارت

کے علاوہ ادب کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ قیام افریقہ کے دوران کالی داس گپتا رضا ادبی حلقوں میں ایک شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام 'شعلۂ خاموش' ۱۹۶۸ء قیام افریقہ کی ہی یادگار ہے۔ اپنے قیام بمبئی میں انھوں نے ادب کی تحقیق کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ خصوصیت کے ساتھ تمام عمر غالب پر تحقیق کرتے رہے۔ ۱۹۸۸ء میں 'دیوان کامل غالب' (تاریخی ترتیب سے) کی اشاعت کے بعد ادبی دنیا میں ان کی بھرپور پذیرائی ہوئی۔ مختلف انعامات واعزازات ان کا مقدر بنے۔ 'پدم شری' کا اعزاز حاصل کرنے دہلی گئے ہوئے تھے کہ وہیں ۲۱/ مارچ ۲۰۰۱ء کو حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب انتقال ہو گیا۔

گپتا رضا کی اصل شہرت غالب وچکبست کی شخصیت اور فن کے نئے گوشوں کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں ہے۔ ذوق وفراق پر بھی ان کا کام ان شاعروں کے معتبر کوائف اور مستند کلام کی بازیافت کے سلسلے میں کافی اہم ہے۔ اس کے علاوہ اپنی محققانہ تحریروں کے ذریعہ انھوں نے جو ایک خاص کام کیا ہے اور جس کو کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا وہ یہ ہے کہ انھوں نے ایسے لوگوں میں خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے جو جوہر قابل رکھتے تھے۔ لیکن کسی وجہ سے شہرت ومقبولیت نہیں حاصل کر کے تھے۔ ایسے لوگوں میں زیادہ تر ہندو تھے مگر کئی مسلمان بھی تھے۔ نظر انداز کیے جانے والے ان ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ برسوں کی تحقیق اور چھان پھٹک کے بعد لکھا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس ضمن میں نمونے کے طور پر جو مثالیں پیش کی ہیں وہ کالی داس گپتا رضا کی تحقیق کو ان کا شاندار خراج عقیدت ہے:

> ''امانت لکھنوی: امانت کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی ایک غزل ''کیوں ہوں نہ لطافت سے پر اشعار امانت'' میں امانت نے اپنے بیسیوں شاگردوں کے تخلص نہایت چابکدستی سے لکھ دیتے ہیں۔۔۔۔ گور بخش ادیب: قوم کا کہار تھا۔۔۔ چونکہ طبیعت موزوں تھی اس لیے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں خود بہ خود شعر کہنے لگا۔ جب لالہ بنی پرشاد ظریف نے اس کی طبیعت کی جولانیاں دیکھیں تو وہ اسے مصحفی کے پاس لے گیا اور اس کی چند غزلیں اصلاح کروائیں

جنھیں بعد میں مشاعرے میں خوب پسند کیا گیا اور کافی داد ملی۔ایک دو دن بعد محمد عیسیٰ تنہا شاگرد مصحفی نے کہا کہ آپ ادیب کو اصلاح نہ دیں اور اسے اپنا شاگرد نہ بنائیں۔اگر جناب ہر کس و ناکس کو اپنے قریب جگہ دیں گے تو ہمارے مرتبے کے لوگ جنھوں نے اس فن شریف کو سیکھنے میں عمر صرف کی ہے، کہاں جائیں گے۔مصحفی نے ان کی بات مان لی اور ادیب کو شاگردی سے برطرف کر دیا۔ایک مدت بعد ادیب ترقی کرتے کرتے نواب سعادت علی خان کے تام جان اٹھانے والے کہاروں میں داخل ہو گیا اور اپنی قوم میں ممتاز سمجھا جانے لگا۔رفتہ رفتہ نواب صاحب اس کی قابلیت دیکھ کر اس پر بہت مہربانی سے پیش آنے لگے، حتیٰ کہ اس سے شعر بھی سنتے تھے اور صاد فرماتے تھے۔نواب سعادت علی خان کے انتقال کے بعد جب نواب غازی الدین حیدر تخت نشین ہوئے تو ادیب نے ان کی شان میں قصیدہ پیش کیا۔نواب نے اسے ایک دوشالہ اور پانچ اشرفیاں بطور انعام دیں اور اسی دن سے تام جان اٹھانے کی خدمت سے سبک دوش کر کے خزانۂ عامرہ میں محرری کی خدمت سپرد کی اور تنخواہ میں اضافے سے سرفراز کیا۔''(۲۱)

لال چند فلک، منشی مینڈو لال زار لکھنوی اور غزلیات تمنا بھی اسی سلسلے کے اہم مضامین ہیں۔جو ان کے ایک مجموعۂ مضامین ''حرف گیر'' میں شامل ہیں۔

''سہو و سراغ'' (جنوری ۱۹۸۰ء) گپتا رضا کی ایک ایسی کتاب ہے جس کے منظر عام پر آنے کے ساتھ علمی دنیا میں محقق کی حیثیت سے ان کی شناخت مستحکم ہونے لگی تھی۔یہ کتاب کئی ابواب پر منقسم ہے۔پہلے باب کا عنوان ''سن رکھو تم فسانہ ہیں ہم لوگ'' ہے۔اس میں شامل مضامین کے عنوانات سے ہی ان کے مواد و کیفیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔چند عنوانات یہ ہیں۔''چند قدیم مرثیہ گو''، ''قدیم ہندو شعرا کی چند نعتیں''،

''مرزا جان جاناں مظہر اور رائے کیول رام''، ''مثنوی مولوی کا ایک مطبوعہ نسخہ''، ''چکبست اور طنز و مزاح''، ''کچھ دبیر کے تعلق سے''۔۔۔وغیرہ۔

چند مشہور شعرا اور ان کے خالق کے عنوان سے چالیس مشہور شعروں کے اصل خالقوں کا سراغ لگایا ہے مثلاً اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ:

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

میر کا شعر نہیں بلکہ خان آرزو (وفات ۵۶-۱۷۵۵ء) کے معاصر لالہ بدھ سنگھ قلندر کا ہے اور سہی شعر اس طرح ہے:

تھمتے ہی تھمے گا عشق ناصح
رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

اس طرح اردو میں ایک مصرعہ بہت مشہور ہے۔

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ پورا شعر کیا ہے۔ گپتا رضا نے سراغ لگا کر بتایا کہ شعر غالب کے مشہور شاگرد میاں داد خاں سیاح کا ہے اور پورا شعر یہ ہے:

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

یوں تو اس باب کا ہر مضمون لاجواب ہے مگر گمنام شعروں کے خالقوں کے سراغ سے متعلق مضمون کا جواب نہیں ہے۔ دوسرا باب جس سے کتاب کا نام اخذ کیا گیا ہے، غالبیات تک محدود ہے۔ آخری باب تمثیلی خاکوں پر مشتمل ہے۔ مجموعی طور پر اس کتاب کی روشنی میں بہت سی ایسی شخصیتوں کی علمی و ادبی حیثیتوں کا تعین تو ہوتا ہے جو قعر گمنامی میں پڑی ہوئی تھیں، خود گپتا رضا کے علمی انہماک اور تحقیقی جستجو کا بھی پتہ چلتا ہے۔

اس کتاب میں چکبست پر بھی ایک مضمون ہے۔ اس کے علاوہ چکبست اور باقیات چکبست (مارچ

۱۹۷۹ء) اور چکبست کچھ باز دید کچھ پیش رفت (۱۹۹۳ء) چکبست کے فکر وفن سے متعلق ان کی اہم کتابیں ہیں۔ شاید ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ چکبست پر وہ کام نہیں ہوا ہے جس کے وہ مستحق تھے۔ اس لیے انھوں نے ان کے فکر وفن کے تعارف کے ساتھ ان کے مجموعی کلام کے اشاعت پر بھی توجہ دی ہے۔ ان کے مقالات بھی جمع کیے ہیں یعنی اپنے طور پر وہ سب کچھ کیا ہے جس سے چکبست کے نام اور کام کو زندہ رکھا جا سکتا ہے۔

گپتا رضا کو سلسلۂ داغ سے وابستگی کا بہت شدید احساس تھا۔ اس لیے انھوں نے جہاں استاد داغ دہلوی کے مستند حالات زندگی پیش کرنے کے ساتھ ان کی غزلیات کا انتخاب بھی پیش کیا ہے۔ 'داغیات' میں بہت سے انکشافات بھی کیے ہیں اور داغ کے استاد ''خاقانی ہند'' اور داغ کے شاگرد و جانشین ابوالفصاحت پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی (گپتا رضا کے استاد) کے سوانحی اور علمی کوائف کی تحقیق و تدوین میں بڑی عرق ریزی کی ہے۔ ان کا یہ سارا کام دل و نگاہ کو روشن اور طبیعت کو شاد کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ کالی داس گپتا رضا نے تحقیق میں جو کام کیا ہے، صحت کے ساتھ کیا ہے۔ ان کی تحقیقی دنیا غالب اور چکبست تک محدود بھی نہیں ہے۔ بلکہ انھوں نے نئے مآخذ کی نشان دہی کرنے کے ساتھ تحقیق میں ماخذ کے طور پر استعمال میں آنے والی کتابوں کی علمی و ادبی حیثیت پر بھی بحث کی ہے۔ 'آب حیات' میں ہندو شعرا کا تذکرہ اور مولانا فضل حق خیر آبادی کا ایک تاریخی قصیدہ اس کی اہم مثالیں ہیں۔

اتنے متنوع اور اہم کام انھوں نے کیسے کر لیے اس کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند جین نے لکھا کہ انھوں نے تحقیقی یادداشتوں کی ڈیڑھ سو فائلیں تیار کر رکھی ہیں۔ حالانکہ تب تک تحقیقی کام کی ابتدا کیے ہوئے انھیں چھ سات سال سے زیادہ کا عرصہ نہیں گذرا تھا۔ انھوں نے اپنا پہلا تحقیقی مضمون 'تذکرہ گلشن بے خار پر ایک نظر (آب حیات کی روشنی میں)' ستمبر ۱۹۷۱ء میں لکھا تھا۔ (۲۲) کالی داس گپتا رضا کی غالب اور غالبیات شناسی ان کی دوسری حیثیتوں پر غالب ہے۔ اس سلسلے میں ان کی یکے بعد دیگرے انیس کتابیں ہیں، جن میں کچھ تصنیف، کچھ تالیف اور کچھ تحقیقی مقدمے کے ساتھ غالب کے مطبوعہ دیوان یا کسی اور کتاب کے عکسی ایڈیشن ہیں۔ کچھ دوسری کتابوں میں غالبیات کے سلسلے کے مضامین شامل ہیں۔ اس سلسلے کی ان کی

پہلی کتاب 'دعائے صباح (۱۹۷۷ء) اور آخری کتاب 'تفہیم غالب کے دوحرف (۱۹۹۹ء)' ہے۔ یہاں ہم ان کی کچھ اہم کتابوں پر بحث کرتے ہوئے غالب شناسی میں ان کے مقام و مرتبے کے تعین کی کوشش کریں گے۔

دعائے صباح (۱۹۷۷ء): یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے منسوب ایک عربی دعا کا منظوم فارسی ترجمہ ہے جو غالب کی زندگی میں ہی ۱۲۸۴ھ میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہو کر نایاب ہو چکا تھا۔ حسن اتفاق سے مطبوعہ مثنوی کی ایک نقل مولانا امتیاز علی خان عرشی کو موصول ہوئی اور انھوں نے اپنی مفید تمہید کے ساتھ اس کو رسالہ نگار لکھنؤ (مئی ۱۹۴۱ء) میں شائع کروادیا۔ بعد میں اس کا ایک مطبوعہ نسخہ سید جمیل الدین مرحوم ممبئی کے کتب خانے میں مولانا فضل اللہ فاروقی کو موصول ہو گیا۔ اور انھوں نے اپنے تعارف کے ساتھ اس کو 'نوائے ادب' ممبئی (اپریل ۱۹۵۰ء) میں شائع کرادیا۔ کالی داس گپتا رضا نے اس مطبوعہ نسخے کا عکسی ایڈیشن دسمبر ۱۹۷۷ء میں شائع کر کے استفادہ کے لیے عام کر دیا۔ انھوں نے سید جمیل الدین مرحوم کا پورا ذخیرۂ غالبیات قیمتاً حاصل کر لیا تھا۔ یہ نایاب نسخہ انھیں اسی ذخیرہ میں ہاتھ لگا تھا۔

لاہور کے مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے ۱۹۶۷ء میں کلیات غالب فارسی جلد اول مرتب کی تھی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ان کے ذخیرۂ غالبیات میں 'دعائے صباح طبع اول کا نسخہ موجود ہے اور اس کلیات میں انھوں نے اسی نسخہ سے مثنوی کا متن نقل کیا ہے۔ گپتا رضا نے اپنے ذخیرۂ غالبیات میں موجود مثنوی کے طبع اول سے متن کا مقابلہ کر کے ثابت کیا کہ فاضل لکھنوی کے پاس جو نسخہ ہے وہ طبع اول نہیں ہے۔ گپتا رضا نے اس کے آخر میں ۷۲ صفحات پر مشتمل افراد، کتب و رسائل مقامات، ادارے اور مطابع کے پانچ اشاریے بھی درج کر دیے ہیں، جن سے اس کی افادیت بڑھ گئی ہے۔

متعلقات غالب (۱۹۷۸ء): یہ مضامین کا مجموعہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ حوالوں اور دلیلوں کے ساتھ یہ مضامین اس انداز سے لکھے گئے ہیں کہ بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ پہلا مضمون 'غزل قدسی اور تضمین غالب' ہے۔ اس کا سبب تحریر یہ ہے کہ سید وزیر الحسن نے ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان 'دلی کے ایک اہم نعتیہ مشاعرے کی تضمین' تھا۔ اس مضمون میں ان کا دعویٰ تھا کہ ملک الشعرا قدسی کی مشہور زمانہ نعت

’’مرحبا سید مکی مدنی العربی‘‘ کے مصرعہ پر ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے ہی دلی میں ایک نعتیہ مشاعرہ ہوا تھا جس میں مشاہیر شعرا نے تضمینیں پڑھی تھیں۔ غالب دوسروں کے مصرعوں پر تضمین نہیں لکھتے تھے۔ مگر نعت گوئی کے لیے انھوں نے اپنا اصول توڑ دیا۔ ان کی تمام تضمینوں کو قاضی محمد عمر نے حدیث قدسی کے نام سے مرتب کیا تھا۔

مضمون لکھے جانے کے ربع صدی بعد یہ کالی داس گپتا رضا کے ہاتھ لگ گیا۔ اور انھوں علمی دفینوں، یادداشتوں اور تذکروں کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ ایس مفروضہ مشاعرہ کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ قاضی محمد عمر بھی حدیث قدسی کے اولین مرتب نہیں ہیں بلکہ اس وقت کے مطبع مصطفائی دہلی کے مالک و مہتمم محمد حسین خان تحسین نے چمن مدح نبی کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی تھی اور اس کے لیے مشاہیر شعرا سے ملاقات کر کے اور بذریعہ خط بھی قدسی کی اس نعتیہ غزل پر تضمینیں لکھوائی تھیں۔ ثبوت کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ غالب کے یہاں تضمین ممنوع نہیں تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس مضمون میں سرقہ کرنے والوں کو بھی بڑی بے باکی سے بے نقاب کیا ہے۔

رضا صاحب کے پاس کتابوں کا جو ذخیرہ تھا اس کا انھوں نے محققانہ استعمال کیا ہے۔ تحقیقی یادداشتوں کے دفتر ان کی دقت نظری کا ثمرہ ہیں۔ مخطوطات و نوادر پر بھی گہری نظر ڈال کر توضیح و تشریح کی ہے۔ اس لیے اس میں کئی دوسرے مضامین بھی شامل ہو گئے ہیں۔ ’’ذکا شاگرد غالب‘‘ ایک ایسا طویل مقالہ ہے جس میں کمیاب موضوع پر معلومات کا ڈھیر لگا دیا ہے۔ ’’غالب بنام سیاح و میر غلام بابا خان‘‘ بھی علمی انکشافات سے پر ہے۔ غالب کے دو غیر مطبوعہ قطعات کو غالبیات میں اضافہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اسی طرح مرزا عباس بیگ کی جو غالب کے خواہرزادہ تھے اور جنھوں نے ’دعائے صباح‘ شائع کی تھی، انھوں نے جو سرگزشت پیش کی ہے وہ حیرت و بصیرت سے بھری ہوئی ہے۔ مختصر یہ کہ غالبیات کے سلسلے کی اگرچہ کتاب کالی داس گپتا رضا کی پہلی تحقیقی کتاب ہے مگر مواد اور حوالوں کے لحاظ سے یہ ایک کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے یہ لکھ کر کہ ’’رضا صاحب نے بہت سی غلط فہمیوں کا پردہ چاک کیا ہے اور بہت سے حقائق کو پہلی بار افشا کیا ہے۔‘‘ (۲۳) اس کتاب کی قدر و قیمت کو واضح کر دیا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ اس کتاب میں جو

کچھ ہے اس کا اندازہ وہی شخص کرسکتا ہے جس نے عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزاری ہو۔

دیوان غالب کامل تاریخی ترتیب سے مطبوعہ ۱۹۸۸ء : کالی داس گپتا رضا نے اردو تحقیق خصوصاً غالبیات میں جو کارنامے انجام دیے ہیں ان کے سبب ان کی حیثیت مستحکم ہوچکی ہے۔ لیکن ان کے جس تحقیقی کام کو ان کے دوسرے تحقیقی کاموں پر فوقیت حاصل ہے وہ 'دیوان غالب کامل تاریخی ترتیب سے' ہے۔ اس کی روشنی میں غالب کی طبعی نشو و نما، فنی و فکری ارتقا اور وقت کے ساتھ ساتھ خیالات میں پیدا ہونے والے تغیر و تبدل کا سراغ ملتا ہے ۔ غالب کے دیوان کے تاریخی ترتیب کے سلسلے میں مفتی انوار الحسن، سید عبداللطیف، شیخ محمد اکرام اور مولانا امتیاز علی عرشی نے جو کوششیں کی تھیں وہ بہت مستحسن ہیں مگر ان تمام قابل ذکر شخصیتوں میں کسی کو بھی غالب کے تمام کلام کو یکجا کر کے تاریخی ترتیب سے شائع کرنے میں مکمل کامیابی نہیں ملی۔ کالی داس گپتا رضا وہ واحد شخص ہیں جنھوں نے یہ مشکل کام اس خوبی سے انجام دیا ہے کہ ابھی تک کسی نے بھی اس پر انگلی نہیں اٹھائی ہے۔

کسی شاعر کے کلام کو تاریخی ترتیب سے شائع کرنے کا مقصد عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس سے شاعر کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملے گی مگر گپتا نے اپنے مقدمے میں ایک دوسری وجہ بھی بتائی ہے:

> ''جب تک غالب کے تمام کلام کا تاریخی ترتیب سے مطالعہ نہ کیا جائے گا ہم نتائج اخذ کرنے میں اکثر ٹھوکر کھاتے رہیں گے۔ میں نے اسی مقصد کو رہنما بنا کر اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ تاریخی ترتیب ہی سے غالب کے سوانحی اور فکری ارتقا کا تجزیہ ہو سکے گا۔'' (۲۴)

اور حقیقت یہ ہے کہ گپتا رضا کے اس نسخے کی اشاعت کے بعد، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے کسی شعر یا غزل کے نتیجۂ فکر کا سنہ کیا ہے، غالب کے کئی اشعار کے بارے میں خوش رنگ افسانوں اور گھڑے ہوئے قصوں اور لطیفوں کی تردید ہو جاتی ہے۔

تاریخی ترتیب سے کلام غالب کی تدوین کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غالب کے غیر متداول اردو اشعار کا زمانۂ فکر تعین کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ توقیت غالب بھی اتنی مکمل ہے کہ اس سے غالب ہی کی نہیں بلکہ ان کے بعض معاصرین کی تاریخیں بھی معلوم ہو جاتی ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند جین کا شمار بھی ماہرین غالبیات میں ہوتا ہے۔ انھوں نے دیوان غالب کامل تاریخی ترتیب سے کا والہانہ استقبال کیا تھا۔ ان کے تبصرے کا ایک حصہ پیش کیا جاتا ہے۔ جس سے اس نسخے کی اہمیت پر مزید روشنی پڑے گی:

> ''انھوں نے ۲۸۔۱۸۲۷ء تک چار ادوار بنائے ہیں جو جملہ گیارہ ادوار کے حصے ہیں۔ ان کا یہ اصول بالکل درست ہے کہ کسی غزل کا ایک شعر بھی کسی قدیم ماخذ میں مل جائے تو پوری غزل اسی دور میں رکھی جائے گی خواہ ترمیم و اضافہ کا عمل کتنی مدت بعد جاری رہا ہو۔ صفحہ ۲۲۔۲۱ پر ایک جدول میں وضاحت سے بیان کیا ہے کہ کس دور میں کل کتنے اشعار لکھے گئے ہیں۔ اور ان میں سے کتنے متداول دیوان میں منتخب ہوئے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں وہ حساب کتاب کے بہت چوکھے ہیں۔'' (۲۵)

انھوں نے یہ کام ۲۱ مآخذ کی بنا پر کیا ہے جن میں سے ۱۳/ان کی ذاتی کتب خانے میں ہے۔ ۸ کے لیے نسخۂ عرشی پر انحصار کیا ہے۔ اس سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی تدوین نسخۂ عرشی کا بدل نہیں بلکہ اس کا تکملہ ہے۔ تدوین متن میں اختلاف نسخ کا دینا ضروری مانا جاتا ہے لیکن رضا صاحب نے نسخۂ عرشی کے متن اور اختلاف نسخ کو پوری طرح سے تسلیم کر لیا ہے اور کر لینا چاہیے تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنے نسخے میں اختلاف نسخ کو تحصیل حاصل سمجھ کر قطع کر دیا ہے۔ ان کی توجہ محض ایک پہلو یعنی تاریخی ترتیب پر مرکوز رہی ہے۔

انھوں نے غالب کے مجموعوں کے تعلق سے مفید اطلاعات بہم پہنچائی ہیں، جو مقدمے کی مختلف فصلوں میں بکھری پڑی ہیں۔ مثلاً اولین شعری تخلیق کو لیجیے۔ میں نے کتاب ''حسن خیال'' کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ رضا صاحب نے مثنوی پتنگ کے لیے اس اولین مآخذ کو بچشم خود دیکھا۔ فارسی شعر ؎ رشتہ در گردنم ۔۔۔ الخ کا مصنف جاننے کے لیے کیا کیا تحقیق و تدقیق نہ کی۔ ن۔ م۔ راشد نے لکھ دیا تھا کہ یہ شعر مولانا روم کا تھا۔ رضا صاحب راتوں کو جاگ کر مثنوی کے جملے دفتر چھان مارے یہ شعر نہ ملا۔

حالی مثنوی پتنگ کو آٹھ نو سال کی تخلیق قرار دیتے ہیں رضا صاحب دس سال کی عمر کی۔ مجھے لگتا ہے کہ اس سے کچھ زیادہ عمر ہی کی ہونی چاہیے۔ ''سررشتۂ آزادگی'' اور ''ہوائے دلبراں'' جیسی فارسی تراکیب، فارسی شعر کی تضمین اور پھر حسن کی طرف جنسی کشش ع

گورے پنڈے پر نہ کر ان کی نظر

نو دس سال کے لڑکے سے متوقع نہیں۔ عمدۂ منتخبہ اور عیار الشعرا کے سلسلے میں رضا صاحب نے کسی ثقہ راوی کا قول نقل کیا ہے کہ خوب چند ذکا نواب سرور کا ملازم تھا اور عیار الشعرا عمدۂ منتخبہ کا چربہ ہے۔ وہ اس ثقہ راوی کا نام ظاہر کر دیتے تو ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا۔ بہر حال انھوں نے ثقہ راوی کے غیر ثقہ بیان کی شافی تردید کر دی ہے۔(۲۶)

کالی داس گپتا رضا صاحب نے دیوان غالب کامل کی تاریخی ترتیب سے جو شاندار کام تنہا انجام دیا ہے وہ اداروں کے کرنے کا تھا۔ اس کی پذیرائی ہونی ہی چاہیے تھی اور ہوئی بھی۔ رشید حسن خان نے اس کو بجا طور پر تدوین کی روایت میں ایک اضافہ کہا ہے۔ حرف نامعتبر کے عنوان سے انھوں نے جن شعروں اور مصرعوں کی نشان دہی کرتے ہوئے ان کے غالب کے نتیجۂ فکر ہونے میں تامل کا اظہار کیا ہے۔ وہ مضمون بھی اس نسخے کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتا ہے۔ یعنی مکمل کلام کے تاریخی ترتیب سے جمع کر دیے جانے کے علاوہ بھی کئی اعتبار سے اس نسخے کو اختصاص حاصل ہے۔ اس کے بارے میں یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ اردو تدوین کی تاریخ میں کسی کے کلام کو اس سے پہلے اس طرح مرتب نہیں کیا گیا تھا۔ کالی داس گپتا رضا وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے یہ کام تنہا انجام دیا ہے اور وہ بھی کمال خوبی کے ساتھ۔ کسی مسئلے میں انھوں نے جو بھی تحقیقی فیصلے کیے ہیں ان کو مضبوط دلائل کی تائید و توثیق حاصل ہے۔

غالب درون خانہ (۱۹۹۸ء): اس کتاب کے نام میں ''محقق سوانح'' بھی شامل ہے مگر صفحہ ۸ر پر مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ یہ کتاب غالب کی باقاعدہ روداد نہیں ہے۔ شاید اس لیے کہ اس کتاب میں شامل مضامین درون خانہ ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں سوانح کے تمام اجزا شامل نہیں ہیں۔ مثلاً کلکتہ میں قتیل کے طرف داروں سے معرکہ، دلی میں قمار بازی اور قید، معاشی پریشانی، دہلی اور رام پور کے درباروں

سے وابستگی، ہم عصر شعرا سے مراسم، قاطع برہان پر بحث اور غدر کی صعوبتوں کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اچھا ہوا کہ گپتا رضا نے اپنے پیش لفظ کا عنوان ''خانہ باغ'' رکھا ہے۔ یہاں سے انھوں نے غالب کے درون خانہ تک تاک جھانک کی ہے۔ اس سے غالب کے خاندان، نسب، تاریخ ولادت، مذہب، عارف کی فرزندی، ملازم خاص کلو داروغہ، خواہر زادے مرزا عباس بیگ اور نواب احمد بخش خان کے بارے میں بہت اہم معلومات سامنے آتی ہیں۔ غالب کے خاندان کے بارے میں گپتا رضا نے غالب ہی کے عرضی دعوے مورخہ ۲۸/ اپریل ۱۸۲۸ء کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> ''غالب کے چچا نصراللہ بیگ خان کے والد غالب کے دادا قوقان بیگ خان۔ نصراللہ بیگ خان کو مرہٹوں کی سفارش پر ۲۲/فروری ۱۷۹۹ء کو شاہ عالم نے ہفت ہزاری کا منصب عطا کیا۔ ۱۸۰۳ء تک سندھیا کی ماتحتی کے دوران کروڑوں روپیہ کمایا اور انگریزوں سے ساز باز کر کے آگرہ کا قلعہ پیش کرتے ہوئے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اس کے عوض ان کو آگرہ کے دو پرگنے سونک اور سونسا جاگیر میں ملے تھے۔ حین حیات جاگیر تھی۔ جس کی تقرری کی تاریخ ۲۱/ستمبر ۱۸۰۵ء تھی۔ چچا ۱۸۰۵ء میں ہاتھی سے گر کر مرگئے اور جاگیر واپس چلی۔ غالب کی عمر نو برس کی تھی۔ غالب کے والد ۱۸۰۲ء میں انتقال کر گئے۔ ان کے علاوہ دو بھائی اور تھے۔''(۲۷)

غالب نے پنج آہنگ کے خط میں اور دوسری کئی تحریروں میں اپنے خاندان کے سلسلے میں لکھا ہے کہ وہ سلجوقی تھا اور ان کا نسب افراسیاب و پشنگ سے ملتا ہے۔ غلام رسول مہر اور قاضی عبدالودود نے غالب کے دعوے کو غلط کہا ہے مگر گپتا رضا نے اس سلسلے میں کوئی رائے نہیں دی ہے۔ البتہ انھوں نے غالب کے دادا، والد، چچا اور پھوپھیوں کے متعلق جو معلومات بہم پہنچائی ہیں وہ ان کی تحقیقی کاوشوں کی آئینہ دار ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ غالب اپنی بابت بڑی لن ترانی سے کام لیا کرتے تھے۔

اسی طرح غالب کے خط بنام منشی شیونرائن (۱۹/اکتوبر ۱۸۵۸ء) اور ماہرین غالبیات کی تصانیف

سے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ غالب کی والدہ کا نام عزت النساء تھا، جنھوں نے سولہ سال کی عمر میں شادی کی۔ ۸؍ سال شوہر کے ساتھ اور ۳۸؍ سال بیوگی میں گزارے۔ دونوں بیٹے غالب اور یوسف دلی جا بسے تھے مگر وہ آگرہ میں ہی رہیں۔ ان کی املاک کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اور مقروض ہونے کا بھی۔ غالب کے والد عبداللہ بیگ الور کی فوج سے وابستہ تھے اور ۱۸۰۲ء میں لڑتے ہوئے مار دیئے گئے۔ ان کا مزار راج گڑھ میں ہے۔ غالب کی پیدایش کے سلسلے میں جو اختلاف رائے ہے اس کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے گپتا رضا نے مستحسن استدراک پیش کیا ہے۔ اسی طرح غالب کے نام کے سلسلہ میں جملہ دلائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ غالب اپنا نام لکھنے میں احتیاط نہیں برتتے تھے، بہر حال پورا نام اسداللہ بیگ خان ہی تھا۔

غالب عمر بھر وقتاً فوقتاً اپنے شیعہ، سنی، تفضیلی، نیم مسلمان اور مطلقاً کافر ہونے کا اعلان کرتے رہے مگر ان کا رویہ مذہبی رواداری پر مبنی تھا۔ انھوں نے عملاً مذہب و مسلک سے کوئی خاص سروکار نہیں رکھا تھا۔ مگر گپتا رضا نے غالب کے شیعی ہونے کا اعتراف کرنے کے ساتھ غالب کا یہ شعر

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ خالص ہندوانہ تصور ہے۔ لیلا کا تصور ہندو فلسفے کا جزو ہے۔ یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری تھا کہ غالب نے یہ خیال تصوف کے توسط سے حاصل کیا ہوگا، جس میں احد، احدیت اور واحدیت کے تصورات ویدانت سے لیے گئے ہیں۔ احد سے وہی مفہوم لیا جاتا ہے جو برہمہ کا ہے۔ یہی ذات وصفات سے بالاتر حقیقت ہے۔ احدیت اور سنکلپ کا بھی ایک ہی مفہوم ہے۔ اس کو تصوف میں نور محمد یہ کہتے ہیں اور ویدانت میں پرکاش یعنی نور جس سے برہمہ مراد ہے۔

امراؤ بیگم سے غالب کی شادی ۱۹؍ اگست ۱۸۱۰ء کو ہوئی۔ غالب کے خسر یعنی امراؤ بیگم کے والد الٰہی بخش خان معروف تھے۔ غالب دو تین سال آگرہ میں رہ کر مستقل طور پر دلی چلے آئے۔ گپتا رضا نے خطوط پنج آہنگ، مثنوی چراغ دیر وغیرہ کے حوالوں سے غالب کی ازدواجی زندگی پر بھی بھرپور روشنی ڈالی ہے اور بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔

امراؤ بیگم کے متعلق جتنے بھی خطوط مطالعے میں آئے تھے ان سب کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔ معروف کی وفات ۱۸۲۶ء میں ہوئی۔ ۱۸۱۰ء سے لے کر ۱۸۲۶ء تک غالب عیش کوش اور غیر محتاط زندگی گزارتے رہے۔ امراؤ بیگم کے ساتھ بچے ہوئے مگر یکے بعد دیگرے لقمۂ اجل بنتے گئے۔ امراؤ بیگم کے والد الٰہی بخش خان معروف کی بہن بنیادی بیگم کا بیٹا عارف ۱۸۵۲ء میں انتقال کر گیا۔ عارف کی وفات کے بعد ان کے دو بچے غالب کے یہاں آ گئے تو امراؤ بیگم کا وقت ان کی دیکھ بھال کرنے میں گزرنے لگا۔ گویا ان کی زندگی کا سونا پن کسی حد تک کم ہو گیا۔

غالب اور امراؤ بیگم میں ان کے ان بن کے بارے میں بہت سے افسانے گھڑے گئے ہیں مگر گپتا رضا نے بیان کیا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان کبھی کبھی معمولی کھٹ پٹ ضرور ہو جایا کرتی تھی جو تقریباً سبھی گھروں میں ہوتی ہے لیکن کسی ایسے واقعے کا پتہ نہیں چلتا جس کو خانہ جنگی سے موسوم کیا جا سکے۔

گپتا رضا نے مولوی کریم الدین کی اس غلطی کی نشان دہی کی ہے کہ عارف غالب کے خواہر زادے تھے۔ عارف امراؤ بیگم کے خواہر زادے (بھانجے) تھے۔ گپتا رضا نے اس سلسلہ کی جملہ تحریروں کو پیش کر کے ان کی نفی کی ہے جو عارف کی فرزندیٔ غالب پر دلالت کرتی ہیں۔ ان کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ عارف کا انتقال ۱۸۵۲ء میں ہوا اور بیگم عارف بھی شوہر کے چند ماہ بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ امراؤ بیگم (زوجۂ غالب) اور بنیادی بیگم سگی بہنیں تھیں۔ عارف کے دو بچے تھے۔ ایک بچہ امراؤ بیگم اپنے یہاں لے آئیں اور دوسرا لڑکا اپنی دادی یعنی خواہر امراؤ بیگم (بنیادی بیگم) کے ساتھ رہنے لگا۔ بنیادی بیگم کے انتقال کر جانے کے بعد دوسرا بچہ بھی غالب کے یہاں رہنے لگا۔ اس موضوع پر جو حوالے پیش کیے گئے ہیں وہ سب کے سب مستند ہیں۔ غالب عارف کو اپنا بیٹا سمجھتے تھے مگر عارف باقاعدہ متبنیٰ نہیں تھے۔

اس کتاب میں غالب کے ملازم خاص کلو داروغہ کی زندگی پر بھی بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ زیادہ تر اطلاعات خطوط غالب سے حاصل کی گئی ہیں۔ کلو نے عمر دراز پائی اور وہ ۹۰ سال کی عمر میں فوت ہوا۔ غالب کے انتقال کے بعد بھی وہ امراؤ بیگم کی خدمت میں رہا۔ امراؤ بیگم کی وفات کے بعد نیر درخشاں کی ملازمت میں آ گیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بگّا بیگم نے بیوہ ہو جانے کے بعد سے ضیاء الدین احمد خان نیر

درخشاں کے یہاں بیوگی کے ایام گزارے۔کلام غالب سے کلو کا کوئی تعلق نہ سہی مگر غالب کی نجی زندگی سے اس کا گہرا تعلق تھا۔اس لیے اس کے حالات کی چھان بین میں انھوں نے بڑی محنت کی ہے۔ یہ مضمون ان کی دوسری کتابوں میں بھی شامل ہے۔

اسی طرح رضا صاحب نے اس کتاب میں غالب کے خسر نواب مرزا الٰہی بخش خان معروف کے حالات کا ذکر بھی مستند حوالوں کے ساتھ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کا انتقال ۱۸۲۶ء میں ہوا۔ ولادت ۱۷۶۶ء کی اواخر میں ہوئی ہوگی۔ دیوان معروف (نظامی پریس بدایوں ۱۸۳۵ء) کے مقدمے میں کہا گیا ہے کہ انتقال کے وقت ان کی عمر اسی سال سے تجاوز کر چکی تھی۔انھوں نے بہ دقت نظر معروف کے متعلقات تذکرۂ ہندی از مصحفی، عمدۂ منتخبہ از اعظم الدولہ سرور، مجموعۂ نغز از قدرت اللہ قاسم اور خطوط غالب سے اخذ کر کے پیش کیے ہیں۔معروف کی شاعری کے نمونے بھی دیئے گئے ہیں۔معروف ذوق سے بھی کچھ اصلاح لیتے تھے۔ان کے مورث اعلیٰ بلخ سے ۱۷۵۲ء کے لگ بھگ ہندوستان آئے۔تین بھائی تھے۔مرزا محمد بیگ صوبے دار اٹک کے مہمان رہے اور صوبے دار نے اپنی لڑکی کی شادی عارف جان سے کر کے ان کو اپنی فرزندی میں لے لیا تھا۔عارف جان عہد شاہ عالم (۱۷۵۹ـ۱۸۰۲ء) میں دلی آگئے۔عارف جان کے چار بیٹے ہوئے۔ نبی بخش خان، الٰہی بخش خان، احمد بخش خان اور محمد علی خان۔الٰہی بخش خان ہی معروف تھے۔ انہی کی بیٹی امراؤ بیگم غالب ے عقد میں آئیں۔معروف کے متعلق بشمول خاندانی شجرہ جو کچھ بھی دستیاب ہو سکا ہے۔وہ سب کچھ گپتا رضا نے اس کتاب میں شامل کر لیا ہے۔

نواب احمد بخش خان کا ذکر انھوں نے شاید اس لیے ضروری سمجھا کہ وہ غالب کے خسر الٰہی بخش خان کے حقیقی بھائی تھے۔تاریخی اعتبار سے نواب موصوف کے جملہ حالات میں انگریزوں، نام نہاد مغل شہنشاہ اور راجہ رام موہن رائے کے تذکرے بھی آگئے ہیں۔ بادشاہِ وقت ریذیڈنٹ کے دست نگر ہو چکے تھے۔غالب کے عہد کا تاریخی پس منظر مستند حوالوں سے تیار کیا گیا ہے۔استدراک کے تحت بڑے کام کی باتوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔نواب صاحب لارڈ مٹکاف کے بڑے مداح تھے۔دوسرے انگریزوں کے بھی وہ عمر بھر منظور نظر بنے رہے۔

مرزا افضل بیگ غالب کے بہنوئی اکبر بیگ کے چھوٹے بھائی تھے جو انگریزی دربار میں سفیر مقرر ہو جانے پر ۱۸۲۷ء میں کلکتہ چلے گئے تھے۔ اس دوران اکبر شاہ ثانی مغل شہنشاہ تھے اور ان کے سب سے بڑے بیٹے بہادر شاہ ظفر تھے مگر شہنشاہ بڑے بیٹے کو نظر انداز کر کے مرزا جہانگیر کو ولی عہد بنانا چاہتے تھے۔ غالب کو یہ شبہ ہو گیا تھا کہ افضل بیگ ان کے خلاف ہتک آمیز اور ضرر رساں باتیں پھیلا کر ان کی پنشن کی بحالی کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کرنا چاہتے تھے۔ مرزا افضل بیگ کے نام غالب کا کوئی خط ہنوز دستیاب نہیں ہوا ہے۔ لیکن تاریخی واقعات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں رہتا کہ اس زمانہ میں سازشیں کتنی عام تھیں۔

آب حیات میں ترجمۂ غالب مع حواشی ان کی ایک مستقل کتاب ہے جو غالب درون خانہ میں ضم کر دی گئی ہے۔ آخر میں صفحہ ۲۷۲ سے ۲۹۵ تک یعنی پورے تیئس صفحات پر محیط توقیعت غالب قابلِ قدر تحقیقی کاوش ہے۔ اس میں جزئیاتی واقعات کی تاریخیں طے کرنے میں متعدد ذخیروں کو دیکھنا پڑا ہوگا جو غیر معمولی ذہن کا حامل شخص ہی کرسکتا ہے۔ اس میں بعض ایسے اندراجات بھی آگئے ہیں جو براہِ راست غالب سے متعلق نہیں ہیں۔ مثلاً مہاراجہ رنجیت سنگھ، ممنون، آتش، ناسخ، شاہ نصیر، مومن، شیفتہ، آغا جان عیش وغیرہ کے سنہ وفات یا سر جان لارنس کا گورنر جنرل مقرر کیا جانا وغیرہ۔ لیکن ان سے غالب کے عہد کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اشاریے میں اندراجات حروف تہجی کے اعتبار سے کیے گئے ہیں۔

غالب درون خانہ کالی داس گپتا رضا کی ایک بہت اہم کتاب ہے۔ اگر ان کی دوسری کتابیں نہ بھی شائع ہوئی ہوتیں اور انھوں نے صرف ''دیوان غالب کامل تاریخی ترتیب سے'' اور ''غالب درون خانہ'' ہی تصنیف و تالیف کی ہوتیں تب بھی انھیں غالبیات کے ایک ایسے محقق کے طور پر تسلیم کرلیا جاتا جو غالب کی سوانح، کلام اور عہد غالب کی جزئیات پر سند کی حیثیت رکھتا۔

حواشی:

۱۔حنیف نقوی، تحقیق و تعارف، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۳، ص ۸۸۔۲۸۷

۲۔رشید حسن خان، ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ، ۲۰۰۳، ص ۹

۳۔ایضاً، ص ۹

۴۔ایضاً، ص ۴۵

۵۔محمد آفتاب شاہ و جاوید رحمانی (مرتبین)، رشید حسن خان: کچھ یادیں کچھ جائزے، دربھنگہ بہار، ۲۰۰۸، ص ۱۹۔۸۱

۶۔محمد آفتاب شاہ و جاوید رحمانی (مرتبین)، رشید حسن خان: کچھ یادیں کچھ جائزے، ص ۱۱۔۲۱۰

۷۔ایضاً، ص ۴۷

۸۔تنویر احمد علوی (مرتبہ)، آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق، اردو اکادمی، دہلی ۲۰۰۱، ص ۱۵

۹۔ایضاً، ص ۱۶

۱۰۔تنویر احمد علوی (مرتبہ)، کلیات ذوق، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۰، ص ۱۱

۱۱۔ایضاً، ص ۶۷۔۶۸

۱۲۔تنویر احمد علوی (مرتبہ)، انتخاب دواوین، شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی، دہلی، ۱۹۸۷، ص ۸۔۷

۱۳۔ایضاً، ص ۵۶

۱۴۔ایضاً، ص ۱۱۔۱۰

۱۴۔ظ۔انصاری، غالب کے خطوط پر خلیق انجم کا قابل قدر کام، مشمولہ (کتاب نما) جولائی ۱۹۹۵، دہلی، ص ۱۲۲

۱۵۔شریف الحسن نقوی، خلیق انجم اور آثار الصنادید مشمولہ (کتاب نما) جولائی ۱۹۹۵، دہلی، ص ۵۲۔۵۱

۱۶۔خلیق انجم، مرزا محمد رفیع سودا، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۳، ص ۵۷۔۴۷

۱۷۔ خلیق انجم، مرزا محمد رفیع سودا، ص ۱۵۵

۱۸۔ خلیق انجم، مرزا محمد رفیع سودا، ص ۲۳۲۔۲۳۱

۱۹۔ خلیق انجم۔ متنی تنقید، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۲۰۰۶، ص ۱۲

۲۰۔ افتخار امام صدیقی، مشمولہ ماہنامہ شاعر بمبئی، جلد: ۵۴، شمارہ: ۹، ۱۹۸۳، ص ۵۰۔۵۹

۲۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی، محقق بے بدل، شاعر خوش فکر، یارِ وضع دار، سہ ماہی 'اسباق'، پونہ، رضا نمبر، ص ۴۳۔

۲۲۔ بحوالہ شمیم طارق، کالی داس گپتا رضا، ساہتیہ اکیڈمی، دہلی، ۲۰۰۴

۲۳۔ ایضاً، ص ۴۴

۲۴۔ کالی داس گپتا رضا، دیوان کامل تاریخی ترتیب سے، ساکار پبلشر، بمبئی، ۱۹۹۵، ص ۷۶

۲۵۔ شین۔ کاف۔ نظام، غالبیات اور گپتا رضا، بمبئی ۱۹۹۹، ص ۱۲

۲۶۔ ایضاً، ص ۵۵

۲۷۔ شمیم طارق، کالی داس گپتا رضا، ص ۶۱۔۶۰

باب چہارم

چند غیر معروف محققین

(نجیب اشرف ندوی، حفیظ الرحمان واصف دہلوی، عبدالرزاق قریشی)

چند غیر معروف محققین

سید نجیب اشرف ندوی:

سید نجیب اشرف ندوی یکم نومبر ۱۹۰۰ء کو آرموری ضلع چاندہ (مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے اور پانچ ستمبر ۱۹۶۸ء کو بمبئی میں انتقال کیا۔ انھوں نے لگ بھگ اڑسٹھ برس کی عمر پائی اور جیتے جی کبھی اپنے والد صاحب کے تبادلے کے سبب تو کبھی ملازمت کی وجہ سے مختلف شہروں میں مقیم رہے مگر ان کا آبائی وطن ریاست بہار کا ایک مردم خیز قصبہ 'دیسنہ' تھا۔ ان کے والد کا نام سید مبین تھا۔ سید مبین نے کلکتہ میڈیکل اسکول سے فراغت کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کر لی اور ۱۸۲۵ء میں سول سرجن کے عہدے سے سبک دوش ہونے کے بعد رائے پور (مدھیہ پردیش) میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

ڈاکٹر سید مبین کو سات اولادیں تھیں۔ سید نجیب اشرف ان میں سب سے بڑے تھے۔ انھوں نے اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے گھر پر ہی حاصل کی۔ گھر ہی پر ایک مدرس سے مراٹھی زبان سیکھی اور پھر مراٹھی کا ورنیکلر امتحان بھی پاس کیا۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۳ء کے درمیان تقریباً ساڑھے تین سال ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے ندوۃ العلماء سے فراغت نہیں حاصل کی تھی۔ ندوہ کے ابتدائی درجات میں ساڑھے تین سال گزارنے کے سبب لفظ ندوی ان کے نام کے ساتھ اس طرح پیوست ہو گیا کہ نام کا حصہ بن کر رہ گیا۔ ندوۃ العلماء میں داخلے کے وقت ان کی عمر آٹھ نو سال سے زیادہ نہیں تھی۔ یہاں سید سلیمان ندوی پہلے سے موجود تھے جو رشتے میں ان کے بھائی ہوتے تھے۔ یہاں انھیں سید سلیمان ندوی سے استفادے کے علاوہ علامہ شبلی نعمانی سے 'بلوغ المرام' پڑھنے کا موقع بھی ملا۔

۱۹۱۳ء میں علامہ شبلی ندوہ سے مستعفی ہوئے اور سید سلیمان ندوی بھی ندوہ چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے تو سید نجیب اشرف ندوی بھی ندوہ چھوڑ کر پٹنہ چلے آئے۔ یہاں ان کے والد نے ان کا داخلہ ایک انگریزی اسکول میں کر دیا۔ ۱۹۱۷ء میں پٹنہ یونی ورسٹی سے میٹرک پاس کیا اور وظیفے کے مستحق ٹھہرے۔ اس کے بعد پٹنہ کالج

میں داخل ہوئے اور ۱۹۱۹ء میں پٹنہ یونی ورسٹی سے ہی انٹرمیڈیٹ فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا اور وظیفہ پانے کے حقدار ٹھہرے۔ ۱۹۲۰ء میں جب ہندوستان میں سیاسی تحریکوں کا زور بڑھا تو نجیب اشرف ندوی پٹنہ کالج میں بی۔اے۔ کے دوسرے سال میں زیر تعلیم تھے۔ خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں سے متاثر ہوکر انھوں نے کالج چھوڑ دیا۔ ان کی سیاست میں اس دلچسپی کا ذکر ان کے شاگرد عبدالرزاق قریشی اس طرح کرتے ہیں:

> ''۱۹۲۰ء میں جب وہ سینئر بی۔اے۔ میں تھے۔ان کی تعلیم کا سلسلہ عارضی طور پر منقطع ہوگیا۔ یہ وہ سال ہے جس میں ہندوستان میں پہلے تحریک خلافت اور پھر تحریک ترک موالات شروع ہوئی۔ ملک میں ایک طوفان سا آ گیا۔ حکومت خطابات واپس کیے جانے لگے۔ سرکاری ملازمتیں ترک ہونے لگیں۔ عدالتوں، کونسلوں اور انگریزی درس گاہوں کا بائیکاٹ ہونے لگا۔ نوجوان نجیب اشرف نے بھی تعلیم ترک کردی اور ان تحریکوں میں حصہ لینے لگے۔ اب ان کے جسم پر انگریزی سوٹ کے بدلے کھدر کا کرتا اور کھدر کا پاجامہ تھا اور بغل میں خلافت کا جھولا۔ اس زمانے میں ان کے چہرے پر داڑھی تھی اور مولانا نجیب اشرف ندوی کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ دو تین سال بعد یہ تحریکیں سرد پڑ گئیں تو پھر ان کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔''(۱)

جب انھیں دوبارہ تعلیم کی تکمیل کا خیال آیا تو کالج کے انگریز دوست ذمہ داران کے داخلے کے لیے کچھ شرائط عائد کرنی چاہی جو ندوی صاحب کو قبول نہ ہوئی اور وہ کلکتہ چلے آئے۔ یہاں وہ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۶ء تک قیام پذیر رہے۔ یہاں انھوں نے ۱۹۲۴ء میں تاریخ کے مضمون میں اول نمبر سے بی۔اے۔ کا امتحان پاس کیا۔ کلکتہ یونی ورسٹی ہی سے انھوں نے ۱۹۲۶ء میں فارسی زبان میں ایم۔اے۔ کا امتحان بھی امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا اور طلائی تمغہ کے ساتھ دوسو روپئے کی کتابیں انعام میں ملیں۔ کلکتہ میں ہی انھیں اپنے استاد سر جدوناتھ سرکار کا ''عالم گیریات'' پر وہ علمی ذخیرہ دیکھنے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ جو

عہد مغلیہ پر بہترین کتب خانہ تھا۔

۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۱ء کے نصف اول تک تقریباً دس سال انھوں نے دارالمصنفین اعظم گڑھ کے رفیق فیلو کی حیثیت سے علمی و ادبی خدمات میں گزارے (اس عرصے میں ان کا قیام کلکتہ بھی شامل ہے۔) ۱۹۳۱ء کے اواخر سے ۱۹۶۵ء تک وہ اسمٰعیل یوسف کالج بمبئی میں اردو کے ہر دل عزیز پروفیسر کے طور پر کام کرتے رہے۔ کالج سے سبک دوشی کے بعد انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے اور تادم مرگ ۱۹۶۸ء تک اس ادارے کے ڈائریکٹر رہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے ترجمان 'نوائے ادب' کی ادارت کی ذمہ داری بھی بہ حسن وخوبی انجام دیتے رہے۔

مجموعی اعتبار سے سید نجیب اشرف ندوی نے ساری زندگی علم و ادب کی خدمت میں بسر کی۔ انھوں نے اردو زبان و ادب اور تاریخ کے جس پہلو پر بھی قلم اٹھایا اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔ ان کی نگارشات کی فہرست بھی کافی طویل ہے جنھیں سہولت کے پیش نظر، تصنیف، تراجم اور تنقیدی، تحقیقی اور علمی مضامین کے زمروں میں رکھا جاسکتا ہے۔

سید نجیب اشرف ندوی کی تصنیفی زندگی میں صرف تین کتابیں منظر عام پر آئیں۔ 'مقدمہ رقعات عالم گیر' اور 'رقعات عالم گیر (جلد اول)' دارالمصنفین اعظم گڑھ کی رفاقت کے زمانے کی یادگار ہیں۔ 'لغات گجری' آخری زمانے کا علمی کارنامہ ہے جو انھوں نے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوت ممبئی کے ڈائریکٹر کے عہدے پر کام کرتے ہوئے مکمل کی۔ ان تینوں کتابوں میں پہلی دو کتابوں کا تعلق تاریخ سے ہے جب کہ تیسری کتاب کا تعلق لغت و لسانیات اور زبان و ادب کی تاریخ سے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں تاریخ سے خصوصی شغف تھا۔ چاہے اس کا تعلق انسان سے ہو یا اس کی زبان و ادب سے۔ ہم یہاں سب سے پہلے ان کی پہلی کتاب مقدمہ رقعات عالم گیر کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

مقدمہ رقعات عالم گیر: یہ کتاب ۴۸۷ صفحات (کمپیوٹرائزڈ ایڈیشن ۲۰۱۲ء ۴۸۱ صفحات) پر مشتمل ایک ایسی کتاب ہے جس میں پہلے اورنگ زیب کے مجموعۂ رقعات و مراسلات پر فاضلانہ تبصرہ اور پھر اسلام میں فن انشا اور شاہانہ مراسلات کی اجمالی تاریخ کے ساتھ ہندوستان کے صیغۂ انشا کا مفصل حال، انشا کے

احوال اور خاص عالم گیر کی انشا کی تحقیق کی گئی ہے۔اس میں عالم گیر کی تاریخ کے ماخذ اور اس کی پیدائش سے لے کر بردرانہ جنگ کے حالات و واقعات پر بھی اس کے خطوط و رقعات کی روشنی میں تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے۔مقدمۂ کتاب کے علاوہ یہ کتاب آٹھ ابواب پر منقسم ہے۔

مقدمہ رقعات عالم گیر حقیقت میں رقعات عالم گیر کی ان جلدوں کا مقدمہ ہے جو آئندہ اشاعت پذیر ہونے والی تھی لیکن اس مقدمے کا مقدمہ بھی ۱۷۱ صفحات پر پھیلا ہوا ہے جو بڑی اہمیت کا حامل ہے۔اس کی ترتیب میں ندوی صاحب نے ۴۵ رکتابوں سے استفادہ کیا ہے اور فن انشا کی اجمالی تاریخ، مکاتیب اورنگ زیب اور سیرت اورنگ زیب کے ماخذ کے سلسلے میں تین سرخیوں کے تحت جو معلومات فراہم کی ہیں ان کی قدر و قیمت یا اولیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔

ندوی صاحب نے اس کتاب میں تحقیق کے معیار و مزاج کے ساتھ تحریر کی شگفتگی کا بھی خاص خیال رکھا ہے۔شاید انھیں اس بات کا احساس تھا کہ آج کا ترقی یافتہ ادبی ذوق کس قسم کی زبان اور طرز استدلال کا متقاضی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کتاب میں انھوں نے خطیبانہ انداز بیان اور ہیرو پرستی کے جذبے سے تھوڑی سرشاری سے بھی کام لیا ہے اس کے باوجود 'مقدمہ رقعات عالم گیر' میں انھوں نے جو محاکمے کیے ہیں وہ مدلل اور مضبوط ہیں۔اورنگ زیب کی شہزادگی کے زمانے کی سرگرمیوں کی تفصیلات بھی انھوں نے جس مورخانہ بصیرت اور محققانہ ژرف نگاہی سے پیش کیے۔ان سے یہ کتاب اورنگ زیب کے دور کی ایسی مستند تاریخ بن گئی ہے جسے خود اورنگ زیب کے رقعات کی روشنی میں ترتیب دیا گیا ہے۔اس کتاب کے مستند و معتبر ہونے کی ایک دلیل تو یہی ہے کہ اورنگ زیب پر لکھنے والا ہر مورخ چاہے اس کا کسی بھی مذہب سے تعلق ہو، اس کتاب سے استفادہ کرنا اور حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ سر جدوناتھ سرکار جیسے مورخ نے بھی اس کی تعریف کی ہے جو پانچ جلدیں لکھ کر اورنگ زیب کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر کی ترویج کر چکے تھے۔سید نجیب اشرف ندوی سر جدوناتھ کے شاگرد تھے اور انھوں نے اپنے استاد ہی کے ذخیرۂ کتب سے استفادہ کر کے ان کے نقطۂ نظر کو مسترد کر دیا تھا۔اس لیے استاد کا اپنے شاگرد کے کام کی دل کھول کر تعریف کرنا علمی دنیا کا اہم واقعہ ہے۔سر جدوناتھ سرکار کے لفظوں میں:

''اورنگ زیب کی شخصیت اور فن پر یوں تو بہت سے مورخین نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔لیکن نجیب اشرف ندوی کی کتاب مقدمہ رقعات عالم گیر اپنی بعض خوبیوں کی وجہ سے ان سب سے اہم ہے۔ اور اس کے لیے نجیب اشرف ندوی قابل مبارکباد ہیں۔'' (۲)

مجموعی طور پر مقدمہ رقعات عالم گیر سید نجیب اشرف ندوی کی نہایت اہم اور معرکتہ الآرا کتاب ہے۔ وقت کے ساتھ اس کی اہمیت وافادیت میں کمی نہیں ہوگی، اس کتاب میں فنِ انشا، اصول اور اس کی اجمالی تاریخ کے سلسلے میں جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں وہ آج بھی قدر و قیمت کی حامل ہیں اور پڑھنے والوں کو تازہ معلومات فراہم کرتی ہیں۔فن انشا سے متعلق جن کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ اس موضوع پر تحقیق کرنے والوں کے لیے چراغ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۶۲ صفحات میں اورنگ زیب کی مکتوب نگاری کی جو خصوصیات بتائی گئی ہیں ان پر ابھی تک حرف گیری نہیں کی جاسکی ہے۔خود سیرت اورنگ زیب کو جس مورخانہ بصیرت اور ژرف نگاہی کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔اس طرز اور معیار کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ قدرت نے سید نجیب اشرف ندوی کو تاریخ نگاری کا خاص ملکہ عطا کیا تھا۔

اسی طرح دیگر شہزادوں اور شہزادیوں کی سیرت اور ان کی سرگرمیوں کی تفصیلات کو جس محققانہ بصیرت کے ساتھ مستند مواد اور ماخذ کی بنیاد پر پیش کیا گیا ہے۔ وہ ہندوستان میں مغلوں کی تاریخ کا بہت قیمتی سرمایہ ہے۔مقدمہ رقعات عالمگیر کو شاہجہاں کے آخری زمانے کی مستند تاریخ کہا جا سکتا ہے جس میں اسی دور کے سارے حالات وواقعات آئینہ ہوگئے ہیں۔اس کے تاریخی وتحقیقی استناد کا یہ حال ہے کہ بیرون ممالک کے پروفیسران اس سے استفادہ کے لیے بے چین نظر آتے ہیں۔اس کی بہت سی کاپیاں امریکہ، روس اور دیگر مغربی ممالک کی یونی ورسٹیوں اور لائبریریوں میں موجود ہونے کے باوجود اکثر مذکورہ ممالک سے اس کتاب کی مانگ کے خط دارالمصنفین میں آتے رہتے ہیں۔مقدمہ رقعات عالم گیر ایک تحقیقی اور تاریخی کارنامہ ہونے کے باوجود شگفتگی سے پر ہے۔اس کا اسلوب نکھرا ہوا اور شگفتہ ہے۔

عہد مغلیہ میں خطوط کے اقسام وغیرہ کی صراحت کے بعد اورنگ زیب عالم گیر کی مکاتیب نگاری اور انشا پردازی پر ندوی صاحب نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جو باسٹھ صفحات پر محیط ہے۔اس میں اورنگ

زیب کی فن خطوط نگاری سے کامل واقفیت، زبان و بیان پر قدرت، خطوط کی ہمہ گیری، حفظ مراتب کا خیال، اظہار جذبات کی اعلیٰ صلاحیت، مقامات کے ساتھ بیرونی و خارجی حالات سے اس کی گہری واقفیت اور ان کے مناسب اظہار، عمارتوں کی تفصیل، جنگ کے نقشے اور حالات جنگ کے بیانات، نیز موسم کے حال اور باغ کے سماں کی منظر کشی کی مثالیں پیش کرتے ہوئے انھوں نے واضح کیا ہے کہ اورنگ زیب عالم و فاضل ہی نہیں، بہترین انشا پرداز بھی تھا۔ مختلف علوم وفنون اور زبان و بیان کے ساتھ اسے مکتوب نگاری کے فن اور تکنیک پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔

اصل کتاب میں نجیب اشرف ندوی نے جہاں اورنگ زیب کی سیرت کا حال لکھا ہے وہیں داراشکوہ کے خصائل وطینت کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اور اس کے علمی درجہ کا اعتراف کیا ہے۔ 'داراشکوہ کا علمی درجہ' کے تحت اس کی علمی استعداد، شاعری، انشاپردازی اور حسن خط کا حال لکھتے ہوئے عقائد کے سلسلے میں اس کی تصانیف 'حسنات العارفین'، 'سفینۃ الاولیا ۱۰۴۹ھ'، 'سکینۃ الاولیا ۱۰۵۲ھ'، 'مجمع البحرین ۱۰۶۵ھ' پر فاضلانہ تبصرہ کرکے اس کے فن وکمال پر روشنی ڈالی ہے اور مزید معلومات کے لیے فٹ نوٹ میں دارا کی دوسری کتابوں کی فہرست بھی درج کردی ہے۔

ندوی صاحب نے وقیع کتاب کے صفحات میں اورنگ زیب عالم گیر کی ولادت اور تاریخ وتربیت، ابتدائی لڑائیاں اور اس کی متاہل زندگی، گجرات، ملتان اور دکن کی نظامت، گولکنڈہ و بیجاپور کے محاصرے جیسے موضوعات پر مستند تاریخی مواد پیش کرنے کے بعد آخر میں باب آٹھ کے تحت برادرانہ جنگ اور تخت نشینی کے جو حالات قلم بند کیے ہیں وہ اس لحاظ سے بہت اہم ہیں کہ ان کی روشنی میں برادرانہ جنگ تخت وتاج کی جنگ نہ ہونے اور اس کے پس پردہ دو تحریکوں کی کارفرمائی کی نشان دہی کی ہے۔ نجیب اشرف ندوی نے اس نکتے کی طرف اشارہ کرکے اپنی فراست و ذکاوت کے ساتھ اپنے گہرے تاریخی شعور کا ثبوت بھی دیا ہے۔ کیونکہ دارا اور اورنگ زیب کا تصادم دو اشخاص کا نہیں بلکہ دو تحریکوں کا تصادم تھا۔ اورنگ زیب حضرت مجدد الف ثانی کی تحریک کا حامی تھا اور دارا اس ذہن کا علم بردار تھا جو ذہن اکبر کے دین الٰہی سے بنا تھا۔ اس لیے دونوں کی فتح وشکست میں دو تحریکوں کی فتح وشکست مضمر تھی۔

اسی باب میں برادرانہ جنگ اور تخت نشینی کے تحت مصنف نے دبستان المذاہب کے حوالہ سے اس دور میں بعض اسلامی فرقوں کا جو حال لکھا ہے وہ معلومات آفریں اور حیرت ناک ہی نہیں عبرت ناک بھی ہے۔اسی طرح مصنف نے اس دور کے سیاسی حالات، بھائیوں کے کردار، دارا کے عقائد اور عالمگیر کی اس سے نفرت کے اسباب ونتائج کو تاریخی حقائق کی روشنی میں نہایت منطقی پیرایہ میں پیش کیا ہے۔اس کے مطالعہ سے عالم گیر کے حقیقی موقف اور اس کے عمل وفراست اور تدبر وسیاست پر روشنی پڑتی ہے۔

اس برادرانہ جنگ کے واقعات کے علاوہ مقدمہ رقعات عالم گیر کا وہ حصہ بھی نہایت اہم ہے جس میں نجیب اشرف ندوی نے عالم گیر اور اس کے بھائی بہنوں کی سیرت وطبائع اور عقائد وعلمیت اور اس کے دور میں ان کے سیاسی رول پر روشنی ڈالی ہے۔اس ضمن میں داراشکوہ، جہاں آرا بیگم اور خود سیرت اورنگ زیب کو جس محنت اور دیدہ وری سے مرتب اور اجاگر کر کے پیش کیا ہے اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔

مقدمہ رقعات عالم گیر میں سید نجیب اشرف ندوی نے اورنگ زیب عالم گیر پر عائد کردہ الزامات اور آئے دن کیے جانے والے اعتراضات کا جس محققانہ باریک بینی سے سدّ باب کیا ہے اس کا حقیقی لطف تو اس کتاب کے مطالعے ہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔ان کے ناقدانہ رویے اور مدلل وشگفتہ انداز بیان کی صحیح داد بھی اسی وقت دی جاسکتی ہے جب مقدمہ قعات عالم گیر کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے لیکن یہاں چند الزامات کا ذکر کرنا اس لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ یہی مقدمہ زیر بحث کی تالیف کا اصل مقصد تھا اور نجیب اشرف ندوی نے اس مقصد کو بڑی کامیابی کے ساتھ پورا کیا ہے۔

اس سلسلے میں انھوں نے اورنگ زیب پر عائد کردہ الزامات کی نہ کوئی فہرست بنائی اور نہ شبلی کی طرح ان اعتراضات یا الزامات کو ابواب کا عنوان بنایا۔ بلکہ اس دور کے تاریخی واقعات وحالات ہی کے سلسلے میں موقع بہ موقع ان اعتراضات کو رفع کرتے چلے گئے ہیں۔ یہاں خاص بات یہ ہے کہ ہر اس مرحلے پر جس کا تعلق ایسے کسی الزام سے تھا انھوں نے تاریخی شواہد کی مستند کتابوں، رقعات کے حوالوں، اصل عبارتوں اور مضبوط دلیلوں سے ان الزمات کو بے بنیاد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

مثال کے طور پر دکن کی فتح کے ضمن میں گولکنڈہ کے سیاسی حالات اور اختلاف کے اسباب پر سیر

حاصل بحث کر کے رقعات ومکاتیب کی روشنی میں ندوی صاحب نے ثابت کیا ہے کہ اورنگ زیب کا یہ عمل حق بجانب تھا۔ وہ جو کام بھی کرتا تھا شاہ جہاں کے حکم کے بغیر نہیں کرتا تھا۔اس نے دکنی حکومتوں کے خلاف کوئی سازش نہیں کی ۔ بلکہ کھلم کھلا جنوبی ہند کے مسلمان حکمرانوں کو ان کے کرتوتوں پر متنبہ کرتا رہا اور پھران کے سیاسی توڑ جوڑ ،منافقانہ رویوں اور بدعہدیوں سے تنگ آ کر بیجا پور اور گولکنڈہ پر اس کو چڑھائی کرنا پڑی جس کا لازمی نتیجہ اس کی فتح تھی۔

اورنگ زیب پر سب سے بڑا الزام باپ سے بدسلوکی کرنے کا ہے اور ہر ملکی اور غیر ملکی مورخ نے لکھا ہے کہ اس نے شاہ جہاں کے ساتھ بدسلوکی کی ۔یعنی اسے قید کیا اور طرح طرح کی تکالیف میں مبتلا کر کے اس کی زندگی اجیرن کر دی لیکن ندوی صاحب نے اس الزام کے سلسلہ میں تفصیل کے ساتھ عالم گیر کی فرماں برداری، باپ کے احترام، دل جوئی، تحمل وبردباری وثائق سے ثابت کرنے کے لیے یہ بتایا ہے کہ:

> ''خود شاہ جہاں کے ساتھ اس نے جو برتاؤ کیا اس کا بہترین ثبوت وہ ہدایات ہیں جو اس نے شاہ جہاں کے ملازم خاص فاضل خان کو لکھ کر بھیجی اور جن کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب نے شاہ جہاں کو کامل آزادی میں صرف اسی حد تک تحدید کر دی تھی کہ وہ اس کو کسی صورت میں نقصان نہ پہنچا سکے اور بس ۔ ورنہ نہ اس کے روزانہ کے مشاغل میں کوئی مداخلت کی گئی اور نہ اس کے ذاتی توشہ خانوں کو ہاتھ لگایا گیا۔اس کے ساتھ ہی اورنگ زیب نے اس بات کا حکم دے دیا تھا کہ شاہ جہاں جو چیز جس وقت طلب کرے اس کے سامنے حاضر کیا جائے۔ لوگوں کا جو ہزاروں روپیہ اس کے ذمہ ہے وہ ادا کر دیا جائے۔ اور جن لوگوں کے وظائف مقرر ہیں وہ علیٰ حالہٖ باقی رہیں ۔۔۔اورنگ زیب نے شاہ جہاں کے ساتھ یہی مراعات نہیں کیں بلکہ اس نے ان تمام رسوم کو جاری رکھنے کا حکم دیا جو شاہ جہاں نے جاری کی تھیں۔ان میں ممتاز محل کی برسی بھی تھی ۔۔۔ جہاں آرا کا

بھی آخر وقت تک وہی اثر و اقتدار اور عزت و احترام کو باقی رکھا۔''(۳)

اس خصوص میں نوع بہ نوع تاریخی شہادتوں کو پیش کرنے کے بعد ندوی صاحب کہتے ہیں:

''یہ تھا اورنگ زیب کا برتاؤ شاہ جہاں کے ساتھ اور اب یہ ناظرین کا فرض ہے کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ اورنگ زیب اس حیثیت سے لائق الزام ہے یا قابل ستائش۔''(۴)

اس طرح ندوی صاحب نے اورنگ زیب پر عائد کردہ الزامات کا تنقیدی جائزہ لے کر اس طرح کی ساری باتوں کو من گھڑت اور بے بنیاد ثابت کیا ہے۔ اپنی ایک ایک بات کے ثبوت میں اتنے دلائل وشواہد لائے ہیں کہ لب کشائی کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ آخر میں اورنگ زیب کی تخت نشینی کا حال لکھتے ہوئے اختتامیہ کے طور پر انھوں نے وضاحت بھی کر دی ہے کہ:

''رقعات عالم گیر کی پہلی جلد انھیں واقعات پر ختم ہوتی ہے اس لیے یہ مقدمہ یا کتاب کی پہلی جلد کا یہ مفصل تبصرہ یہیں ختم ہوتا ہے۔ آخر میں صرف یہ کہنا ہے کہ عالم گیر ایک انسان تھا۔ انسانیت سے بالاتر جذبات کی توقع ہم اس سے نہیں کر سکتے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ مغل شہزادوں کے سوانح حیات کے مرقع میں اس کی تصویر اگر ہمایوں سے زیادہ خوش نما نہیں تو اکبر، جہاں گیر اور شاہ جہاں سے زیادہ بری بھی نہیں۔''(۵)

رقعات عالم گیر: سید نجیب اشرف ندوی کی دوسری اہم تحقیقی کتاب ہے۔ اس میں کل ۳۹۷ صفحات ہیں جن میں ابتدائی ۲۹۴ صفحات تو صرف مکاتیب اورنگ کے لیے وقف ہیں۔ بعد کے صفحات میں ضمیمے کے طور پر شاہ جہاں، شہزادی جہاں آرا بیگم اور دیگر شہزادوں کے مکاتیب بھی شامل کیے گئے ہیں۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ندوی صاحب نے عالم گیر کی شہزادگی کے زمانے سے برادرانہ جنگ کے اختتام تک کے حالات اور شاہ جہاں نیز دوسرے افراد خاندان کے نام لکھے گئے ان رقعات کو اتنی محققانہ دیدہ

وری سے جمع کر دیا ہے کہ اورنگ زیب کے عہد خصوصاً اس کی شہزادگی کے دور کی مستند اور مفصل تاریخ سامنے آجاتی ہے۔

بنیادی طور پر یہ کتاب ان رقعات کا مجموعہ ہے جو شہزادہ اورنگ زیب نے کسی نہ کسی ضرورت کے تحت شاہی خاندان اور دربار سے وابستہ مختلف حیثیتوں کے لوگوں کے نام لکھے تھے۔ اپنے شہزادوں کے نام اس کے لکھے ہوئے خطوط تو تنبیہ نامہ کہے جانے کے مستحق ہیں۔ کیوں کہ یہ تلخ و ترش نصیحتوں سے پر ہیں۔ ان کے علاوہ ان رقعات یا خطوط میں ادب و تادیب، زبان و انشا اور علم و حکمت کے رموز بھی بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کو پڑھے بغیر اس حقیقت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ عالم گیر کس تبحر علمی، جغرافیائی اور سیاسی معلومات اور انشا پردازانہ قدرت کا مالک تھا۔ ان رقعات کو اورنگ زیب کی آپ بیتی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ اس رقعات میں اس نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے جس سے اس کے مزاج و طبیعت کا اصل رنگ بھی آئینہ ہو گیا ہے۔ ان رقعات کو پڑھنے کے بعد اس پر عائد کیے ہوئے بہت سے الزامات بے بنیاد ثابت ہوتے ہیں اور ایک ایسے اورنگ زیب کی شبیہ سامنے آتی ہے جو عام لوگوں کے ذہنوں میں موجود شبیہ سے بڑی حد تک مختلف ہے۔

ان رقعات کو جمع کرنا، ان پر فٹ نوٹ لگانا، مقامات و شخصیت سے متعلق توضیحات کرنا بہت اہم اور مشکل کام تھا، جس کو ندوی صاحب نے نہ صرف محققانہ دیانت بلکہ ژرف نگاہی سے انجام دیا ہے۔ ان کی فارسی دانی نے اس کام میں ان کی بہت مدد کی ہے۔ فارسی میں وہ عالمانہ حیثیت کے مالک نہ ہوتے تو شاید اس اہم تحقیقی اور تاریخی کام کو اتنی آسانی اور مہارت سے پورا نہ کر پاتے۔ رقعات عالم گیر کی صورت میں انھوں نے تاریخ کی تحقیق کے میدان میں اپنی خداداد صلاحیتوں کا اس طرح ثبوت دیا ہے کہ اورنگ زیب کے ذاتی حالات، خصائل و شمائل، حفظ مراتب، سیاست و تدبر اور رواداری و دل نوازی کا وہ عالم آنکھوں میں پھر جاتا ہے جو تاریخ کے ہزاروں صفحات پڑھنے پر بھی سامنے نہیں آسکتا۔ ان رقعات کی اشاعت سے تاریخ و تحقیق کے کئی نئے دریچے کھلنے کے ساتھ ادب و انشا کے کئی اعلا پایہ نمونے سامنے آتے ہیں۔ ان میں کہیں سیاسی و معاشی واقعات پر تنقید ہے تو کہیں شوق وصال میں بے چین ہونے کا اقرار۔ کہیں دور فراق کا

اضطراب ہے تو کہیں شادی یا ولادت پر خوشی ومسرت یا مایوسی ومحرومی پر رنج وغم کا اظہار۔ کہیں کسی افسر کی سفارش ہے تو کہیں تنبیہ اور نصیحت۔ اگر ایک خط میں تفصیل سے قلعوں اور عمارتوں کا ذکر کیا گیا ہے تو دوسرے خط میں چمنستانوں کی سیر کرائی گئی ہے۔

ان رقعات ومرسلات کو جمع کرنے میں سید نجیب اشرف ندوی کو جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا ان کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے سید نجیب ندوی کو لکھا تھا کہ:

> ''یہ نہ صرف یہ کہ ہندوستان کی کسی لائبریری، ایک شہر یا ایک صوبہ میں جمع نہیں بلکہ یورپ میں بھی مختلف مقامات پر منتشر ہیں۔ کوئی برطانوی عجائب خانے میں ہے اور کوئی دفتر وزارت ہند میں، کوئی پیرس میں کوئی لندن میں۔''(۶)

مگر انھوں نے اپنے استاد سر جدوناتھ سرکار کی رہنمائی اوران کے ذخیرۂ کتب کی مدد سے تمام مشکلوں کو حل کیا اور رقعات عالم گیر کی شکل میں علمی دنیا کو ایسا تحفہ دے گئے جس کی روشنی میں اورنگ زیب کی اصل شخصیت جو انگریزی اور مغربی مورخین کے بے بنیاد الزامات کے گرد وغبار میں دب گئی تھی۔اسی کے رقعات ومراسلات کی روشنی میں پوری طرح واضح ہوگئی۔

رقعات عالم گیر کی ترتیب کی روداد سات صفحات پر مشتمل ماہنامہ معارف دارالمصنفین اعظم گڑھ کے دسمبر ۱۹۲۷ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل میں سید نجیب اشرف ندوی کو کن کن مشقتوں سے گزرنا اور کس دماغ سوزی اور جاں کاہی سے کام لینا پڑا تھا۔ دوسرے بھی محسوس کر سکتے ہیں کہ خطوں کو بار بار پڑھنا، رقعات کو تاریخی ترتیب دینا اوران متعلقہ خطوط کا سراغ لگانا جن کے جواب میں یہ خطوط لکھے گئے ہیں، کوئی معمولی کام نہیں تھا۔انھوں نے اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی کو لکھا تھا۔ ''میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ ایک جگہ ایک راستہ یا ایک آدمی کے یقین وتحقیق میں ہفتہ کا ہفتہ گزر جاتا ہے۔'' اگر وہ تنہا ہوتے تو انھیں مزید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔لیکن انھیں اپنے استاد سر جدوناتھ سرکار کی سرپرستی حاصل تھی۔ان ہی کی وجہ سے برٹش میوزیم، انڈیا آفس، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور خدابخش خاں کے کتب خانے سے کتابیں مل جاتی تھیں جنھیں وہ نقل کرلیا کرتے تھے۔

مخطوطوں اور قلمی کتابوں پر ان کی خصوصی توجہ تھی۔ کیوں کہ شاہ جہاں کے آخری بارہ سال اور اس کے بعد کی پنج سالہ خانہ جنگی کی کوئی تاریخ نہیں تھی اور مشکل یہ تھی کہ اس کے بغیر ان خطوط کی ترتیب مشکل ہی نہیں محال تھی۔ عالم گیر نامہ اگر چہ شائع ہو چکا تھا لیکن اس کی حیثیت اورنگ زیب کے سرکاری بیان کی سی تھی جس میں بہت زیادہ کانٹ چھانٹ کی گئی تھی اور یہ مکمل بھی نہیں تھا۔ اس میں صرف برادرانہ جنگ ہی کے حالات لکھے گئے تھے۔ اس لیے ضرورت تھی قلمی کتابوں کی۔ ان قلمی کتابوں میں بعض کے متن ہندوستان میں سرے سے موجود ہی نہیں تھے۔ انھوں نے ایسے انیس مخطوطوں کی فہرست دی ہے جنھیں انھوں نے نقل کروایا اور ان سے استفادہ کیا۔

سر جدو ناتھ سرکار کا ذخیرۂ کتب تو پورے طور پر ان کے تصرف میں تھا۔ اس کے علاوہ مذکورہ مخطوطے بھی انھیں کی مدد سے حاصل ہوئے تھے۔ اس شفقت وتعاون کے لیے انھوں نے اپنے استاد کا جا بہ جا شکریہ ادا کیا ہے۔ انھیں کے لفظوں میں:

> ''اس فہرست (۱۷۳ کتابوں کی فہرست جو سیرت اورنگ زیب کے ماخذ کے طور پر مقدمہ رقعات عالم گیر میں پیش کی گئی ہے) کے علاوہ اورنگ زیب کے سلسلے میں متعدد اور کتابوں کے مطالعہ کا بھی اتفاق ہوا ہے۔ لیکن طوالت کی وجہ سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم یہ ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس وقت اورنگ زیب سے متعلق بہترین مجموعہ استاد محترم پروفیسر جدو ناتھ سرکار کے پاس موجود ہے۔ ہم نے سال بھر تک مستقل طور پر قیام کر کے جہاں تک ہو سکا اس علمی باغ سے خوشہ چینی کی ہے۔'' (۷)

برسوں کی عرق ریزی کا جو نتیجہ برآمد ہونا چاہیے تھا وہ ہوا ہے اور رقعات عالم گیر جلد اول کی شکل میں سید نجیب اشرف ندوی نے اورنگ زیب کے حالات کو آئینہ کر دیا ہے۔ اچھا ہوتا کہ وہ اپنے منصوبے کے مطابق اس کی مزید جلدیں مکمل کر دیتے۔ اس کی مزید جلدوں کا مکمل نہ ہو پانا ان کی ہی نہیں علمی دنیا کی بھی ایک بڑی محرومی ہے۔

لغات گجری: سید نجیب اشرف ندوی کی آخری علمی یادگاران کی مشہور ومعروف کتاب 'لغات گجری' کی تدوین ہے جو ایک نامعلوم مصنف کا لغت ہے۔ اس کا متن اپنے عربی حواشی سمیت ۲۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ دراصل ندوی صاحب کو ایک مخطوطہ دستیاب ہو گیا تھا جو نصاب ناموں کے انداز پر لکھا ہوا تھا۔ انھوں نے اس کی زبان و بیان کی قدامت و خصوصیت اور دوسری داخلی شہادتوں کی بنا پر نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ مخطوطہ نصاب نامہ سے زیادہ قدیم اردو کے لغت کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے احباب کی مدد سے اس کا متن مرتب کر کے اپنے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ اس کو شائع کیا۔ یہ مقدمہ پچاس صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس مقدمے میں لغات گجری کی اہمیت وضرورت واضح کرتے ہوئے انھوں نے اردو کے ابتدائی نصاب ناموں کی تفصیل بھی مہیا کر دی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کی ابتدائی تعلیم میں علاقۂ گجرات کو اولیت حاصل ہے۔ بعد میں ان کے اس خیال کی بہت سے اہلِ قلم نے تائید کی ہے۔ یہ بات بھی تقریباً سبھی نے تسلیم کی ہے کہ لغات گجری کی طباعت سے قدیم اردو کا پہلا لغت دستیاب ہوا ہے۔ جس کو اردو لسانیات میں ارفع و اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ اس کے مقدمہ میں اردو کی ابتدا کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''اگرچہ ہندوستان کی یہ مشترک زبان جس کا آخری نام اردو ہے اور جو زبانِ دہلی، ہندی، ہندوی، ہندوستانی، اندوستانی، ہندوستان کی زبان، زبان ہندوستان، منگولی ہندوستانی، ریختہ، مورس وغیرہ کے نام سے یاد کی جاتی رہی ہے۔ اپنی ابتدائی شکل میں دہلی اور اطراف دہلی میں ملتی ہے۔ لیکن اس کی ادبی ابتدا، ترقی وتوسیع گجرات اور دکن کے علاقہ میں ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زبان کے دو اور نام گجری، گرجری یا بولی گجرات اور دکنی، دکھنی، زبان دکنی وغیرہ بھی ہیں۔''(۸)

مقدمہ کے علاوہ لغت کی تدوین میں انھوں نے جس غیر معمولی محنت اور جس دقت نظری کا مظاہرہ کیا ہے اس سے ان کی تحقیقی بصیرت، مہارت اور لسانیات کے ساتھ گہری دلچسپی کا ثبوت ملتا ہے۔ لغت نویسی پر بحث کے علاوہ مختلف انداز کی متعدد فہرست سازی بھی ان کا ایسا کارنامہ ہے جس سے لسانیات میں دل

چسپی رکھنے والوں کو روشنی ملتی رہے گی۔ شاہ معین الدین احمد ندوی نے بہت صحیح لکھا ہے کہ ''گجری لغات کی تصحیح واشاعت خصوصاً اس کا فاضلانہ مقدمہ ان کا ایک علمی کارنامہ ہے۔''

یہ کارنامہ انھوں نے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے وابستگی کے دوران انجام دیا۔ اس ادارہ کا مقصد محققین کو سہولت بہم پہنچانے کے ساتھ تحقیقی کا کام کرنے والوں کی تربیت کرنا بھی تھا۔ یہ کام وہی شخص انجام دے سکتا تھا جو خود محقق ہو۔ اس لیے انجمن کے ارباب اختیار کی نظر سید نجیب اشرف ندوی پر پڑی جو دارالمصنفین کے رفیق اور ماہنامہ معارف کے مدیر کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے تھے۔ مقدمہ رقعات عالم گیر اور رقعات عالم گیر کی تدوین ان کے محقق ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر چکی تھیں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ فروری ۱۹۴۷ء میں جب انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا تو وہ اسمٰعیل یوسف کالج میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے اور بیک وقت دو عہدوں پر فائز نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے انھیں اعزازی ناظم مقرر کیا گیا اور ۱۹۵۵ء میں جب وہ وظیفہ حسن خدمت پر تدریسی ذمہ دایوں سے سبک دوش ہو گئے تو انھیں اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا کل وقتی ڈائرکٹر بنا دیا گیا۔ ڈائریکٹر کے عہدہ پر رہتے ہوئے انھوں نے اپنی سر پرستی میں سہ ماہی 'نوائے ادب' شائع کروانے اور ایم۔ اے۔ نیز پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے اردو طلبا کی رہنمائی کرنے کے ساتھ لغات گجری جیسی اہم کتاب کی تدوین کی اور اسے شائع کروایا۔

سید نجیب اشرف ندوی نے مستقل تصانیف اور تراجم کے علاوہ دوسو سے زیادہ تنقیدی، تحقیقی وتبصراتی مضامین قلم بند کیے ہیں۔ جو مختلف رسائل واخبارات میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان میں بیش تر مضامین تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ حالیہ دنوں پروفیسر عبدالستار دلوی نے ان کے بیس مضامین کو مرتب کر کے انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے شائع کیا ہے۔ باقی مضامین کو ترتیب دینے کے لیے کئی جلدیں درکار ہوں گی۔ کاش کوئی ان کے باقی مضامین کو بھی مرتب کر دیتا تو نجیب اشرف ندوی کے وہ کارنامے جن پر وقت کی گرد پڑ چکی ہے ایک بار پھر منظر عام پر آ جاتے۔ ان مضامین کو پڑھتے ہوئے ان کی تبحر علمی اور تحقیقی وتنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگر چہ اس مقالے میں ان تمام مضامین پر گفتگو نہیں ہو سکتی تاہم چند ایک مضامین کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

’تاریخ الدولتین‘ علامہ نیاز فتح پوری کی تالیف کی حیثیت سے مشہور ہے۔سب سے پہلے یہ کتاب جامعہ اسلامیہ دہلی سے شائع ہوئی تھی۔سید نجیب اشرف ندوی نے جب اس کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، ماخذ کی تحقیق کی اور اصل ونقل کا موازنہ کیا تو یہ عقدہ کھلا کہ اصل تصنیف تو مصر کے عیسائی مورخ علامہ جرجی زیدان کی ہے جس کا نام ’التمدن الاسلامی‘ ہے اور نیاز فتح پوری نے اس کا ترجمہ کر کے اپنے نام سے شائع کر دیا ہے۔یہی نہیں انھوں نے نیاز فتح پوری کے علمی سرقہ کی نشان دہی کرنے کے ساتھ جرجی زیدان اور نیاز فتح پوری کی ایسی گرفت کی کہ جرجی زیدان اور نیاز فتح پوری کی علمی خیانت کے ساتھ نیاز کی عربی دانی کا بھرم بھی کھل گیا۔یہ مضمون جب معارف میں شائع ہوا تو دنیائے ادب حیرت میں ڈوب گئی کیوں کہ نجیب اشرف ندوی نے صرف حقائق سے پردہ نہیں اٹھایا تھا جن سے علمی خیانت ظاہر ہوتی تھی بلکہ نیاز کے ترجموں کی غلطیوں پر بھی گرفت کی تھی۔

علامہ نیاز فتح پوری نے اسوۂ صحابیات کے سلسلے میں بھی یہی کیا تھا۔یہ کتاب صحابیات کی سیرت پر مبنی ہے،اور دارالمصنفین کی مطبوعات میں شامل ہے۔انھوں نے اس پوری کتاب کا چربہ اتار کر ’سیر الصحابیات‘ کے نام سے صوفی بکڈپو لکھنؤ سے شائع کروادیا۔ندوی صاحب نے ان دونوں کتابوں کے متن، سیاق وسباق اور بہت سے اقتباسات پیش کرتے ہوئے نشان دہی کی کہ علامہ نیاز ’اسوۂ صحابیات‘ کو ’سیر الصحابیات‘ کے نام سے شائع کر کے علمی سرقہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔

محمود شیرانی کی مشہور کتاب ’پنجاب میں اردو‘ ایک اہم کتاب ہے۔اس کتاب میں ندوی صاحب نے معارف میں جو تبصرہ کیا تھا وہ ہر اعتبار سے ایک علمی تبصرہ ہے،جس میں تحقیق اور تبصرہ دونوں کے معیار کا لحاظ رکھا گیا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اتنی اہم کتاب اور اتنے اہم موضوع پر جب ان کا یہ تبصرہ شائع ہوا اس وقت ان کی عمر صرف ۲۸ سال سے زیادہ نہیں تھی۔اس کے باوجود ’پنجاب میں اردو‘ پر ان کی تنقید کو کئی لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔

اس خاص لسانیاتی اور تنقیدی مقالہ میں ندوی صاحب نے حافظ محمود خاں شیرانی کے مغالطّوں اور تسامحات کی جس طرح نشان دہی کی ہے اس سے اردو زبان کے مولد ومنشا کے بارے میں تحقیق کی مزید

راہیں کھل گئیں۔اس سے ندوی صاحب کی لسانی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔اس تبصرے کے مطالعے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک محقق کا منصفانہ اور بصیرت افروز تنقیدی جائزہ ہے۔

حفظ الرحمٰن واصف دہلوی:

مولانا حفظ الرحمان واصف دہلوی ۱۰رفروری ۱۹۱۰ءکو دہلی کے ایک معزز اور تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد مفتی محمد کفایت اللہ کا شمار ہندوستان کے نامور علمائے دین اور سیاسی رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد کے زیر سایہ حاصل کی۔مفتی اعظم کے علاوہ اس وقت کے نامور علما مولانا خدا بخش،مولانا محمد حسن دوحدی،مولانا عبدالغفور عارف دہلوی وغیرہ سے عربی وفارسی ادب،علم قرآن و حدیث و فقہ اور علم عروض کی تعلیم حاصل کی۔فن خطاطی میں مشہور استاد منشی حامد حسین فرید آبادی کے شاگرد ہوئے اور نستعلیق میں اعلیٰ درجہ کی مہارت اور استادانہ شان پیدا کی۔خط نسخ کی مشق کے لیے منشی عبدالغنی خان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔اس کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی سے عربی ادب کا کورس مولوی عالم بھی مکمل کیا۔

مذہبی علوم کے علاوہ مولانا واصف دہلوی علم عروض اور عربی وفارسی ادب کے ماہر اور اردو زبان ولغت کے فاضل و مستند اہل زبان اور زبان داں محقق تھے۔مولانا کو اردو زبان ولغت کے مسائل،الفاظ کی اصل، لسانیات وقواعدِ زبان پر انتہائی عبور حاصل تھا۔وہ لغت و زبان کے ماہر اور اس کے کھرے کھوٹے کے پرکھنے والے تھے۔ان علوم پر ان کے جیسی دقیق نظر بہت کم محققین میں ہوتی ہے۔خواجہ حسن نظامی ثانی کے بقول:

> ''مولانا واصف دہلوی دہلی کی زبان اور محاورے کے بڑے ماہر تھے۔
> بزرگوں کی آنکھیں دیکھی تھیں۔خواجہ حسن نظامی، ملا واحدی اور نواب
> سائل کی زبان ان کی اپنی زبان تھی۔پھر وہ عربی فارسی کے عالم تھے۔
> تمام ادبی وفنی نزاکتوں سے باخبر۔ان کو غلط زبان سے ایسی ہی تکلیف
> ہوتی تھی جیسے مرزا مظہر جان جاناں کو ٹیڑھی چارپائی سے۔''(۹)

اردوئے معلیٰ کی زبان ومحاورہ کے سلسلے میں مولانا واصف دہلوی کی زبان سند کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۹۵۰-۵۱ میں اردو کے کسی ادیب نے اخبار میں کھانسی آنا لکھ دیا تھا۔ کئی دن تک انجمن ترقی اردو دہلی میں یہ بحث چلتی رہی کہ صحیح محاورہ کیا ہے۔ چنانچہ انجمن کی صدر محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ نے مولانا واصف صاحب سے دریافت کیا اور مسئلہ طے ہوگیا۔ یعنی ٹکسالی زبان کا محاورہ کھانسی اٹھنا ہے۔ زبان اور اس کی باریکیوں پر مولانا کی بہت گہری نظر ہے۔ وہ لفظوں کی اصل اور اس کے متعلقہ مباحث پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہیں۔ وہ اردو زبان کے ارتقائی نظریات پر خامہ فرسائی کرتے ہوئی لکھتے ہیں:

''مادری زبان محض اظہار جذبات اور مافی الضمیر ادا کرنے کا آسان وسیلہ ہی نہیں بلکہ قوم کی تہذیبی و ثقافتی اقدار اور ذہنی معیار کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ہر زندہ زبان بتدریج ارتقا کے منازل طے کرتے ہوئے نکھری ہوئی اس شکل تک پہنچتی ہے۔ جسے اس کی ترقی یافتہ صورت کہا جاسکتا ہے۔ اور ترقی اس تبدیلی کا نام ہے جو بہتر کی طرف رہنمائی کرے نہ کہ کمزوری اور کمتری کی طرف۔''(۱۰)

مولانا کے خیال میں اردو زبان کی اصل جو بھی ہو لیکن یہ موجودہ صورت میں ایک موڈرن اور ایسی زبان ہے جو مختلف قوموں، مختلف علاقوں، مختلف مذہبوں کے مختلف بولیاں بولنے والے لوگوں کے ملنے جلنے سے وجود میں آئی تھی اور داغ تک پہنچتے پہنچتے خوب نکھر چکی تھی۔ پھر داغ دہلوی نے اس کی شیرینی وحسن و چار چاند لگائے اور فصاحت و بلاغت کی بلندیوں پر پہنچایا۔

مولانا کو اخلاقی وتہذیبی قدروں کی طرح اپنی مادری زبان اردو سے بھی پیار ہے۔ وہ اس کی فصاحت و بلاغت اور صحت وشیرینی کو تسہیل زبان کے نام پر قربان کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ زبان کو آسان اور عام فہم بنانے سے ان کی یہ مراد ہوتی ہے کہ تحریر وتقریر میں عربی و فارسی کے مشکل الفاظ نہ استعمال کیے جائیں بلکہ ایسے الفاظ وتراکیب کو اپنی نگارشات کا حصہ بنایا جائے جو پڑھے لکھے لوگوں کی اکثریت بآسانی سمجھ سکے۔ اس سے زبان کی ترویج وترقی میں مدد ملے گی، نہ کہ اس کے قواعد واملا میں تسہیل کے نام پر اصلاح وتبدیلی کی جائے۔ اس سے زبان آسان نہیں ہوتی بلکہ اس کی فصاحت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ قواعدِ زبان کی حدود میں رہتے ہوئے اگر زبان کی بہتری اور ضرورت کے تحت کوئی ایسی تبدیلی یا اضافہ ہو جو پڑھنے اور سننے والوں

کو گراں اور اجنبی نہ محسوس ہو اور جمہور اہلِ زبان کے نزدیک مقبول ہو تو اس تبدیلی کو ترقی زبان کی طرف پیش قدمی تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر یہ تبدیلی عمومی طور پر اہلِ زبان کے نزدیک قابلِ قبول نہ ہو بلکہ ناپسندیدہ ہو تو یہ تبدیلی ترقیٔ زبان نہیں بلکہ جدت برائے جدت ہوئی۔ لیکن قواعدِ زبان کی پابندی اس شدت سے بھی مناسب بھی نہیں کہ وہ زبان کی ترقی کی راہ میں حائل ہو جائے۔ اس بارے میں مولانا واصف دہلوی لکھتے ہیں:

> ''قواعد کی خاطر ارتقائے زبان پر پابندیاں بھی نہیں لگائی جا سکتیں اور قواعد و قیاس کو کسی اختراعی لفظ یا ترکیب کی فصاحت کا فیصلہ کرنے کے لیے حکم بھی نہیں بنایا جا سکتا۔ لیکن ارتقائے زبان ہے کیا چیز؟ اگر ہر قسم کی تبدیلی یا اختراع و جدت کا نام ارتقائے زبان ہے تو بے شمار گھناونے الفاظ اور مکروہ محاورے بزم فصاحت کے مسند نشین ہو جائیں گے اور ذوق سلیم کسی گوشے میں بیٹھ کر آنسو بہاتا رہے گا۔ اردوئے معلیٰ کی فریاد کون سنے گا۔'' (۱۱)

تبدیلی اور تغیر زندگی کی علامت ہے اور اردو بھی ایک زندہ زبان ہے۔ اس میں بھی بہرحال تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور ہوتی رہے گی لیکن اس طرح کے الفاظ اور محاورات قابل تسلیم نہیں ہو سکتے جو کسی زبان سے لفظ بہ لفظ ترجمہ کر لیے گئے ہوں مثلاً جلسہ ہونے جا رہا ہے یا میں نے کھانا کھانا ہے۔ یا جلنا اور حسد کرنا کے بجائے سڑنا، مجھے تجھے کی جگہ میرے کو تیرے کو وغیرہ۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شاعر پیدائشی طور شاعر ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے کہا گیا ہے کہ الشعراء تلمیذ الرحمان۔ مگر آج کل بہت تیزی سے شاعر بن بھی رہے ہیں اور بنائے بھی جا رہے ہیں۔ جو شعروں میں عجیب و غریب زبان اور الفاظ و محاورات استعمال کر رہے ہیں۔ شعر کہنے سے پہلے خصوصاً اور جملہ ادب خلق کرنے سے پہلے عموماً فن کار کو زبان پر قابو اور قدرت ضروری امر ہے۔ مولانا کے نزدیک غلط زبان میں شعر کہنے سے اچھا یہ ہے کہ شعر کہا ہی نہ جائے کہ یہ زبان و ادب کی خدمت نہیں بلکہ نقص ادب کا باعث ہوگا۔ لکھتے ہیں:

''ضرورت شعری کی وجہ سے زبان ولغت کو قربان نہیں کیا جاسکتا۔ پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ لفظ از روئے قواعد غلط یا فصاحت سے گرا ہوا نہ ہو۔ اور محاورے کے خلاف نہ ہو۔ ورنہ شعر کہنے ہی کی کیا ضرورت ہے۔ ''(۱۲)

مولانا کے علمی و تحقیقی کاموں میں ایک اہم کارنامہ ''اردو مصدر نامہ'' کی تالیف ہے۔ انھیں زبان اور اس کے لسانی مباحث سے گہری دلچسپی تھی۔ انھوں نے فارسی مصدر نامہ کے طور پر اردو مصدر نامہ ترتیب دینے کے خیال سے اس موضوع پر کام کرنا شروع کیا۔ دیکھتے دیکھتے ایک ضخیم کتاب تیار ہوگئی۔ اس موضوع پر اس سے پہلے اردو میں کسی نے توجہ ہی نہیں دی۔ اس لیے یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب قرار دی جاسکتی ہے۔ اس کتاب کی تالیف کا بنیادی مقصد ومحرک مولانا کا وہ جذبہ ہے جس کے تحت وہ اردو لکھنے پڑھنے اور بولنے والوں کو صحیح زبان لکھتے پڑھتے اور بولتے دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کو غلط زبان اور غلط محاورے سے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ مولانا کو اردو زبان ولغت اور املا کے مسائل، الفاظ کی اصل، مشرقی لسانیات اور قواعد زبان پر بے پناہ عبور حاصل تھا۔ وہ لغت وزبان کے ماہر اور اس کی صحت وفصاحت پر لکھنے والے تھے۔ اس بات کے ثبوت میں ''اردو مصدر نامہ'' کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اردو مصدر نامہ پر تنویر احمد علوی کا مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

''مولانا کو واسطہ اور سابقہ تو ساری عمر عربی زبان وادب سے رہا لیکن انھوں نے بڑا کام اردو زبان وادب کے سلسلے میں کیا۔ اس ضمن میں ان کے مرتبہ ''اردو مصدر نامہ'' کا ذکر کیا جاسکتا ہے جو دراصل زبان وقواعد کی بنیاد ہے۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پچھلی نصف صدی میں اردو زبان اور اس کی ادبیات کے دائرے میں جس رجحان کا سب سائے زیادہ عمل دخل رہا وہ ادبی تنقید ہے، لیکن مولانا نے اس کی طرف کم توجہ دی اس کے مقابلے میں زبان کی اساس ان کے یہاں زیادہ اہم رہی اور وہ اس کی جڑوں کی تلاش پر زیادہ متوجہ رہے ۔

''اردو مصدر نامہ'' ان کی اسی توجہ فرمائی کا نتیجہ تھا۔ فارسی اور عربی مصادر پر متعدد کتابیں مل جاتی ہیں اور ان زبانوں کی درسیات کے سلسلے میں ان کی حیثیت مبادیات کی سی ہے، لیکن اردو میں یہ کام کم کیا گیا ہے۔'' (۱۳)

اردو مصدر نامہ میں ایسے بہت سے مقامات ہیں جن سے مولانا کے علم، معیار تحقیق، وسعت مطالعہ، زبان ولغت اور فلسفۂ زبان پر ان کی دقیق نظر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ایسے بہت سارے الفاظ کی نشان دہی اس مصدر نامے میں کی گئی جو اردو زبان میں یا تو غلط استعمال ہو رہے ہیں یا تو ان کے معنی میں سہو ہو رہا ہے۔ مثلاً لفظ ''آئی'' کی اس کے معنی اکثر موت لکھے گئے ہیں لیکن مولانا نے اس پر مفصل بحث و تحقیق کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ یہ لفظ محاورہ اور استعارہ و کنایہ کے طور پر تو موت کا مطلب ادا کرتا ہے مگر اس کے لغوی معنی موت نہیں ہو سکتا۔ ملاحظہ ہو:

''آئی: فعل ماضی کا صیغۂ واحد مؤنث از آنا۔ نیز اسم حالیہ، آئی ہوئی کا مخفف۔ اس کے معنی مولف فرہنگ آصفیہ نے موت، مرگ، قضا لکھے ہیں اور سند میں مندرجہ ذیل تین شعر اور ایک فقرہ پیش کیا ہے:

جہاں سے میرؔ ہی کے ساتھ جانا تھا لیکن — کوئی شریک نہیں ہے کسو کی آئی کا
گلی میں اس کے رہا جا کے جو کوئی سویا — وہی تو جاوے وہاں جس کسو کی آئی ہو
وہ وقت تو آنے دے بتا دیں گے شہیدی — بن آئی کسی شخص پہ مرجاتے ہیں کیسے

فقرہ: کسی کی آئی مجھ کو آجائے (عو۔ کوسنا)

مولف موصوف کو سخت غلط فہمی ہوئی ہے۔ لفظ آئی کے معنی موت نہ اردو میں ہیں اور نہ ہندی میں، نہ سنسکرت میں نہ اور کسی زبان میں۔ پہلے شعر میں آئی اسم حالیہ ہے اور ترکیب میں ایک موصوف محذوف کی صفت واقع ہوا ہے۔ اس کی پوری نثر یوں ہے ''کسو کی آئی ہوئی موت کا کوئی شریک نہیں ہے۔'' آئی ہوئی موت صفت موصوف مل کر

مضاف ہوا، کسو مضاف الیہ ہے۔ دوسرے شعر میں آئی ہوئی فعل ہے،
کسو کی موت اس کا فاعل ہے۔ یہاں کسو مضاف الیہ اور موت مضاف
محذوف ہے۔ تیسرے شعر میں آئی اسم حالیہ صفت ہے موصوف
محذوف کی۔ پوری نثر یوں ہے۔''بن آئی ہوئی موت کے کسی شخص پر
یہ کیسے مرجاتے ہیں۔''مذکورہ بالا فقرے میں بھی'' آئی''اسم حالیہ
صفت واقع ہوا ہے۔ پوری عبارت یوں ہے''کسی کی آئی ہوئی موت
مجھ کو آجائے۔''(۱۴)

اتنا ہی نہیں بلکہ موصوف نے اساتذہ کے متعدد اشعار پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ آئی کے لغوی معنی موت نہیں ہوتے البتہ استعارے یا کنایے کے طور پر موت مراد لی جاسکتی ہے۔ اس ایک لفظ پر تفصیلی بحث دو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ پوری بحث کو پڑھنے کے بعد مولانا کے نظریۂ زبان وادب اور لغت کے مسائل پر ان کی گہری نظر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

اردو مصدر نامہ جہاں زبان و لغت کے مسائل سے بحث کرتا ہے وہیں اس کا دیباچہ جو چالیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے علمی دنیا کے لیے خاصے کی چیز بن گیا ہے۔ انھوں نے دیباچے میں اردو کی ابتدا سے متعلق نظریات پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اس معاملے میں انھوں نے اردو کے ہندوستانی مزاج پر زیادہ تفصیل سے بات کی ہے اور اس کے سرمایۂ لغت کا جائزہ لیا ہے۔ اردوئے معلیٰ کے عنوان سے انھوں نے مغلیہ عہد کی دلی کی تاریخ جس تحقیقی دقت نظر کے ساتھ پیش کی ہے اور چھوٹے چھوٹے عنوانات کے تحت جزئیات کا جس باریک بینی سے جائزہ لیا ہے وہ ان کی تحقیقی ظرف نگاہی کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔

اردو مصدر نامہ کے علاوہ اردو تحقیق کی دنیا میں ایک اور کتاب بعنوان'' ادبی بھول بھلیاں''مولانا کی یادگار ہے۔ موخر الذکر مولانائے موصوف کے تین مضامین کا مجموعہ ہے جنھیں مولانا کے صاحب زادے ڈاکٹر محمد قاسم نے اکٹھا کر کے شائع کر دیا ہے۔ پہلے مقالے کا عنوان زبان اور قواعد ایک تنقیدی جائزہ، اور دوسرا مقالہ اردو املا ایک تنقیدی جائزہ کے عنوان سے ماہنامہ برہان دہلی میں اگست ۱۹۷۸ء سے جنوری ۱۹۷۹ء تک چھ قسطوں میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ مقالے مشہور محقق رشید حسن خان کی دو مشہور کتابوں زبان اور قواعد

اور اردو املا پر تنقیدیں ہیں۔ تیسرا مقالہ مترادف الفاظ سے متعلق ہے جو رسالہ آج کل اور نگار میں شائع ہوا تھا، اسے بھی شامل کتاب کرلیا گیا ہے۔ اس طرح یہ مضامین جو مذکورہ کتابوں پر تنقید کی حیثیت رکھتے ہیں ایک مکمل کتاب کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ ان مضامین میں مولانا کا انداز بیان علمی ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت سنجیدہ ہے۔ انھوں نے جن مسائل پر بھی بات کی ہے نہایت واضح اور دوٹوک انداز میں کی ہے اس کے علاوہ دلائل و براہین ان کی باتوں کو استناد کا درجہ عطا کرتے ہیں دوسری زبانوں سے اردو میں رواج پانے والے الفاظ ہمیشہ موضوع بحث بنتے رہے ہیں۔ اس مسئلے پر مولانا کا نقطۂ نظر نہایت واضح اور صاف ہے فرماتے ہیں:

''دوسری زبانوں کے جو الفاظ اردو نے اپنا لیے ہیں اور ان میں تصرف کرلیا ہے خواہ وہ لغت کے لحاظ سے غلط ہوں اگر فصحا و ادبا سے سند فصاحت حاصل کر چکے ہیں تو ان کو اصل کی طرف واپس لے جانا ممکن نہیں اور اس کی کوشش کرنا ایک عبث ہے۔'' (۱۵)

'زبان و قواعد' پر تنقید کرتے ہوئے انھوں نے جہاں رشید حسن خان کی علمی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے اور ان کی تحقیقی کاوشوں کی داد دی ہے وہیں چھوٹی چھوٹی فروگذاشتوں پر بھی گرفت کی ہے۔ جگہ جگہ تنقید کرتے ہوئے مولانا کا لہجہ کچھ زیادہ ہی تندی اختیار کر لیتا ہے لیکن متانت کا دامن کہیں مجروح نہیں ہونے پاتا اور نہ علمیت میں کمی آنے پاتی ہے۔ تحقیق کے لیے جس قدر مواد و استناد کی ضرورت پڑتی ہے مولانا اس سے پوری طرح واقف ہیں۔ البتہ اپنے نظریے کو دوٹوک انداز میں پیش کر دیتے ہیں، جس سے لہجے کی تیزی کھٹکنے لگتی ہے۔ زبان اور قواعد پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ کتاب بہت محنت اور تلاش و جستجو کے ساتھ لکھی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے مصنف کی رائے سے اختلاف بھی ہے۔ میں اس حد تک آگے جانے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اردوئے معلیٰ جیسی شیریں، فصیح و بلیغ اور کوثر و تسنیم سے دھلی زبان کو کوڑے کرکٹ کا مجموعہ بنا دیا جائے اور جھلی والوں، خوانچہ والوں اور راہگیروں کو فصاحت

کی سند تقسیم کردی جائے اور ہر کس و ناکس کی زبان سے جو تلفظ ہم سن لیں اس کو فوراً لغت میں ٹانک لیں یا خود چ ہی کوئی غلط تلفظ فرض کر لیا جائے اور دوسروں سے فرمائش کی جائے کہ مان لیں اور قبول کرلیں۔‘‘(۱۶)

مولانا موصوف کی ساری عمر عربی ادب کی خدمت میں گزری۔لہٰذا عربی زبان و ادب پر ان کی گہری نگاہ ہے۔اس لیے اردو زبان و قواعد کے مباحث پر ان کی رائے دوٹوک اور فاضلانہ ہوتی ہے۔انھوں نے مذکورہ کتاب کے مندرجات میں جہاں کہیں خامیاں دیکھیں بغیر کم و کاست بیان کر دیں۔اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جس لفظ پر بھی اعتراض کیا اس کے سارے مالۂ و ماعلیہ سے بحث کی اور اصل مسئلہ کو صاف صاف بیان کر دیا۔رشید حسن خان نے لفظ ذہانت کے بارے میں لکھا کہ یہ لفظ چونکہ عربی کی کسی لغت میں نہیں پایا جاتا اس لیے مولفین قاموس نے اس کو ترک کرنے کی فرمائش کی ہے۔مولانا نے رشید صاحب کے بیان کو رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عربی میں یہ لفظ موجود ہے اور اس کا مادہ باب فتح اور باب کرم سے آتا ہے۔باب فتح کا مصدر ذہن اور باب کرم کا مصدر ذہانت ہیں اور اس کے معنی سمجھنا اور یاد رکھنا ہیں۔لفظ ذہانت بالکل عربی ہے عوام نے صرف اتنا تصرف کیا ہے کہ ذہانت بفتح اول کے بجائے بکسر اول بولتے ہیں۔البتہ ایک لفظ ہم نے ذہن سے ذہنیت خود بنایا ہے جس کے معنی انداز فکر کے ہیں۔

زبان و قواعد پر تنقید ۵۴ صفحات پر محیط ہے۔اس میں انھوں نے ایک ایک لفظ پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے رشید حسن خان کے تسامحات اور فروگذاشتوں کو واضح کیا ہے۔یہاں صرف ایک لفظ ’’عادی‘‘ پر مولانا کی تحریر نقل کی جاتی ہے۔

’’یعنی سب حضرات عربی کے لحاظ سے اس کو غلط مان کر مہند کی حیثیت سے جائز قرار دیتے ہیں۔واضح ہو کہ یہ لفظ دو مادوں سے آتا ہے ایک مادہ ’ع،د،وٗ ہے۔اس مادہ کے کچھ مشتقات اردو میں استعمال ہوتے ہیں مثلاً عداوت،عدوان،عدو،تعدی،متعدی۔لفظ عادی اس مادہ سے اسم فاعل ہے آخر کی ی ساکن ہے جو تنوین آنے کی صورت میں ساقط

ہو جاتی ہے۔اس کی دال پر دوز براور دو پیش نہیں آتے۔اس کی جگہ واؤ تھا۔تعلیل میں واؤ کو ی سے تبدیل کر دیا گیا۔ اس کے کئی معنی ہیں دوڑنے والا، ظالم، دشمن وغیرہ۔اس لفظ میں ی حروف اصلیہ میں داخل ہے۔

لیکن عادی جو خوگر کے معنی میں ہے اس کا مادہ ع و د ہے۔اس لفظ عادی میں یائے نسبتی ہے۔حروف اصلیہ میں سے نہیں ہے۔ یہ یائے مشدد ہے(اور عربی میں یائے نسبتی مشدد ہوتی ہے)اس پر تنوین رفعی، نصبی اور جری تینوں آسکتی ہے۔ عادی، عادیاً، عادیٍ۔القرب الموارد میں ہے العادیّ نسبۃ الی العادۃ سلیمان حلیم نے عادی اور عادتی دونوں لفظ دیے ہیں۔ صاحب غیاث اللغات نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔اس مادہ کے کچھ مشتقات اردو میں مستعمل ہیں مثلاً عادت،عود، عائد،معاد،عیادت،معاودت،اعادہ۔مجرد میں اس کا اسم فاعل عائد ہے۔اس میں حمزہ کی جگہ واؤ تھا۔تعلیل میں واؤ مبدل بہ ہمزہ ہو گیا۔ یہ مادہ باب افتعال میں آکر اعتیاد بن گیا۔اعتیاد کے معنی ہیں کسی کام کو عادت بنا لینا (خوگرفتن) اس سے اسم فاعل اصل شکل میں معتود بروزن معتقداور اسم مفعول بروزن معتبر تھا۔تعلیل میں واؤ مکسور ومفتوح الف سے بدل گیا اور دونوں یکساں بروزن ممتاز ہو گئے۔عبارت کے سیاق سباق سے معنی متعین ہوں گے۔کسی فعل کو بطور عادت اختیار کرنے والا یا وہ فعل جس کو عادت بنا لیا جائے۔معتاد کے دونوں معنی ہیں اور لفظ عادی جو عادت کی طرف منسوب ہے اس کے بھی دونوں معنی درست ہیں یہ نہ مہند ہے نہ مفرس خالص عربی لفظ ہے۔جن حضرات نے لفظ عادی بمعنی خوگر کو غلط قرار دیا انھوں نے اس کو ع د و سے مشتق سمجھا اور فضول بحث میں الجھ گئے۔تعجب ہے کہ شوق نیموی

جیسے عربی کے فاضل محقق بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔‘‘(۱۷)

اسی طرح دوسرا مضمون ’’اردو املا ایک تنقیدی مطالعہ‘‘ ہے۔اس مضمون میں بھی مولانا نے مصنف کے تسامحات کو اجاگر کیا ہے۔ نیز مصنف کی سفارشات کو رد کیا ہے۔یاد رہے، رشید حسن خان ہمارے ان محققین میں ہیں جن کے یہاں تسامحات کم سے کم پائے جاتے ہیں۔ تحقیق میں جس قدر تلاش و جستجو اور احتیاط کے قائل رشید صاحب ہیں ان کے معاصرین میں دوسرا کوئی اور نظر نہیں آتا۔یہی نہیں تحقیقی اصولوں کی پاسداری کرنا خاں صاحب کے امتیازات میں شمار ہوتا ہے۔اس کے باوجود ان کی دو کتابوں پر اس قدر سخت تنقید مولانا کی وسعت علمی اور زبان کے تئیں سنجیدہ محبت کا بیّن ثبوت ہے۔اردو املا پر تنقید کرتے ہوئے الف مقصورہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’یہ کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ وہ عربی ترکیب ہے اور یہ فارسی۔اگر چہ پہلے کا مروجہ املا آپ کے نزدیک دماغی پراگندگی کا سبب تھا تو اب یہ انقلاب پہلے سے زیادہ پراگندگی بلکہ وحشت کا موجب ہوگا اور بہت سی خرابیوں کا سبب بنے گا مثلاً ایک ادارے کا تاریخی نام دارالھدیٰ و الوعظ ہے۔اس کے اعداد ۱۲۶۸ ہیں یہ اس کا سال تعمیر ہے۔مورخ کا قلم جو اس نئے انقلاب کا خوگر ہو جائے گا اور اپنی تحریر میں اعلا، ادنا، مصطفا وغیرہ لکھے گا وہ یہاں دارالھدا لکھ دے گا۔ مادۂ تاریخ غلط ہو جائے گا۔

قدیم خوبصورت اور حاملِ روایات الفاظ کی شکل وصورت بھی بگاڑی جائے اور پھر بھی کلیہ نہ بن سکے تو انقلاب لانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔صدیوں سے سب جانتے ہیں کہ اردو میں ایک ایسا الف بھی ہے جو بشکل یٰ لکھا جاتا ہے اور کبھی صرف کھڑے زبر سے کام لیا جاتا ہے۔

مسجد اقصیٰ، من وسلویٰ، دم عیسیٰ، عصائے موسیٰ، علی مرتضیٰ، ملاء اعلیٰ

وغیرہ ان الفاظ کے ساتھ جو روایات وابستہ ہیں ان کو ادب وتاریخ کے صفحات سے محو نہیں کیا جا سکتا اور بغیر ان روایات کے ان الفاظ کے معنی اور مواقع استعمال سمجھ میں بھی نہیں آ سکتے۔ انھیں انمٹ روایات میں سے ان کا یہ املا بھی ہے کہ آخر میں الف بشکل ی لکھا جاتا ہے۔'' (۱۸)

مولانا واصف دہلوی زبان وادب کے بہترین عالم ہونے کے ساتھ ساتھ فن خطاطی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ شاید اسی لیے اردو املا پر انھوں نے سب سے زیادہ تنقید کی ہے۔ تقریباً سو صفحات پر مشتمل یہ تنقید نہایت محققانہ اور منطقی امتزاج کی حامل ہے۔ مولانا کے اعتراضات اور دلیلیں نہایت مضبوط ہیں۔ شاید یہی سبب ہے کہ ان مضامین کا کوئی ردعمل مخالف سمت سے نہیں آیا۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد مولانا کی علمی صلاحیتوں اور تحقیقی نگاہ کا قابل ہونا پڑتا ہے۔ اگر مثالیں دی جائیں تو صفحات کے صفحات سیاہ کرنے پڑ جائیں گے اس لیے ان سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا دو طویل مضامین کے علاوہ کتاب میں تین مختصر مضامین شامل ہیں۔ اگرچہ یہ مضامین نہایت مختصر مگر معلومات افزا ہیں۔ ان مضامین میں پہلا مضمون رشید حسن خان ہی کی ایک اور کتاب ''اردو کیسے لکھیں'' پر مختصر تبصرہ ہے۔ یہاں بھی مولانا کا انداز تنقید پہلے کی طرح ہی ہے۔ مختلف ضمنی عناوین کے تحت انھوں نے پوری کتاب کا جائزہ لیا ہے اور مختصر مگر جامع گفتگو کی ہے۔ نیز مصنف کی کوتاہیوں پر سخت تنقید کی ہے۔ فوراً بعد کا مضمون گوپی چند نارنگ کی کتاب املا نامہ پر تبصرے کی صورت میں ہے۔ پھر مترادف الفاظ کے عنوان سے ایک مفصل مضمون ضبط تحریر میں آ گیا ہے۔ اس مضمون میں عربی زبان کے مترادفات اور اس کے اسباب، اردو زبان میں ذخیرۂ الفاظ، مترادف کی تعریف، فصاحت اور معیار فصاحت پر بہت تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

اگرچہ مولانا ساری زندگی عربی زبان وادب کے گیسو سنوارتے رہے اور اردو زبان وادب کی طرف انھوں نے خاطر خواہ توجہ نہیں کی تاہم ان کی مذکورہ دو کتابیں ان کو اردو تحقیق کی دنیا میں ہمیشہ زندہ رکھیں گی اور آنے والے محققین کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گی۔

عبدالرزاق قریشی:

بیسویں صدی کے ربع آخر میں محققین کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ لینے کی غرض سے بیشتر محققین کوموضوع بنا کر تحقیق کی گئی اوران کے علمی وتحقیقی کارناموں پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔تاہم ایسے کئی نام ابھی تک موضوع گفتگو بننے سے رہ گئے ہیں،جنھیں ابھی تک اپنے قدردانوں کا انتظار ہے۔ان میں ایک معتبر نام عبدالرزاق قریشی کا بھی ہے۔

عبدالرزاق قریشی اعظم گڑھ ضلع کے ایک معروف گاؤں ''بسہم'' میں ۲۱/اپریل ۱۹۱۲ء کوایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام شیخ احمد علی تھا۔ابھی ان کی عمر آٹھ ماہ تھی کہ ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ان کی پرورش ان کی دادی ''گنی بیگم'' کے ہاتھوں ہوئی۔چار سال کی عمر میں سایۂ پدری سے بھی محروم ہوگئے،اس لیے ان کی تعلیم وتربیت ان کے چچا سخاوت علی کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔سخاوت علی اس وقت بمبئی میں سروے ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے،اس لیے انھوں نے عبدالرزاق قریشی کو بمبئی بلا لیا اور کھنڈیا محلّہ کے اردو میونسپل اسکول میں ان کا داخلہ کرادیا(خیال رہے کہ اس وقت تک بسہم اوراس کے اطراف میں کوئی اسکول نہیں تھا)یہ واقعہ ۲۲-۱۹۲۱ء کا ہے،جب ان کی عمر صرف آٹھ یا نو سال کی تھی۔انھوں نے کرائسٹ چرچ اسکول بمبئی سے سینیر کیمبرج تک تعلیم حاصل کی۔بے پناہ شوق کے باوجود معاشی پریشانیوں کے باعث وہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کرسکے۔

تعلیمی سلسلہ منقطع ہوجانے کے بعد انھیں تلاش معاش کی فکر ہوئی۔انھوں نے اپنی ملازمت کا آغاز ایک فلمی پرچہ ''عکاس'' سے کیا،لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد انھیں ڈون باسکو ہائی اسکول کے شعبۂ اطفال میں پڑھانے کی جگہ مل گئی،جہاں وہ لمبے عرصے تک کام کرتے رہے۔یہاں سے تعلق منقطع ہوجانے کے بعد فیلو شپ اسکول میں چلے گئے۔مذکورہ دونوں اسکولوں میں کل ملا کر انھوں نے دس برس تک کام کیا۔اسی طویل تجربے کا نتیجہ تھا کہ یکم جون ۱۹۴۵ء کو انھیں انجمن اسلام ہائی اسکول میں اونچی کلاسوں میں اردو اور فارسی پڑھانے جگہ مل گئی۔اس اسکول میں انھوں نے تقریباً پندرہ برس تک درس وتدریس کے فرائض انجام دئے۔درس وتدریس کے پیشے سے منسلک ہونے کے سبب ان کی علمی تشنگی روز بروز بڑھتی گئی اور جب ۱۹۴۷

میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم ہواتو سید نجیب اشرف ندوی اس کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ندوی صاحب ایک مدت تک دارالمصنفین اعظم گڑھ میں رفیق کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔اس لیے جب ندوی صاحب انجمن کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے تو وطنی یگانگت اور قربت کے سبب قریشی صاحب کی دلچسپی انسٹی ٹیوٹ میں بڑھنے لگی۔جس قدران کا علمی معیار بڑھتا جاتا تھا،انھیں انجمن اسلام ہائی اسکول کا علمی میدان تنگ نظر آتا تھا،مگر اسکول کے ہیڈ ماسٹر خلیفہ ضیاء الدین صاحب ان کے ایسے قدر شناس تھے کہ کسی صورت انھیں چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔بالآخر بڑی سفارشوں کے بعد ان کے مستعفی ہونے پر رضا مند ہوئے۔انجمن اسلام ہائی اسکول سے مستعفی ہونے کے بعد ان کا رشتہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے قایم ہو گیا اور یہ رشتہ اتنا پائیدار ثابت ہوا کہ ۱۹۷۱ء میں جب ان کی عمر ۵۸ سال کی ہوگئی اور ان کی سبکدوشی کا وقت آ گیا تو انسٹی ٹیوٹ کے ارباب حل وعقد نے ان کی مدتِ کارکردگی میں اضافہ کرنا بہ خوشی قبول کرلیا۔

تحقیقی کاموں کے علاوہ انجمن کے ترجمان ''نوائے ادب'' سہ ماہی کی ترتیب میں وہ سید نجیب اشرف ندوی کے شریک کار رہے اور ندوی صاحب کی وفات کے بعد ''نوائے ادب'' کے مدیر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتے رہے۔۱۹۷۷ء میں انھوں نے انسٹی ٹیوٹ کی ذمہ داریوں سے سبک دوشی حاصل کرلی۔سبک دوشی کے بعد سفر حج کی تیاریاں کر رہے تھے اور عزیز و اقارب سے ملنے کی غرض سے اپنے آبائی وطن آئے تھے کہ جولائی کے آخری ہفتے میں اسہال کا عارضہ لاحق ہوا۔علاج ومعالجہ کے باوجود کوئی افاقہ نہیں ہوسکا اور یہ معمولی سا مرض مرض الموت ثابت ہوا۔بالآخر ۳۰ جولائی ۱۹۷۷ء کو صبح نو بجے دل کا دورہ پڑا، دو تین بار قے ہوئی اور اسی دن بوقتِ سہ پہر فرشتۂ اجل کو لبیک کہا۔۳۱ جولائی کو اپنے آبائی قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

قدرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ صرف لیلائے ادب کے گیسوئے پرخم ہی نہیں بلکہ اس کائنات کے کاکلِ پیچاں کو سلجھانے کا کام جن ہاتھوں کو سپرد ہوا ہے وہ اکثر زلف جاناں کو سلجھانے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔عبدالرزاق قریشی کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ان کی شادی بسہم سے دس کلومیٹر دور

’’پھریہا‘‘ (علامہ حمید الدین فراہی کا مولد اور علامہ شبلی کا نانیہال) کے ایک زمیندار گھرانے میں ہوئی تھی شادی کے محض ایک سال بعد ہی اہلیہ سے ان کی نا اتفاقی وہ خطرناک صورت حال اختیار کر گئی جس کا نتیجہ طلاق کی صورت میں رونما ہوا۔انھوں نے اپنی بقیہ زندگی تجرد کے ساتھ بسر کی اور تا عمر علمی اور تحقیقی کاموں میں مصروف رہے۔

قریشی صاحب نہایت خلیق اور ملنسار شخصیت کے مالک تھے۔حالانکہ بمبئی ان کے وطن ثانی کی حیثیت رکھتا تھا تاہم انھیں اپنے وطن سے بے حد لگاؤ تھا۔گاؤں سے آنے والوں سے بہت تپاک سے ملتے تھے،اس لیے اکثر گاؤں سے آنے والے ان کے یہاں قیام کرتے تھے۔وہ ان سے گاؤں کے ایک ایک فرد کی خیریت دریافت کرتے ،کھیت کھلیان اور باغوں کی باتیں کرتے اور گاؤں کا تذکرہ بڑے شوق سے کرتے۔گاؤں سے آنے والوں میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہوتی تھی جو علاج کی غرض سے آتے تھے۔وہ اپنے مہمان مریضوں کو مشورہ سے لے کر ڈاکٹر کے انتخاب،ڈاکٹر سے ملاقات کے وقت کا تعین ،مریض کو ڈاکٹر تک پہنچانا حتیٰ کہ مریضوں کی تیمارداری تک کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔جب تک مریض بمبئی میں ہوتا ، اس کی خاطر داری میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتے۔وطن سے ان کی محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ عمر کے آخری دنوں میں وہ گاؤں کا ذکر بار بار کرتے تھے اور سبک دوشی کے بعد وطن میں قیام کرنے کے خیال سے بہت خوش تھے۔ارباب دارالمصنفین کی محبت تو عقیدت کی شکل اختیار کر گئی تھی جس کا اظہار اکثر کیا کرتے تھے۔یہاں تک کہ انتقال سے پہلے یہ وصیت کر ڈالی کہ ان کے بعد ان کا سارا اثاثہ اور چھ ہزار روپے جو انھوں نے پس انداز کر رکھے تھے،دارالمصنفین کو دے دئے جائیں۔لہٰذا ان کے انتقال کے بعد ان کی کتابیں اور غیر مطبوعہ مسودے تانگے میں لاد کر دارالمصنفین میں پہنچا دیے گئے،نیز وہ چھ ہزار روپے بھی دارالمصنفین کو دے دیے گئے جو انھوں نے بالخصوص اسی کے لیے بچا رکھے تھے۔ان کو ارباب دارالمصنفین سے جو قلبی لگاؤ تھا وہ ان کی تحریروں میں بھی جھلکتا ہے۔اس حوالے سے سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھا ہے کہ:

> ’’مصنف مرحوم کی پوری زندگی بمبئی میں گزری لیکن ہاتھ میں قلم پکڑ
> لیتے تو معلوم ہوتا کہ دارالمصنفین میں بیٹھ کر سب کچھ قلم بند کر رہے

ہوں۔ان کا طرز تحریر بالکل دبستانِ شبلی ہی کے رنگ کا ہے''(۱۹)

ان کے مزاج میں استغنا اور منکسر المزاجی بہت تھی اور ہر شخص سے وہ بڑے خلوص سے پیش آتے تھے۔لوگوں کے مسائل حل کرنے سے انھیں خوشی ہوتی تھی۔خصوصاً طالب علموں سے بہت شفقت سے پیش آتے تھے اور ان کے مسائل حل کرنے میں کبھی دریغ نہ کرتے چاہے اس میں ان کا ذاتی نقصان ہی کیوں نہ ہو۔یہ ان کی علم دوستی اور نیک نفسی کی بڑی مثال ہے۔ایمانداری اور فرض شناسی کا یہ عالم تھا کہ ایک بار وہ چھٹی لے کر وطن گئے اور وہاں علالت کی وجہ سے قیام مقررہ میعاد سے زیادہ ہوگیا۔وہ پیشگی تنخواہ لے کر گئے تھے۔واپس لوٹے تو خود ہی حساب لگا کر معلوم کیا کہ جتنی چھٹی ان کی جمع تھی،اس سے دو چار دن زاید ہوگئے ہیں۔انھوں نے زاید دنوں کی تنخوہ کی واپسی پر اصرار کیا۔آخر بہت سمجھانے بجھانے پر اس بات پر آمادہ ہوئے کہ اس تنخواہ کو اگلی چھٹی میں منہا کر دیا جائے۔ان کی انکساری کی مثال دیتے ہوئے سید شہاب الدین دسنوی لکھتے ہیں:

''استغنا کی ایک شان یہ بھی تھی کہ نوائے ادب اور تحقیق وتالیف کے سلسلے میں انھیں مختلف ادیبوں اور اسکالروں سے خط وکتابت کرنی پڑتی تھی۔ایک روز میں نے انھیں ڈاک خانے کے عام قسم کے کارڈ اور ان لینڈ کاغذ پر خطوط لکھتے دیکھا تو کہا' آپ اردو انسٹی ٹیوٹ کی اسٹیشنری اور ٹکٹ کیوں نہیں استعمال کرتے'؟ ہنس کر فرمانے لگے۔'بھائی میں اپنی طرف سے انسٹی ٹیوٹ کی یہی چھوٹی سی خدمت تو کرتا ہوں''۔(۲۰)

اگرچہ قریشی صاحب باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکے،جس کا بڑا سبب ان کی معاشی تنگی تھا،لیکن حصول علم کا شوق ان کی رگ وریشے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ان کی خوش قسمتی یہ رہی کہ قدرت کی طرف سے اس شوق کی تکمیل کا سامان بھی فراہم ہوگیا۔۱۹۳۲ میں نجیب اشرف ندوی اسمٰعیل یوسف کالج میں لکچرار بن کر آگئے تھے۔اعظم گڑھ اور بالخصوص دبستانِ شبلی کے دلدادہ ہونے کے سبب قریشی صاحب ان سے ملنے لگے ۔رفتہ رفتہ یہ ملاقات استاد اور شاگرد کے رشتے میں تبدیل ہوگئی۔نجیب صاحب کے ذاتی کتب خانے میں

کتابوں کا بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ مطالعے کا شوق قریشی صاحب کو ہر اتوار کو نجیب صاحب کے بنگلے تک کھینچ لاتا۔ حالانکہ نجیب صاحب کا بنگلہ اور قریشی صاحب کی رہایش گاہ کے درمیان کا فاصلہ گیارہ میل کا تھا۔ پھر بھی قریشی صاحب بلا ناغہ ہر اتوار کو ان کے بنگلے پر موجود ہوتے اور سارا دن مطالعے میں غرق رہتے۔ بمبئی کی تیز بارش اور طوفانی ہوائیں بھی ان کے اس شوق کو نہ روک سکتی تھیں۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا۔ جب تک ان کی صحت ساتھ دیتی رہی۔ قریشی صاحب کی شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد ایوب واقف نے لکھا ہے کہ:

> ''پہاڑوں میں بہت سے پہاڑ ایسے ہوتے ہیں جو دور سے حد درجہ دلکش اور خوشنما لگتے ہیں اور دور سے دیکھنے والے حضرات ان کی عظمت کے قصیدے پڑھتے ہیں۔ لیکن ان کے قریب جائیے تو ان کی دلکشی وخوشنمائی برقرار نہیں رہتی۔ بلکہ وہ مٹی، کنکر اور پتھر کے ذخیرے کے سوا کچھ نہیں لگتے۔ لیکن کچھ پہاڑ ایسے ضرور ہوتے ہیں جو جس قدر دلکش اور خوشنما دور سے نظر آتے ہیں اسی قدر قریب سے بھی نظر آتے ہیں۔ عبدالرزاق قریشی اس پہاڑ کی مانند تھے جو دور ونزدیک سے یکساں طور پر خوشنما نظر آتا ہے۔ یہ ان کی شخصیت کا ایک نمایاں وصف تھا کہ اپنی اصلیت سے زیادہ وہ اپنے کو کبھی بڑھا چڑھا کر لوگوں کے سامنے پیش نہیں کرتے تھے۔ اس نمود ونمایش کی دنیا میں جہاں ہر شخص اپنے کو تیس مار خاں گردانتا ہے، قریشی صاحب نے اپنے کو ایک معمولی انسان کے سوا اور کچھ نہ جانا''۔ (۲۱)

قریشی صاحب نے ساری عمر تصنیف وتالیف میں بسر کی اور کئی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ وہ بنیادی طور پر محقق ہیں۔ ان کا پہلا تحقیقی کارنامہ ''مرزا مظہر جانِ جاناں اور ان کا کلام ۱۹۵۹ء میں انجمن اسلام کے اشاعتی ادارے ادبی پبلشر بمبئی سے شایع ہوا۔ مرزا مظہر جانِ جاناں پر یہ پہلا تحقیقی مقالہ ہے۔ اس مقالے میں قریشی صاحب نے جس عرق ریزی سے کام کیا ہے آج تک کوئی دوسرا تحقیقی مقالہ اس پر کوئی اضافہ نہیں کرسکا ہے۔ انھوں نے مرزا مظہر کے حالاتِ زندگی بالتفصیل درج کیے ہیں۔ نیز ان کے عہد کا پورے تاریخی

تناظر میں جائزہ لیا ہے اور آخر میں ان کے کلام اور دوسرے ادبی کارناموں پر مفصل تبصرہ بھی پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ مقالے کے آخر میں ان کے کلام کا تحقیقی متن بھی شامل کر دیا ہے۔اس مقالے کی تحقیقی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سید شہاب الدین دسنوی رقم طراز ہیں:

> ''اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں سب سے پہلے قریشی صاحب نے مرزا مظہر جانِ جاناں اور ان کے اردو کلام کو تحقیق کا موضوع بنایا۔جب یہ کتاب کی صورت میں ان کے عالمانہ مقدمے کے ساتھ شایع ہوئی تو اردو کے ایک بڑے بلند پایہ محقق اور نقاد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ کتاب ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کی تھیسس کی حیثیت سے پیش کردی جاتی تو پی۔ایچ۔ڈی۔کی ڈگری مل جاتی''۔(۲۲)

اگرچہ ''مرزا مظہر جانِ جاناں اور ان کا کلام'' عبدالرزاق قریشی کا پہلا تحقیقی کارنامہ ہے تاہم اس کتاب کے مطالعے سے ان کی تحقیقی بصیرت کا اندازہ ہو جاتا ہے نیز ان کے تحقیقی طریقۂ کار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔انھوں نے جس فنی پختگی اور تحقیقی اصولوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے،اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔مرزا مظہر کا شمار اس عہد کے بڑے صوفیا میں ہوتا ہے۔اس کے علاوہ ان کی ادبی،شعری ولسانی خدمات انھیں ادب کے دربار میں بھی بقائے دوام عطا کرتی ہیں۔قریشی صاحب نے مذکورہ کتاب میں پہلے اس عہد کی سیاسی ،سماجی ،اقتصادی،اخلاقی اور مذہبی صورت حال کا بالتفصیل جائزہ لیا ہے اور اس تناظر میں ان کی شخصیت اور تصوف کی ضرورت واہمیت کو اجاگر کیا ہے۔اس عہد کی ادبی صورت حال پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے مرزا مظہر کی ادبی قدر و قیمت کا تعین بھی کیا ہے۔انھوں نے مکمل حالات کا جس تاریخی بصیرت کے ساتھ تجزیہ کیا ہے وہ اس کتاب کو تاریخی حیثیت عطا کر دیتی ہے۔ایک ایک واقعات کی چھان بین میں انھوں نے جس جاں فشانی کا مظاہرہ کیا ہے اس کا اندازہ کتاب کے مشمولات پر ایک سرسری نظر ڈال کر لگایا جاسکتا ہے۔

عہد مرزا مظہر جانِ جاناں سیاسی ،سماجی ،اقتصادی اور مذہبی بدحالی کا زمانہ تھا۔امرا شباب وشراب کے

نشے میں مست تھے اور وقت پر تنخواہیں نہ ملنے کے سبب فوجوں نے لوٹ مار شروع کر دی تھی، جس کے سبب عام اخلاقی معیار بھی پست ہو گیا تھا۔ معاشی بدحالی اور تہذیبی انحطاط کے سبب لوگ مایوسی کا شکار ہو گئے تھے ۔ایسے حالات میں عقاید میں تزلزل آ جانا بالکل فطری بات ہے۔ عہد مرزا مظہر کے مذہبی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے قریشی صاحب نے مولوی نعیم اللہ بہرائچی کے حوالے سے لکھا ہے:

''اکثر عورتیں جہالت کی وجہ سے شرک اور اہلِ شرک کے مراسم کی ادائی میں مبتلا ہیں ۔امراض کی حالت میں، خصوصاً چیچک (سیتلا) کی بیماری میں کم عورتیں ایسی ملیں گی جو شرک نہ کرتی ہوں۔ دیوالی کے موقع پر مسلمان جہلا اور خصوصاً ان کی عورتیں اہلِ ہنود کی رسمیں بجالاتی ہیں اور اپنی عید کی طرح اسے مناتی ہیں۔ وہ اپنی بیاہی لڑکیوں کے یہاں ہندوؤں کی طرح تحفے تحائف بھیجتی ہیں۔ برتنوں کو رنگ کر اور ان میں رنگین چاول رکھ کر بھیجتی ہیں۔ اور ایسے دنوں کو اہمیت دیتی ہیں۔ اسی طرح وہ مشائخ کے نام پر جانور نذر کرتی ہیں اور ان کی قبروں پر جا کر ان کو ذبح کرتی ہیں۔ وہ پیروں اور بیبیوں کے نام سے روزہ رکھتی ہیں ۔ یہ نام انھوں نے تراش لیے ہیں۔ وہ افطار کے لیے خاص خاص قسم کے کھانے پکاتی ہیں اور ان روزوں کے توسل سے ان سے (پیروں اور بیبیوں) اپنی مرادیں مانگتی ہیں اور (اگر وہ پوری ہو گئیں) تو اسے ان کی طرف منسوب کرتی ہیں۔ اکثر افطار کے وقت حرام باتوں کی مرتکب ہوتی ہیں اور بلا وجہ بھیک مانگ کر اس سے روزہ افطار کرتی ہیں اور اپنی حاجت پوری ہونے کو اس ممنوع فعل کی طرف منسوب کرتی ہیں''۔ (۲۳)

ان حالات کا جائزہ لینے کے بعد عبدالرزاق قریشی نے شاہ ولی اللہ اور علمائے فرنگی محل کی اصلاحی خدمات کے ساتھ شاہ فخرالدین اور مرزا مظہر جان جاناں کی خدمات کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان بزرگوں کی

مساعیٔ جمیلہ سے پیدا شدہ نتائج کا تجزیہ بھی نہایت محققانہ طور پر پیش کیا ہے۔اسی طرح اس عہد کی ادبی صورت حال کا ذکر بھی بڑی شرح بسط کے ساتھ کیا ہے،جس سے اس عہد کا پورا شعری منظر نامہ ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔اصلاح زبان اور ترکِ ایہام گوئی کی تحریک کے ضمن میں وہ مرزا مظہر کی کوششوں کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''اس غیر فطری طرز سخن کی اصلاح کی طرف جس شاعر نے سب سے پہلے توجہ کی وہ مرزا مظہر ہیں۔مرزا صاحب کے بلند مذاقِ سخن،نکتہ وری اور نکتہ سنجی کو ان کے تمام ہم عصر تذکرہ نگاروں نے تسلیم کیا ہے۔انھوں نے اپنے فارسی کے بیس ہزار اشعار میں سے صرف ایک ہزار اشعار کا انتخاب کیا۔یہ ان کی وسعت قلب ونظر کے علاوہ سخن فہمی وسخن سنجی اور شاعرانہ بلند مذاقی کا بین ثبوت ہے۔انھوں نے فارسی اشعار کا اتنا عمدہ انتخاب (خریطۂ جواہر) تیار کیا،جو بقولِ غالب اس عہد کے لوگوں کے مذاقِ شعری کی اصلاح کا سبب بنا''۔(۲۴)

قریشی صاحب کے طریقۂ تحقیق اور باریک بینی کا یہ عالم تھا کہ مرزا مظہر کی زبان وبیان سے متعلق سودا کے ایک قطعے کا ذکر کیا ہے۔پھر قطعۂ مذکور پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''سودا پر اردو میں دو مبسوط کتابیں لکھی گئیں ہیں ۔ ایک شیخ چاند(مرحوم) کی 'سودا'اور دوسری ڈاکٹر خلیق انجم کی 'مرزا محمد رفیع سودا'۔ان دونوں کتابوں میں بھی اس قطعہ کا ذکر ملتا ہے۔۔۔۔۔۔لیکن دونوں مصنفین نے اپنے مآخذ کا کوئی حوالہ نہیں دیا''۔(۲۵)

عبدالرزاق قریشی نے کلیات سودا کے چھبیس مخطوطوں کا ذکر کیا ہے اور ان سب کی کیفیات پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ان میں سے صرف سات نسخوں میں یہ قطعہ پایا جاتا ہے،اور وہ بھی ہر نسخے میں تبدیلیوں کے ساتھ۔نیز یہ بھی کہ جن نسخوں میں یہ قطعہ ملتا ہے وہ صحت کے اعتبار سے ناقص ہیں۔ان تمام

باتوں کا تجزیہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زیر بحث قطعہ سودا کا کلام ہو ہی نہیں سکتا۔اپنی بات کی تائید میں وہ یہ منطقی استدلال بھی پیش کرتے ہیں کہ ''سودا کو اختلاف عقاید کے باوجود مرزا صاحب سے جو عقیدت ومحبت تھی اس کی شہادت وہ قطعۂ تاریخ ہے جو انھوں نے مرزا صاحب کے شہید ہونے پر لکھا تھا۔۔۔۔یہ بھی ذہن میں رہے کہ مرزا صاحب کا قاتل سودا کا ہم عقیدہ یعنی شیعہ تھا''۔(۲۶)

مذکورہ مباحث پر غور کرنے کے بعد یہ اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ قریشی صاحب نے ایک ایک واقعات کی صحت کے لیے کس قدر چھان بین کی ہے اور اپنی بات کو پورے دلائل کی روشنی میں پیش کیا ہے۔اکثر مقامات پر موضوع حد درجہ خشک ہو جانے کے باوجود زبان وبیان پر دسترس اور اسلوب کی دلکشی قاری کو بے مزہ نہیں ہونے دیتی۔یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ''مرزا مظہر جانِ جاناں اور ان کا کلام'' اردو تحقیق وتدوین کی دنیا میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے،جس پر عبدالرزاق قریشی کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا ہے۔

عبدالرزاق قریشی کا دوسرا اہم کارنامہ دیوان عزلت کی بازیافت اور تدوین ہے۔عزلت اگرچہ میر وسودا کے معاصرین میں ایک اہم نام ہے مگر ان کی بدقسمتی یہ رہی کہ ایک مدت تک ان کا دیوان اہل ادب کی نظروں سے پوشیدہ رہا۔بایں سبب ادب کی تاریخ لکھنے والے انھیں نظرانداز کرتے رہے۔حالانکہ عزلت کا ذکر تمام قابل ذکر تذکروں میں موجود ہے،مگر کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی۔نتیجتاً اردو کا یہ عظیم المرتبت شاعر ہماری چشم التفات سے محروم رہا۔اگر تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو عزلت وہ پہلا شاعر ہے جس نے اپنے اردو دیوان کا مقدمہ بھی اردو میں لکھا،مگر اردو ادب کی تاریخ لکھنے والوں نے عزلت کے دیوان کے نایاب ہونے کی صورت میں اس شرف کا سہرا سودا کے سر باندھ دیا اور اردو ادب کی تاریخ میں یہ غلط فہمی اب تک چلی آرہی ہے۔اس کا ایک سبب شاید یہ بھی ہو کہ دیوان عزلت کی تشہیر اس طرح نہیں ہوسکی جس طرح ہونی چاہئے تھی اور اب ایک بار پھر یہ دیوان تقریباً نایاب ہو چکا ہے۔پہلی اشاعت پر لگ بھگ ساٹھ برس کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اب تک اس کی دوسری اشاعت عمل میں نہیں آسکی ہے۔اگر علمائے ادب اس طرف بھی توجہ دیں تو ایک بڑی غلط فہمی دور ہونے کے ساتھ ساتھ عزلت کو اردو ادب کی تاریخ میں ان کا صحیح مقام مل

سکتا ہے۔عزلت کی اس اولیت کے ضمن میں عبدالرزاق قریشی رقم طراز ہیں:

''دیوان عزلت کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا دیباچہ اردو میں ہے۔ورنہ یہ رسم تھی کہ شعرائے اردو اپنے اردو دیوان کا بھی دیباچہ فارسی میں لکھا کرتے تھے۔اگر چہ دیباچہ کی عبارت سے عزلت کے کسی ادبی نقطۂ نگاہ یا کسی اور اہم بات کا علم نہیں ہوتا لیکن اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کسی اردو دیوان کا پہلا اردو دیباچہ ہے''۔(۲۷)

عزلت کا امتیاز صرف یہی نہیں کہ اس نے سب سے پہلے اپنے دیوان کا دیباچہ اردو میں لکھا بلکہ عزلت اپنے معاصرین میں وہ واحد شاعر ہے جس نے سب سے زیادہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔کمیت و کیفیت کے اعتبار سے بھی عزلت اپنے معاصرین میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔سید نجیب اشرف ندوی اس کی امتیازی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اردو زبان وادب کی ابتدا،ترویج اور توسیع کے سلسلہ میں جن گجراتیوں نے کام کیا،ان میں احمد آباد کے ولی کے بعد سورت کے سید عبدالولی عزلت کی شخصیت سب سے اہم و بلند ہے۔ عزلت نہ صرف اردو کے ایک اچھے شاعر تھے بلکہ اس زبان وادب کو ملکی رنگ دینے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔جہاں انھوں نے ساقی نامہ لکھا ہے وہیں بارہ ماسہ جیسی خالص ہندوستانی صنف شاعری کا بھی اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔خسرو کے بعد شاید یہ فخر عزلت ہی کے نصیب میں تھا کہ وہ ان کی طرح ہندی میں کبت،دوہروں،مکرنیوں،پہیلیوں وغیرہ کو بھی اپنے دائرۂ شاعری میں داخل کریں۔اردو کے شاعروں میں اس حیثیت سے کہ ان کے اردو دیوان کا دیباچہ اردو ہی میں ہے،اولیت کا فخر عزلت کو حاصل ہے''۔(۲۸)

دیوان عزلت کا مطالعہ کرتے ہوئے عبدالرزاق قریشی کے ذوق مطالعہ اور طریقۂ تحقیق کا بار بار قایل

ہونا پڑتا ہے۔انھوں نے عزلت کے حالات پر لکھتے ہوئے ان کے آبائی وطن اور بزرگوں کے حالات کے بیان میں جس دقت نظری کا ثبوت دیا ہے اور ایک ایک بات کی سند کے طور پر کئی حوالے درج کیے ہیں وہ ان کی وسعت مطالعہ اور تحقیقی بصیرت کے غماز ہیں۔غیر اہم واقعات کے بیان میں بھی انھوں نے واقعات کی تمام جزئیات کو ملحوظ رکھا ہے اور ہر جگہ استدلالی انداز بیان اختیار کیا ہے۔انھوں نے عزلت کے کلام پر تبصرہ وتنقید بھی کی ہے اور معاصرین کے کلام سے تقابل بھی۔اس طرح انھوں نے ہیرو پرستی کے بجائے تحقیق کے اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے عزلت کے مقام ومرتبے کے تعین کی کوشش کی ہے۔اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے جہاں عزلت کے کلام میں محاسن شعری تلاش کیے ہیں، وہیں ان کے کلام میں پائے جانے والے اسقام ومعائب بھی ان کی نظروں سے مخفی نہیں رہ سکے ہیں۔اتنا ہی نہیں بلکہ اصناف کے تعارف میں جب وہ کسی صنف کا تعارف پیش کرتے ہیں تو اس کی پوری روایت سے بحث بھی کرتے ہیں، جو وسعت مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں۔بارہ ماسہ کا تعارف پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس صنف شاعری کی ابتدا سنسکرت سے ہوئی لیکن سنسکرت میں بارہ ماسہ نہیں۔رامائن میں صرف ان چار موسموں کا ذکر ہے :بسنت، برسات، جاڑا، جاڑے کے بعد کا موسم۔کالی داس نے چھ موسموں کا ذکر کیا ہے۔یہ گرمی سے شروع ہوکر بسنت پر ختم ہوتا ہے۔کوی ماگھ نے بھی چھ موسموں کا ذکر کیا ہے لیکن نھوں نے ابتدا بسنت سے کی ہے۔'' پہلا بارہ ماسہ اپ بھرنش میں جن دھم سوری کا لکھا ہوا ہے۔جن دھم سوری تیرہویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کا بارہ ماسہ ساون سے شروع ہوکر اساڑھ پر ختم ہوتا ہے۔دوسرا بارہ ماسہ تقریباً اسی زمانہ میں بنے چند سوری نے لکھا۔چودھویں صدی میں (بسیل دیوراس)میں باری ماسہ کاتک سے شروع ہوکر چیت پر ختم ہوتا ہے۔جائسی، سادھن وغیرہ کے بارہ ماسے اساڑھ سے شروع ہوتے ہیں۔اس طرز نے قبول عام حاصل کیا اور ایک اصول سا بن گیا کہ بارہ

ماسے کی ابتدا اساڑھ سے کی جائے۔لیکن بعض شعرانے اس اصول کی
پابندی لازمی نہیں سمجھی''۔(۲۹)

دیوان عزلت کی تلاش و تحقیق کرتے ہوئے عبدالرزاق قریشی کو عزلت کی ایک اور بے بہا تصنیف ''راگ مالا'' ہاتھ لگ گئی۔ یہ اردو ادب میں موسیقی کے فن پر لکھی گئی اپنے نوع کی اکیلی تصنیف ہے۔اس کتاب میں ہندوستانی موسیقی کے چھ راگوں اور ان کی ہر ایک راگنیوں اور پتروں کی شعر کے ذریعہ مصوری کی گئی ہے۔ یہ پوری کتاب مثنوی کی ہیئت میں ہے جس میں تقریباً ساڑھے بارہ سو اشعار ہیں۔اس نایاب کتاب کو عبدالرزاق قریشی نے تین مختلف نسخوں کی مدد سے ترتیب دے کر انجمن اسلام کے اشاعتی ادارے ادبی پبلشرز بمبئی سے ۱۹۷۱ء میں شایع کیا۔

دیوان عزلت اور راگ مالا کی تدوین کے ذریعہ عبدالرزاق قریشی نے اردو کی ادبی تاریخ کے ایک گم شدہ باب کی از سر نو دریافت کی ہے۔ مذکورہ کتابوں کا معیار تحقیق انھیں اردو محققین کی صف اول میں لا کھڑا کر دیتا ہے، مگر افسوس کی عزلت کی طرح عبدالرزاق قریشی بھی ابھی تک اہل اردو کی عدم التفاتی کا شکار ہیں۔

عبدالرزازق قریشی ہمارے ان چند محققین میں سے ہیں، جنھوں نے اپنی پوری زندگی تحقیق و تدوین کے لیے وقف کردی۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ کلاسیکی شعرا کے کلام کی تدوین کی بلکہ اس میدان میں کام کرتے کرتے انھیں اس فن کی دشواریوں کا اچھا خاصہ تجربہ ہو چکا تھا۔ جب انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں بہ حیثیت ریسرچ اسسٹینٹ ان کا تقرر ہوا تو پوسٹ گریجویٹ کلاس کے طلبہ اور تحقیقی کام کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ان کے ارد گرد منڈلانے لگی۔ وہ لوگ ان سے مشورے کرتے، اپنے مقالے دکھاتے، مشکل مقامات کے حل طلب کرتے اور تحقیق سے متعلق دوسرے امور پر ان سے تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ عبدالرزاق قریشی بڑی خوش دلی اور خلوص کے ساتھ ان کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔اس وقت تک اردو میں اصول تحقیق سے متعلق کوئی ایسی کتاب موجود نہ تھی جو نو واردانِ تحقیق کی رہنمائی کر سکتی تھی۔ اس لیے بیشتر طلبا تحقیق کے ابتدائی اصول اور طریقۂ کار سے ناواقف ہوتے تھے۔ عبدالرزاق قریشی نے اس مسئلے کو سنجیدگی سے لیا اور ایک کتاب بعنوان ''مبادیاتِ تحقیق'' تصنیف کیا۔ اس کتاب کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''یہ رسالہ نوجوان محققوں کے لیے لکھا گیا ہے، خواہ وہ شوقیہ مضامین لکھتے ہوں یا پی۔ایچ۔ڈی۔ کی ڈگری کے لیے مقالے تیار کرتے ہوں۔ ممکن ہے یہ یونیورسٹی کے بعض رہنماؤں کے لیے بھی مفید ثابت ہو۔اس میں تحقیق کی مبادیات سے بحث کی گئی ہے اور عملی نقطۂ نگاہ اختیار کیا گیا ہے۔اب تحقیق عام ہوتی جارہی ہے اور ٹیکنیکل صورت اختیار کرچکی ہے۔اس لیے امید ہے کہ یہ رسالہ نوجوان محققوں کے لیے کارآمد ثابت ہوگا''۔(۳۰)

اس کتاب کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے سید شہاب الدین دسنوی رقم طراز ہیں:

''انھوں نے کسی کالج یا یونیورسٹی میں تعلیم نہیں پائی، لیکن مغربی طریقۂ تحقیق کا گہرا مطالعہ کر کے اس پر عمل پیرا تھے۔ان کی مختصر سی کتاب 'مبادیاتِ تحقیق' ریسرچ کرنے والوں کے لیے نہایت مفید ہدایت نامہ ہے اور اردو زبان میں اپنی طرز کی شاید پہلی کتاب''۔(۱۳)

یہ شہاب الدین صاحب کی احتیاط اور شریف النفسی ہے کہ انھوں نے شاید کا لفظ استعمال کیا ورنہ اس کتاب کے اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہونے میں کسی شک کی گنجایش نہیں ہے۔مشہور محقق پروفیسر گیان چند جین نے اپنی کتاب 'تحقیق کا فن' میں بھی اسے اولیت دی ہے البتہ تحقیق کی ایک شاخ تدوین متن پر ڈاکٹر خلیق انجم کی ایک کتاب 'متنی تنقید' اس سے ذرا پہلے ۱۹۶۷ء میں شایع ہو چکی تھی۔اشاعت کے اعتبار سے متنی تنقید کو مبادیاتِ تحقیق پر زمانی تقدم حاصل ہے ورنہ مبادیات تحقیق فروری ۱۹۶۷ء میں مکمل ہو چکی تھی۔کتاب کے مقدمے میں قریشی صاحب لکھتے ہیں: ''یہ رسالہ فروری ۱۹۶۷ میں تیار ہو گیا تھا، لیکن بعض دقتوں کی وجہ سے اس کی طباعت میں دیر ہوئی اور اشاعت کی نوبت اب آرہی ہے''۔(۳۲)

عبدالرزاق قریشی نے مبادیات تحقیق لکھ کر نہ صرف یہ کہ تحقیق کے طالب علموں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہے بلکہ ان تمام لوگوں کو جو تحقیق سے دلچسپی رکھتے ہیں، ایک ایسے اصول سے روشناس کرایا ہے، جس

کی روشنی میں کوئی بھی نو وارد تحقیق اپنی منزل تک بآسانی پہنچ سکتا ہے۔اگر چہ آج اصول تحقیق پر کئی کتابیں شایع ہوچکی ہیں، جو مبادیات تحقیق سے زیادہ جامع ہیں۔تاہم مبادیات تحقیق آج بھی اپنی سادگی اور عام فہم اسلوب کے سبب زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔اوراس زمانے میں تو یہ ایک بڑا کارنامہ تھا جب تحقیق کے فن پر کوئی باضابطہ کتاب نہیں تھی۔اس کتاب کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ آج بھی یہ کتاب ہندستان کی بیشتر یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔عبدالرزاق قریشی نے نہ صرف یہ کہ اس اچھوتے موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی بلکہ انھوں نے دوسرے اہلِ علم کو بھی خط وکتابت کے ذریعے اس طرف متوجہ کیا اوران سے اس فن کے متعلق مضامین لکھوائے۔ڈاکٹر تنویر احمد علوی اپنی کتاب 'اردو میں اصول تحقیق وترتیب متن' کے حرف آغاز میں اس تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''نوائے ادب کے مدیر (مرحوم) عبدالرزاق قریشی نے جن کو اس موضوع سے گہری دلچسپی تھی۔اپنے مکتوبات میں اس بات پر زور دینا شروع کیا کہ میں تنقید وتحقیقِ متن کے مسائل پر 'نوائے ادب' کے لیے بالاقساط لکھوں۔جب ایک باب لکھا جاتا تو دوسرے کے لیے تقاضے آنا شروع ہوجاتے۔جس کے نتیجہ میں تنقیدِ متن سے لے کر تعلیقات متن تک اس کے مختلف ابواب نوائے ادب کے شماروں میں اشاعت پذیر ہوتے رہے۔صرف ایک باب تالیف متن غالب نامہ شمارہ نمبر دو میں شایع ہوا''۔(۳۳)

عبدالرزاق قریشی باقاعدہ کسی کالج یا یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ نہ تھے۔ان کی علمی استعدا صرف سینیر کیمبرج تک تھی،تاہم ان کے علمی وادبی کارناموں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں تو ان کے علمی قد کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے باقاعدہ تعلیم نہ حاصل کی ہو، وہ صرف یہی نہیں کہ اردو بلکہ دوسری زبانوں کے ادب پر بھی گہری نگاہ رکھتا ہے۔فارسی اور عربی تو اس زمانے کے مسلمانوں میں عام تھی مگر انگریزی زبان مسلمانوں کے لیے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ایسے حالات میں بھی عبدالرزاق قریشی کی انگریزی دانی قابلِ رشک تھی۔مبادیات تحقیق کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ

اس موضوع پر انھوں نے سب سے زیادہ استفادہ انگریزی کی کتابوں سے کیا ہے۔ جا بہ جا انگریز مصنفین کے حوالے پوری کتاب میں بکھرے پڑے ہیں۔ کتابیات پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف تحقیق کے مغربی اصولوں کا مطالعہ کیا تھا بلکہ مغرب میں ہونے والی تحقیقات کی موجودہ صورت حال پر بھی ان کی گہری نگاہ تھی۔ اٹھائیس انگریزی اور دس اردو، فارسی کتابوں کے حوالوں کے علاوہ انھوں نے اپنے تحقیقی تجربات کو بھی شامل کتاب کر کے اسے زیادہ مفید اور کار آمد بنانے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر گیان چند جین جن کی عمر کا بڑا حصہ درس وتدریس میں گزرا اوران کی زیرنگرانی ایم فل اور پی ایچ ڈی سے لے کر ڈلٹ تک کے مقالے لکھے گئے، اس کے علاوہ انھوں نے نہ جانے کتنے مقالوں کے ممتحن کی ذمہ داری بھی نبھائی۔ انھوں نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے ان انگریزی کتابوں میں سے ایک بھی نہیں دیکھی تھی جو اس وقت ایم فل کے نصاب میں شامل تھیں۔ ایسے میں عبدالرزاق قریشی کا انگریزی کی اتنی ساری کتابوں کا مطالعہ اوراستفادہ صرف ادب دوستی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ ان کے تحقیقی نظریے کو سمجھنے کے لیے یہاں مبادیات تحقیق سے ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

> ''تحقیقی مقالہ میں کوئی علمی مسئلہ حل کیا جاتا ہے یا کوئی نئی بات کہی جاتی ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو بات کہی جائے وہ بنیادی طور پر نئی ہو۔ ایک بات پہلے کہی جا چکی ہے اس میں جدید معلومات کا اضافہ بھی تحقیق ہے۔ جو بات پہلے کہی گئی ہے۔ اگر اس میں غلطی یا غلطیاں ہوں تو ان کی تصحیح بھی تحقیق ہے۔ مسئلہ کے کسی نئے پہلو پر بحث کرنا یا روشنی ڈالنا بھی تحقیق ہے۔ کسی طے شدہ مسئلہ پر دوبارہ روشنی دالنا بھی تحقیق ہے۔ قدیم تحقیقات کو خواہ علم کی کسی شاخ سے تعلق رکھتی ہوں، نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ موجودہ ترقی کا سرا اگر تلاش کیا جائے تو وہ ماضی کے دھندلکے میں ملے گا''۔ (۳۴)

یہ مختصر سی کتاب ان کی وسعت مطالعہ، دقت نظری اور تحقیق سے ان کی گہری دلچسپی کی غماز ہے۔ انھوں نے اس کتاب کو چھ ابواب پر تقسیم کیا ہے، پھر باب اول میں پانچ ضمنی ابواب قایم کیے ہیں۔ ان

ابواب میں تحقیق کیا ہے، اس کی خصوصیات کیا ہیں، اس کی کتنی اقسام ہوتی ہیں، محقق کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں اور ایک محقق اپنے اوقات کو کس طرح استعمال میں لائے، ان تمام امور پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ انھوں نے اس باب میں تحقیق سے متعلق نہایت اہم باتوں اور طریقۂ کار کا ذکر کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ محقق کو اپنے موضوع کی وسعت، اس کی افادیت اور دورانِ تحقیق پیش آنے والی مشکلات کا اندازہ ہونا چاہئے ورنہ بعض اوقات درمیان ہی میں موضوع سے ہاتھ کھینچ لینا پڑتا ہے۔ تحقیق کے لیے وہ محقق کی موضوع سے دلچسپی اور متشکک ذہن کا مالک ہونے کے ساتھ وسیع المطالعہ اور صبر کا عادی ہونا ضروری قرار دیتے ہیں۔ ادبی محققین کے لیے وہ تاریخ اور مختلف علوم وفنون کا علم ہونا ضروری تصور کرتے ہیں۔ ان سب کے ساتھ ساتھ گہرا تنقیدی شعور اور دیانت داری بھی ان کے نزدیک تحقیق کے لیے لازمی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تحقیق کا مقصد کسی طرح کی کوئی منفعت نہ ہو بلکہ صرف حقائق کی دریافت کا جذبہ اور موضوع سے جنون کی حد تک دلچسپی کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ عبدالرزاق قریشی اس تعلق سے لکھتے ہیں:

> ”تحقیق کے لیے ذاتی دلچسپی ضروری ہے۔ ذاتی دلچسپی کے بغیر اعلیٰ درجے کی تحقیق نہیں ہوسکتی۔ تحقیق کا مادی معاوضہ کچھ نہیں ہے۔ اس کا بہترین معاوضہ وہ مسرت ہے جو محقق کو اپنی کامیابی پر ہوتی ہے۔ گیلیلیو طب کا پروفیسر تھا لیکن ریاضی اور علوم طبعی سے دلچسپی کی بنا پر اس نے طب کی معقول مشاہرہ کی پروفیسری چھوڑ دی۔ ہرشیل موسیقار تھا لیکن اسے علم نجوم سے دلچسپی ہوئی اور دوربین بنانے کا شوق ہوا۔ اس لیے وہ موسیقی کو ترک کر کے تحقیق کی طرف مایل ہوا، جس کا نتیجہ یورانس سیارہ کی دریافت اور بڑے سائز کی دوربین کی ایجاد تھی۔ ایڈورڈ براؤن کو فارسی ادب سے لگاؤ پیدا ہوا تو انھوں نے طب کو خیرآباد کہا اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ فارسی ادب کی تحقیق میں گزارا، اور اس میں وہ کمال حاصل کیا کہ ایران کے علمائے ادب نے ان کی استادی کو تسلیم

کیا۔(مولانا) شبلی نے وکالت کا نفع بخش پیشہ چھوڑ کر علم وادب کی تحقیق کو اپنایا۔ان کا شوق تحقیق انھیں مصر وروم وشام تک لے گیا۔ (مولانا) سید سلیمان ندوی نے کالج کی آرام دہ اور معقول تنخواہ کی ملازمت ترک کر کے ساری عمر دارالمصنفین کی علمی خانقاہ میں ایک معمولی مشاہرہ پر گزاردی۔۔۔۔ایران کے موجودہ دور کے ایک محقق آقائے سعید نفیسی نے طبابت کو تحقیق ادب پر قربان کردیا تھا''۔(۳۵)

اس کے علاوہ لائبریریوں کی اقسام اوران کے طریقۂ استعمال ،نوٹ لینا اور مبیضہ سے مسودہ اور پھر مقالے کی تسوید تک کے تمام مسائل اور ان سے نبردآزما ہونے کے طریقوں پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔مغربی محققین کی ادبی اور تحقیقی زندگی کے مختلف واقعات کے ساتھ ساتھ اردو کے مشہور محققین کی زندگیوں کے مختلف واقعات کا ذکر کر کے انھوں نے نو واردان تحقیق کو اس راہ میں پیش آنے والے مسائل سے آگاہ بھی کیا ہے اوراپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے راستے بھی دکھائے ہیں۔زبان نہایت آسان اور رواں ہے۔یہ مختصر سی کتاب اردو تحقیق کی دنیا میں عبدالرزاق قریشی کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

عبدالرزاق قریشی کی ادبی سرگرمیوں میں ایک قابلِ ذکر کام 'نوائے آزادی' کی ترتیب بھی ہے۔واقعہ یہ ہے کہ مئی ۱۹۵۶ء میں حیدرآباد میں انجمن ترقی اردو ہند کی ایک کانفرنس ہوئی تھی۔کانفرنس کی ایک نشست میں اردو اور تحریک آزادی کے موضوع پر بات چل رہی تھی۔اسی نشست میں یہ خیال پیش ہوا کہ اگلے سال جب جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی صد سالہ سال گرہ منائی جائے تو اس موقع پر اردو کی ایسی تحریروں اور نظموں کا ایک انتخاب پیش کیا جائے ،جن سے ملک کی آزادی کی تحریکوں کو تقویت پہنچی ہے۔یہ کام انجمن ترقی اردو ہند کے سپرد ہوا تھا لیکن کچھ دنوں کے بعد انجمن نے اس انتخاب کی ترتیب کی ذمہ داری لینے سے انکار کردیا۔انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر سید نجیب اشرف ندوی نے اس کام کی ذمہ داری انسٹی ٹیوٹ کے سر ڈال دی اور اس کام پر عبدالرزاق قریشی کا مقرر کردیا۔مئی ۱۹۵۷ء میں چار سو صفحات پر مشتمل یہ انتخاب قریشی صاحب کے مقدمہ کے ساتھ 'نوائے آزادی' کے نام سے زیور طبع سے

آراستہ ہوکر منظر عام پر آیا۔اس کا پہلا نسخہ انجمن کے صدر نے اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی خدمت میں پیش کیا۔سید شہاب الدین دسنوی نے اس کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''یوں تو اس موقع پر جنگ آزادی اور تحریک آزادی کی تاریخیں ہندوستان کی ہر زبان میں لکھی گئی تھیں،لیکن اردو کے سوا کسی زبان کو یہ فخر نصیب نہیں ہوا کہ وہ ایسا کوئی مجموعہ (نثر و نظم کا) پیش کرتی جس سے ثابت ہوتا کہ وہ اس ملک کی تحریک آزادی میں معاون ہوئی ہو''۔

(۳۶)

اس کتاب پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے عبدالرزاق قریشی کی نگاہ انتخاب کا قایل ہونا پڑتا ہے انھوں نے جہاں اس انتخاب میں آزادی کے تعلق سے انقلابی اوراحتجاجی شاعری کا اچھا خاصہ سرمایہ اکٹھا کر دیا ہے وہیں اس حوالے سے لکھی گئی منثورات کا بھی بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ مجاہدین کے خطوط اور فرامین بھی اس انتخاب میں شامل کیے گئے ہیں۔نیز ان کا عکس بھی شاملِ کتاب کیا گیا ہے۔اگر چہ آزادی کے تعلق سے لکھی گئی نظموں کے کئی انتخابات بازاروں میں دستیاب ہیں۔لیکن اس قدر شاندار اور جامع انتخاب راقم کی نظروں سے نہیں گزرا۔اس انتخاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شامل نظم ونثر اس زمانے کی صورت حال کا احاطہ کرتی ہیں،وہیں ادب کے اعلیٰ معیار پر بھی پوری اترتی ہیں۔مقام حیرت یہ ہے کہ اتنا اہم کام جس کی ذمہ داری انجمن ترقی اردو ہند جیسا ادارہ نہ اٹھا سکا،تنہا ایک شخص نے اسے پورا کر دکھایا۔پبلشر کے بیان سے میری اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ملاحظہ کریں:

''اس میں شک نہیں کہ کام حوصلہ شکن حد تک زیادہ تھا اور وقت بہت کم۔اردو میں جو کچھ تحریک آزادی کے سلسلے میں لکھا جا چکا ہے ان سب کو کھنگالنا طویل مدت،دور دراز مقامات کا سفر اور کافی سرمایہ چاہتا تھا۔چنانچہ حالات کے تحت جو کچھ بمبئی میں مل سکا اسی پر اکتفا کرنا پڑا۔اس لیے اگر اس انتخاب میں تشنگی پائی جاتی ہو تو کوئی تعجب نہیں۔وقت کا تقاضا تھا کہ کتاب اگست ۱۹۵۷ء تک ضرور شایع ہو

جائے۔تاکہ اردوں داں طبقہ اس صدسا کہ جشن کے موقع پر یہ محسوس کر
سکے کہ تحریک آزادی میں اردو کا کیا حصہ رہا ہے۔ہم عبدالرزاق قریشی
کے ممنون ہیں کہ انھوں نے بعض علمی حلقوں کے عدم تعاون کے باوجود
بڑی کاوش سے ایک اچھا خاصا انتخاب تیار کرلیا جو ہمارے مقصد کی
تکمیل تک نہ سہی قریب ضرور پہنچ جاتا ہے''۔(۳۷)

کتاب کے آغاز میں باغی سپہ سالاروں کے فوجی افسروں کے نام لکھے گئے احکامات اوران کے عکس شامل کیے گئے ہیں۔اس کے بعد مقدمہ کے طور پر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل کے حالات کا باریک بینی سے جائزہ لیا گیا ہے اور جنگ آزادی کے اسباب وعلل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیز احتجاج کے طور پر لکھی گئی تخلیقات کا بھرپور جائزہ لے کراردو کی اس تعلق سے خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ بعدازاں کتاب کو چارابواب میں تقسیم کر کے ہر باب کے تحت ضمنی عنوانات قایم کر کے ان سے متعلق تخلیقات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ یہ اردو میں پہلا انتخاب ہے جس سے جنگ آزادی میں اردو کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔

عبدالرزاق قریشی کے تحقیقی کارناموں میں ایک اہم کارنامہ'اردو زبان کی تمدنی اہمیت'' کی تصنیف ہے۔اس کتاب کی تصنیف کا محرک یہ واقعہ ہے کہ ۱۹۵۶ء میں شاہ معین الدین احمد ندوی نے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی ایک کانفرنس میں 'اردو زبان کی لسانی،علمی اور تمدنی اہمیت' کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا، جو مختصر ہونے کے باوجود دلچسپی کے ساتھ سنا گیا۔قریشی صاحب کو اس موضوع اور مقالے سے اس قدر دلچسپی بڑھی کہ انجمن اسلام کی ملازمت کے زمانے میں اس موضوع پر الگ الگ ابواب قایم کر کے مضامین لکھنا شروع کیا،عرصے تک یہ مضامین 'نوائے ادب' کے مختلف شماروں میں چھپتے رہے۔ کچھ غیر مطبوعہ مسودہ ان کے پاس رہ گیا تھا۔اس کے کچھ ابواب اور لکھنا چاہتے تھے مگر عمر نے وفا نہ کی۔ان کی وفات کے بعد یہ مضامین ان کی وصیت کے مطابق دارالمصنفین اعظم گڑھ سے کتابی صورت میں شایع ہوئے۔

یہ کتاب علمی ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت دلچسپ اور معلومات کا مجموعہ ہے۔اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں تمدنی اثرات کے تحت جو اضافے ہوئے ہیں یا اردو نے ہندوستانی تمدن کو جو الفاظ ،تراکیب اور اصطلاحات کا خزانہ عطا کیا ہے۔انھیں کتابی صورت میں اکٹھا پیش کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ مصنف کو بعض

الفاظ اور اصطلاحات کو سمجھنے میں تسامح ہوا ہے۔ تاہم کتاب کی اہمیت اپنے موضوع کے لحاظ سے مسلم ہے۔اس کتاب میں انھوں نے ہندوستان کی تمدنی زندگی کے مختلف شعبوں پر اسلامی زندگی اور اردو کے ذریعہ مرتب ہونے والے اثرات کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔کوئی بھی متمدن ملک ایک منضبط نظام حکومت کے بغیر قایم نہیں رہ سکتا اور اور نظام حکومت کا اہم ترین شعبہ عدلیہ اور قانون کا شعبہ ہے۔ہم یہاں مذکورہ کتاب سے اسی شعبے سے متعلق اقتباس نقل کرتے ہیں تاکہ قارئین پر اس کتاب کی اہمیت واضح ہوجائے:

> ''عدالت اور قانون کے بغیر نہ کوئی انتظام مستحکم ہوسکتا ہے اور نہ تمدن مکمل کہلانے کا مستحق۔ ہندوستان تقریباً ہر دور میں تمدن کے اعلیٰ مراتب کا حامل رہا ہے،اس لیے عدالت اور قانون کو یہاں ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے۔سلاطینِ دہلی اور شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں جو عدالتی اور قانونی الفاظ استعمال ہوتے تھے اور پھر ان کے بعد انگریزوں کے زمانہ میں عربی اور فارسی کے اثر سے جو الفاظ رہے ان میں سے اکثر آج تک اردو میں مروج ہیں۔مثلاً مندرجہ ذیل الفاظ:
>
> عدالت،عدالت عالیہ، کچہری،منصفی، دیوانی،فوجداری،منصف پیش کار، دستاویز،قبالہ،تمسک،مسل،مسل خواں،محرر،منشی،منصرم،ناظر،مدعی، مدعا علیہ عرضی،دعویٰ،استغاثہ، وکیل، مختار، گواہ، پیشی، بحث، جرح، جرمانہ،حرجانہ،تاوان،جیل خانہ، بندی خانہ،حبس دوام، بیع نامہ، رہن، رہن نامہ، اقرار نامہ،صلح نامہ،شفع،مکفول،عذر داری، بے دخلی،دخل دہانی،تعلیقہ،قرقی،قرق،امین، مچلکہ وغیرہ۔''(۳۸)

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ عبدالرزاق قریشی نے مرزا مظہر جانِ جاناں کے فارسی خطوط کے دو مجموعے ترتیب دے کر اپنے مقدموں کے ساتھ شایع کروائے۔ یہ خطوط مرزا مظہر کی ذاتی اور صوفیانہ زندگی سے پردہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ ادبی حیثیت کے حامل ہیں۔ان میں کچھ خطوط انھوں نے اپنے عزیز و اقارب کو اور بعض اپنے شاگردوں کے نام لکھے ہیں۔ بعد میں انھیں خطوط کے پہلے مجموعے کو ڈاکٹر خلیق انجم

نے اور دوسرے مجموعے کو ڈاکٹر محمد عمر (شعبۂ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے اردو میں ترجمہ کر کے شایع کیا۔

تاثرات ان کے سترہ مضامین کا مجموعہ ہے، جو مختلف شخصیات اور کتابوں پر تبصرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ مضامین مختصر مگر جامع ہیں۔ حیات شبلی مولفہ سید سلیمان ندوی کی تلخیص بھی انھوں نے ہی کی تھی۔ منشی دیانارائن نگم کے خطوط کا مسودہ بھی مکمل ہو چکا تھا، جس کی نشاندہی مالک رام نے کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ یہ مسودہ بمبئی میں ان کے کسی عزیز کے پاس موجود ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ اب اس مسودے کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس کے علاوہ ان کے ذریعہ تالیف کی گئی نصابی کتابیں ''نگارِ اردو'' کے نام سے عرصہ تک بمبئی کے اسکولوں میں داخلِ نصاب رہیں۔ ابھی تک ان کے بہت سے مضامین مختلف رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ اگر انھیں یکجا کر دیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

عبدالرزاق قریشی کی مذکورہ کتابوں میں مرزا مظہر جانِ جاناں اور ان کا کلام، مرزا مظہر کے فارسی خطوط (دو جلدیں)، دیوانِ عزلت، راگ مالا اور نوائے آزادی ان کی تحقیقی بصیرت کا بین ثبوت ہیں۔ تاثرات اگر چہ ان کے مختصر مضامین کا مجموعہ ہے، تاہم اس کے مطالعے سے ان کی تنقیدی بصیرت اور صاف گوئی کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی مشہورِ زمانہ تصنیف 'حیاتِ شبلی' کی تلخیص انھوں نے جس خوبصورت انداز سے کی ہے، وہ ان کی زبان و بیان پر مضبوط گرفت کا پتہ دیتی ہے۔ ساڑھے آٹھ سو صفحات کو چھوٹی تقطیع کے ڈیڑھ سو صفحات میں سمیٹنا اور وہ بھی اس طرح کہ کوئی اہم بات نظر انداز نہ ہونے پائے، کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ ان کی نامکمل کتاب 'اردو زبان کی تمدنی اہمیت' اپنے موضوع کے لحاظ سے نہایت اہم اور دلچسپ کتاب ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے درسی کتابوں کی تصنیف و تالیف میں بھی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے علمی و ادبی اور تحقیقی کارناموں کی کثیر الجہتی کو دیکھتے ہوئے ان کے لیے میرؔ کا یہ شعر کتنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

برسوں لگی رہی ہیں جب مہر ومہ سے آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب، صاحب نظر بنے ہے

حواشی:

۱۔عبدالرزاق قریشی، استاد مرحوم مشمولہ سہ ماہی 'نوائے ادب'، بمبئی جنوری مارچ ۱۹۶۹، ص ۵۷

۲۔ جادوناتھ سرکار، مشمولہ ماہنامہ 'سب رس'، حیدرآباد، ۱۹۶۹، ص ۳۲

۳۔ نجیب اشرف ندوی، مقدمہ رقعات عالم گیر، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۲۰۱۲، ص ۴۶۔۴۴۵

۴۔ نجیب اشرف ندوی، مقدمہ رقعات عالم گیر، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۲۰۱۲، ص ۴۶

۵۔ نجیب اشرف ندوی، مقدمہ رقعات عالم گیر، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۲۰۱۲، ص ۴۸۱

۶۔ ماہنامہ معارف، دارالمصنفین اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۲۷

۷۔ نجیب اشرف ندوی، مقدمہ رقعات عالم گیر، ص ۱۱۴

۸۔ نجیب اشرف ندوی، لغات گجری، بمبئی، سن ندارد، ص ۵

۹۔ ڈاکٹر محمد قاسم دہلوی، مولانا حفیظ الرحمان واصف دہلوی، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۱۱، ص ۳۱

۱۰۔ ڈاکٹر محمد قاسم دہلوی، مولانا حفیظ الرحمان واصف دہلوی، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۱۱، ص ۳۳۔۳۲

۱۱۔ حفیظ الرحمان واصف دہلوی، ادبی بھول بھلیاں، دہلی، ۱۹۷۹، ص ۳۱

۱۲۔ حفیظ الرحمان واصف دہلوی، مضمون مشمولہ کتاب نما دہلی، اگست ۱۹۸۶

۱۳۔ مولانا حفیظ الرحمان واصف دہلوی، اردو مصدر نامہ، دہلی، ۲۰۱۲، ص ۶

۱۴۔ مولانا حفیظ الرحمان واصف دہلوی، اردو مصدر نامہ، دہلی، ۲۰۱۲، ص ۷۔۶

۱۵۔ حفیظ الرحمان واصف دہلوی، ادبی بھول بھلیاں، ص ۷

۱۶۔ حفیظ الرحمان واصف دہلوی، ادبی بھول بھلیاں، ص ۷

۱۷۔ حفیظ الرحمان واصف دہلوی، ادبی بھول بھلیاں، ص ۱۳۔۱۲

۱۸۔ حفیظ الرحمان واصف دہلوی، ادبی بھول بھلیاں، ص ۶۶

(۱۹) عبدالرزاق قریشی ، اردو زبان کی تمدنی اہمیت، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۲۰۱۵ء ص ۱۲

(۲۰)عبدالرزاق قریشی ، مرزا مظہر جانِ جاناں اوران کا کلام، دارالمصنفین اعظم گڑھ،۲۰۰۴،ص ۴
۲۱)محمد ایوب واقف،عبدالرزاق قریشی مرحوم،مشمولہ ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ فروری ۱۹۷۹،ص ۷
(۲۲)عبدالرزاق قریشی ، مرزا مظہر جانِ جاناں اوران کا کلام، دارالمصنفین اعظم گڑھ،۲۰۰۴،ص ۱۰
(۲۳) عبدالرزاق قریشی ، مرزا مظہر جانِ جاناں اوران کا کلام، دارالمصنفین اعظم گڑھ،۲۰۰۴،ص ۱۲۔۱۱
(۲۴) عبدالرزاق قریشی ، مرزا مظہر جانِ جاناں اوران کا کلام، دارالمصنفین اعظم گڑھ،۲۰۰۴،ص ۱۵
(۲۵) عبدالرزاق قریشی،مرزا مظہر جانِ جاناں اوران کا کلام، دارالمصنفین اعظم گڑھ،۲۰۰۴،ص ۱۶۵
(۲۶) عبدالرزاق قریشی ، مرزا مظہر جانِ جاناں اوران کا کلام، دارالمصنفین اعظم گڑھ،۲۰۰۴،ص ۱۶۹
(۲۷)عبدالرزاق قریشی ، دیوانِ عزلت، ادبی پبلشرز بمبئی،۱۹۶۲،ص ۱۸۰۔۱۷۹
(۲۸)عبدالرزاق قریشی ، دیوانِ عزلت، ادبی پبلشرز بمبئی،۱۹۶۲،ص (الف)
(۲۹)عبدالرزاق قریشی ، دیوانِ عزلت، ادبی پبلشرز بمبئی،۱۹۶۲،ص ۱۶۴۔۱۶۳
(۳۰)عبدلرزاق قریشی ، مبادیات تحقیق ، ادبی پبلشرز بمبئی ۱۹۶۸،ص پانچ
(۳۱)عبدالرزاق قریشی ، مرزا مظہر جانِ جاناں اوران کا کلام، دارالمصنفین اعظم گڑھ،۲۰۰۴ص ۸
(۳۲)عبدلرزاق قریشی ، مبادیات تحقیق ، ادبی پبلشرز بمبئی،۱۹۶۸،ص ۵
(۳۳)ڈاکٹر تنویر احمد علوی ، اصولِ تحقیق وترتیبِ متن، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۹،ص ۲۰۔۱۹
(۳۴)عبدلرزاق قریشی ، مبادیات تحقیق ، ادبی پبلشرز بمبئی ۱۹۶۸،ص ۵
(۳۵)عبدالرزاق قریشی، مبادیات تحقیق ، ادبی پبلشرز بمبئی ۱۹۶۸،ص ۵
(۳۶)عبدالرزاق قریشی مرزا مظہر جانِ جاناں اوران کا کلام، دارالمصنفین اعظم گڑھ،۲۰۰۴،ص ۱۰
(۳۷)عبدالرزاق قریشی ، نوائے آزادی، ادبی پبلشرز بمبئی،۱۹۵۷،ص پبلشر کی طرف سے
(۳۸)عبدالرزاق قریشی ، اردو زبان کی تمدنی اہمیت، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۲۰۱۵،ص ۲۲۔۲۱

باب پنجم

اردو تحقیق: موجودہ صورت اور اس کا تدارک

اردو تحقیق: مسائل اور امکانات

یوں تو انسان کو ہر زمانے میں اپنے کارناموں کو محفوظ رکھنے کا خیال دامن گیر رہا ہے۔ اسے عملی شکل دینے کے لیے اس نے ہر ممکن وسائل کا سہارا لے کر صفحۂ ہستی پر نقش دوام ثبت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اجنتا اور ایلورا کی گپھاؤں میں موجود مورتیاں فن سنگ تراشی کے ساتھ ساتھ ایک تہذیب کی نمائندگی کی روشن مثال ہیں۔ اپنے کارناموں کو محفوظ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اسلاف کے کارناموں کی بازیافت بھی تاریخ کا ایک حصہ رہا ہے۔ ماضی کے دھندلکے میں پوشیدہ حیات انسانی کے کارناموں کی تلاش و تحقیق بھی ہماری علمی زندگی کا ناقابلِ فراموش حصہ ہے۔ جدید علوم کی ترقی نے جہاں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو متاثر کیا ہے وہیں ہماری ادبی زندگی کے بہت سے فراموش شدہ گوشوں کو بھی منور کیا ہے۔

اردو میں ادبی تحقیق کی عمر اگرچہ بہت مختصر ہے تاہم اس مختصر عرصے میں (ایک صدی) بھی ہماری زندگی کی بیش تر (فراموش شدہ) کڑیاں تلاش و تحقیق کے ذریعہ منظر عام پر آچکی ہیں اور انھیں ترتیب و تہذیب کے مراحل سے گزار کر ہماری ادبی تاریخ کو مرتب کرنے کا کام بھی ہوا ہے۔ تاہم ابھی ماضی کے نہ جانے کتنے گمشدہ ابواب ہنوز اپنے کولمبس کے انتظار میں ہوں گے۔

اردو میں تحقیق نگاری کو سائنٹفک اور منظّم طور پر فروغ دینے میں محمود شیرانی کو اولیت حاصل ہے۔ انھوں نے جدید سائنٹفک طریقوں پر تحقیق کی روایت قائم کی۔ اسی لیے انھیں تحقیق کا 'معلم اول' بھی کہا گیا۔ اس روایت کو آگے بڑھانے میں جن محققین نے قابل قدر کارنامے انجام دیئے ہیں ان میں قاضی عبدالودود کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے نہ صرف قدیم متون کی بازیافت و ترتیب وتہذیب کا فریضہ انجام دیا بلکہ احتسابی تنقید کے ذریعہ ایک نسل کی تحقیقی تربیت بھی کی۔ اس لیے انھیں تحقیق کا معلم ثانی ہونے کا شرف حاصل ہے۔

آزادی کے بعد اردو میں تحقیق کی روایت خاصی مستحکم ہوئی ہے۔ محققین کی ایک قابل قدر تعداد ابھر کر سامنے آئی اور اردو زبان وادب کی مختلف جہتوں میں تحقیقی کام ہوئے۔ ۱۹۸۰ء تک آتے آتے قدیم ادب کا

ایک بڑا حصہ ترتیب وتدوین کے مراحل سے گزر کر منظر عام پر آیا۔ کلاسکی متون کے علاوہ لسانیات، تاریخ ادب، شخصیات اور دوسری جہتوں میں بے شمار تحقیقی کام ہوئے جنھیں بہ نظر استحسان دیکھا جانا چاہیے۔ رشید حسن خان نے ترتیب متن کا وہ اعلیٰ معیار قائم کیا کہ گیان چند جین نے انھیں 'خدائے تدوین' کے نام سے یاد کیا۔ تاہم دو تین دہائیوں سے اردو تحقیق کے معیار و منہاج میں جو پستی آئی ہے، وہ ہمیں تحقیق کی موجودہ صورت حال پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

آزادی کے بعد انفرادی طور پر تحقیق کرنے والوں کے علاوہ یونیورسٹی میں بھی تحقیق کے شعبوں میں قابلِ ذکر پیش رفت ہوئی ہے اور بہت سے قابل ذکر تحقیقی کارنامے منظر عام پر آئے ہیں۔ ان میں کلاسیکی متون کی ترتیب وتدوین پر اچھی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ ادب کی مختلف جہتوں پر بھی تحقیقی کام انجام پذیر ہوئے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں تحقیق کا معیار بہت بلند نہ ہونے کے باوجود کئی اچھے تحقیقی مقالے تصنیف ہوئے ہیں۔ یہ مقالے اگرچہ سند حاصل کرنے کی غرض سے لکھے گئے تاہم ان میں تحقیق کا معیار بہت بلند نظر آتا ہے اور آج بھی یہ مقالے حوالے کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان مقالوں میں نور الحسن ہاشمی کا مقالہ 'دلی کا دبستان شاعری'، ابواللیث صدیقی کا 'لکھنؤ کا دبستان شاعری'، خلیل الرحمٰن اعظمی کا 'اردو میں ترقی پسند تحریک'، قمر رئیس کا 'پریم چند: ایک تنقیدی مطالعہ'، تنویر علوی کا 'ذوق: سوانح اور انتقاد' وغیرہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یونیورسٹیوں میں تحقیقی کاموں کا معیار نسبتاً غیر تسلی بخش رہا ہے اور غیر معیاری مقالوں کی تعداد معیاری مقالوں کے مقابل زیادہ ہے۔ اس پستیٔ معیار کا بڑا سبب جلد بازی ہے۔ یہاں ایک محدود وقت میں ریسرچ اسکالر کو مقالہ مکمل کرنا ہوتا ہے۔ نیز ڈگری کے حصول کی خواہش نے بوالہوسوں کو بھی تحقیق کی طرف مائل کیا ہے۔

یونیورسٹیوں میں داخلہ لینے والے ریسرچ اسکالرز کو کچھ اصول وضوابط اور پابندیوں میں رہ کر اپنا مقالہ قلم بند کرنا ہوتا ہے۔ انھیں اپنا کام ایک خاص مدت کے اندر ختم کرنا ہوتا ہے۔ ان کے کام کی نگرانی کرنے والا استاد اگر موضوع سے دلچسپی بھی لیتا ہے (بیش تر حالات میں ایسا ہوتا نہیں ہے) تو دیکھنا یہ ہے کہ وہ کتنا وقت طالب علم کی رہنمائی یا نگرانی کے لیے نکال سکتا ہے۔ ضمناً یہ عرض کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ

طلبا کی بڑھتی ہوئی تعداد کے باعث بعض یونیورسٹیوں میں ایک ایک نگراں کے ماتحت تیس تیس چالیس چالیس طلبا ریسرچ کررہے ہوتے ہیں (ابھی حالیہ دنوں یو جی سی نے اس کثرت تعداد پر روک لگائی ہے اور طلبا کی تعداد کے حدود مقرر کیے ہیں) ایسی صورت میں نگراں طلبا کی کتنی مدد کرسکتے ہیں اسے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔اس کے علاوہ بیش تر اساتذہ کسی بھی موضوع پر کام کروانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ اساتذہ بھی ایسے موضوعات پر کام کروانے کے لیے تیار رہتے ہیں، جن سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا ہے۔مثلاً جن موضوعات پر کام کرنے کے لیے عربی و فارسی کا جاننا نہایت ضروری ہے، ان پر ایسے حضرات کام کرواتے ہیں جن کو ان زبانوں کی مبادیات کا بھی علم نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح مختلف اصناف و ادوار کے کام کرانے والے اساتذہ اکثر ان اصناف وا دوار سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ اکثر یونیورسٹیوں میں حاضری کی پابندیاں بھی ہوتی ہیں جس کے سبب ریسرچ اسکالر کو مواد کی تلاش کے مواقع کم ہی میسر آتے ہیں۔ مالی وسائل کی فراہمی اور مختلف ارباب علم یا کتب خانوں سے استفادے کے لیے سفر کرنا بھی تحقیق کے لیے ضروری ہوتا ہے۔جس کے لیے وقت اور پیسہ دونوں درکار ہوتا ہے۔مزید ستم یہ کہ ایک مقررہ وقت پر سند حاصل کرنے کی عجلت تحقیقی معیار کو اور بھی پست کردیتی ہے۔

مزید یہ کہ یونیورسٹیوں میں داخلہ پانے والے ہر ریسرچ اسکالر کا ذوق تحقیق بھی یکساں نہیں ہوتا۔ ہم میں کتنے ایسے طالب علم ہوتے ہیں جو اپنے موضوع سے متعلق مواد کی دستیابی کی زحمت اٹھاتے ہیں۔اہلِ علم سے رابطے کے بغیر موضوع سے متعلق مواد کی فراہمی دشوار ہی ہوتی ہے۔ ماضی میں محقق اپنے موضوع سے متعلق مواد و مباحث کے لیے متعلقہ افراد سے رابطہ کیا کرتے تھے۔ پروفیسر مختارالدین احمد نے مختلف اہلِ علم حضرات کو کم و بیش اسی ہزار خطوط لکھے ہیں، جن میں بیش تر خطوط علمی استفسارات پر مبنی ہیں۔ایک اور سبب یہ بھی ہے کہ اکثر حضرات کی طرف سے عدم تعاون اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مایوسی بھی اس راہ میں حائل ہوتی ہے۔اختر اورینوی نے اس صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''ہماری یونیورسٹیوں میں تحقیق کا کام کرنے والوں کو وظیفے بھی ملتے ہیں۔ یو جی سی نے ان کی خاص امداد کی ہے اور ایک حد تک ملازمت میں بھی ڈگریاں مددگار ہوتی ہیں۔لیکن عام صورت حال یہ ہے کہ پی

ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کیے ہوئے لوگ بے روزگار مارے مارے پھر رہے ہیں۔دوسال کی مدت (اب یہ مدت پانچ سال ہے) میں محققین کو اپنا مقالہ تیار کرنا ہوتا ہے اور تیز رفتار مسابقت کی وجہ سے معیارِ تحقیق سے زیادہ انھیں ڈگری کے حصول کی فکر ہوتی ہے۔ان حالات میں علم وادب کی خالص خدمت اور معیاری تنقید کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔ظاہر ہے ایسی حالت میں ہم ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری یونیورسٹیوں کا معیارِ تحقیق بلند ہے میرا خیال تو یہ ہے کہ تحقیق کی اصل منزل تو اس وقت آتی ہے جب دوڑ بھاگ کی منزل ختم ہو چکی ہو۔لیکن موجودہ حالات میں اچھے خاصے جگر دار لوگ بھی اتنے 'رہینِ ستم ہائے روزگار' ہیں کہ وہ ملازمت یا ترقی کے حصول کے بعد بھی چین سے تحقیق کا کام نہیں کر سکتے۔''(۱)

یونیورسٹیوں کے درمیان تا حال آپس میں کوئی تال میل، رابطہ اور مشترکہ پروگرام نہ ہونے کی وجہ سے ایک ہی موضوع پر کئی جگہ تحقیق ہو رہی ہے۔ایک یونیورسٹی میں جن موضوعات پر کام ہو رہا ہے، دوسری یونیورسٹی والے اس سے لاعلم ہیں۔جس کی وجہ سے ایک ہی موضوع پر ایک ہی وقت میں کئی کئی یونیورسٹیوں میں کام ہو رہے ہیں۔اب تو صورت حال یہ ہے کہ بعض اوقات ایک ہی یونیورسٹی میں ایک ہی موضوع پر دو دو اسکالر کام کر رہے ہوتے ہیں۔موضوع کی اس یکسانیت پر تشویش کا ظہار کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''ایک ہی موضوع پر دو دو تین تین جگہ کام ہوتا رہتا ہے۔اور اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک دوسرے کے کام پر چھاپہ مارا جاتا ہے۔یعنی اگر کسی کو معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص ایک نسخے پر کام کر رہا ہے تو دوسرا اس دریافت سے فائدہ اٹھائے گا اور اس کتاب کو اس سے قبل چھپوانے کی کوشش کرے گا۔''(۲)

تحقیق کے اصولوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ زندہ شخصیتوں پر تحقیقی کام نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ بعض ماہرین کا تو یہ خیال ہے کہ ادبی شخصیات کی وفات کے بعد بھی جب تک ایک اچھا خاصا وقت نہ گزر جائے تب تک اس پر تحقیق نہیں کرنی چاہیے۔ ہمارے وہی اساتذہ جو ہمیں اصول تحقیق پڑھاتے ہیں، اکثر وبیش تر زندہ شخصیتوں پر کام کرواتے ہیں اور ایسے لوگوں پر کام کرواتے ہیں جن کی ادبی عمر ابھی زیادہ نہیں ہے اور ابھی ان کے بہت کچھ کرنے کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ اگر زندہ شخصیتوں پر کام کرنے کا جواز پیدا کر لیا جائے تو بھی کم از کم ان لوگوں کا انتخاب کرنا چاہیے جو تقریباً اپنی ادبی عمر کے آخری پڑاؤ میں ہوں اور اب ان کے کسی اہم ادبی کارنامے کے وجود میں آنے کے امکان کم ہو گئے ہوں۔ قدر افزائی ہونی چاہیے مگر یاد رہے قدر افزائی ایک الگ بات ہے اور تحقیق ایک الگ بات۔

عہد حاضر میں زندہ شخصیتوں پر تحقیقی مقالے لکھنے کا رجحان بڑھا ہے۔ اس میں اکثر وہ ادیب وافسانہ نگار بھی شامل ہو جاتے ہیں جن کی ابھی کوئی ادبی شناخت بھی قائم نہیں ہو پاتی ہے۔ ایک ایک افسانوی مجموعوں کو موضوع بنا کر تحقیق کی جارہی ہے جو علمی دنیا کے لیے بدترین مذاق سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ ایسے موضوعات پر کام کرنے والے ریسرچ اسکالر ادبی حیثیت سے تعین قدر کا جو بھی معیار مقرر کرتے ہوں مگر سوانحی حالات میں جس عدم احتیاطی کی صورت حال پیدا ہوئی ہے وہ نہایت افسوس ناک ہے۔ کوئی بھی ادیب اپنے بارے میں جس قدر غلط بیانیوں سے کام لیتا ہے اس کی مثالیں اردو ادب کی تاریخ میں بھری پڑی ہیں۔ ہمارا آج کا ریسرچ اسکالر کہ اس کی معصومیت کے قربان جایئے کہ وہ اپنے ہیرو کے بیانات پر بھروسہ کر کے جس قدر علم تحقیق کو رسوا کر رہا ہے۔ اس کی مثال اردو تحقیق کی تاریخ میں مل ہی نہیں سکتی۔ میرے اس بیان کی تائید میرے اس تجربے سے بھی ہوتی ہے۔

دو سال پہلے میرے ایک جونیر طالب علم نے اپنا ایم۔فل۔ کا مقالہ مجھے پروف ریڈنگ کے لیے دیا۔ مقالہ مشرف عالم ذوقی کی ناول نگاری پر تھا، معاصر ناول نگاروں کے باب میں ترنم ریاض کا ذکر بھی تھا، جس میں موصوفہ کے بارے میں لکھا گیا تھا کہ انھوں نے ۱۹۷۲ء میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ میں نے مذکورہ طالب علم سے پوچھا کہ اسے یہ اطلاعات کہاں سے فراہم ہوئیں تو اس نے

نہایت معصومیت کے ساتھ جواب دیا کہ اسے خود ترنم ریاض نے ایک استفساراتی خط کے جواب میں لکھا تھا۔غور کریں کہ اپنے قیام سے چھبیس سال قبل یونیورسٹی نے انھیں بی۔اے۔کی ڈگری کیسے دے دی۔اس مقالے کی ایک اور قابلِ ذکر بات یہ رہی کہ اس میں جتنے افسانہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سارے افسانہ نگاروں نے پہلی کہانی بہت ہی کم عمری میں لکھی ہے۔سب سے زیادہ عمر میں کہانی لکھنے والے کی عمر ۱۲ سال اور کم عمر میں کہانی لکھنے والے کی عمر سات سال بتائی گئی ہے۔

یونیورسٹیوں میں اساتذہ کی تقرری میں برتی جانے والی بداحتیاطی اور بے ضابطگیاں بھی تحقیق کے معیار کی پستی کا سبب ہوئی ہیں۔اکثر اساتذہ زبان و بیان اور فن کی نزاکتوں اور باریکیوں سے واقف ہوتے ہیں لہٰذا وہ اکثر ایسے موضوعات پر کام کروانے سے کتراتے ہیں جن میں زبان و بیان کا مطالعہ یا فن کی باریکیوں پر نظر رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے اور اگر بدقسمتی سے کہیں اس طرح کا کام ہوتا بھی ہے تو معیار کا اللہ ہی حافظ۔اس کے برعکس سماجی و سیاسی مطالعے اور موضوعاتی پہلوؤں پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔اسی طرح سے علمی غیر ذمہ داری کے باعث نہ صرف تحقیق کا معیار زوال پذیر ہوا ہے بلکہ زبان کے معیار میں بھی پستی آئی ہے۔ہم افقی سطح پر چاہے زبان کی ترقی کے کتنے بھی دعوے کر لیں لیکن عمودی سطح پر اردو زبان دن بدن زوال پذیر ہے اور اگر یہی صورت حال رہی تو وہ دن دور نہیں جب اس زبان کا دائرہ بھی سمٹ جائے گا۔علمی، لسانی، فنی اور تحقیقی زوال اس پستی کے بنیادی اسباب ہیں۔یونیورسٹیوں میں ہونے والی تحقیقات پر عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے مالک رام نے کہا ہے:

> ''ان دنوں شعبوں میں جو کام اس وقت تک ہوا ہے اس میں ہر طرح سے اطمینان بخش کام بہت کم ہے۔لیکن اس سے بھی زیادہ افسوس ناک صورت حال یہ ہے کہ تحقیقی مضامین لکھنے کی طرف توجہ سرے سے ہوئی ہی نہیں ہے۔ہم دعویٰ تو اس بات کا کرتے ہیں کہ آزادی کے بعد اردو نے بہت ترقی کی ہے۔لیکن یاد رہے کہ علمی دنیا میں ترقی کا ثبوت وہ تحقیقی کام ہوگا جو آئے دن اس زبان میں ہو رہا ہے۔اس پہلو سے ہمارا دامن تقریباً خالی ہے۔علمی اور تحقیقی رسالے تو گویا ہمارے ہاں

ہیں ہی نہیں۔ جو دو ایک ہیں وہ بھی لشتم پشتم چل رہے ہیں اور کچھ معلوم نہیں کہ کب دم توڑ دیں گے۔ پھر علمی مضمون لکھنے والوں کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں اور جو ہیں وہ بھی محنت سے جی چراتے ہیں۔ انھیں کام سے زیادہ اپنا نام چھپا ہوا دیکھنے کی ہوس ہے۔'' (۳)

مالک رام کا یہ کہنا کہ ''تحقیقی اعتبار سے ہمارا دامن تقریباً خالی ہے'' قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ رشید حسن خان اور مولانا عرشی وغیرہ کے تحقیقی کارنامے عالمی تحقیقی معیار کے حامل ہیں۔ تاہم اردو تحقیق کی زبوں حالی سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اس کا ایک بڑا سبب ہمارے اخلاقی زوال کی پستی ہے۔ قاضی عبدالودود نے کہا تھا کہ ''جب ہماری زندگی کا اخلاقی معیار بلند ہوگا تو تحقیق کا معیار خود بخود بلند ہوجائے گا۔ تحقیق کا معیار جس بلند اخلاقی کا مطالبہ کرتا ہے اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے مالک رام لکھتے ہیں:

''جب کوئی شخص عدالت میں کسی طرح کا بیان یا شہادت دینے کے لیے جاتا ہے تو اس سے قسم لی جاتی ہے کہ وہ حقیقت، پوری حقیقت اور بلا آمیزش حقیقت ہی بیان کرے گا۔ جب تک تحقیق کے میدان میں بھی یہی اصول استعمال نہیں کیا جاتا یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی اور اس کی پہلی ذمہ داری ہمارے اساتذہ اور پروفیسر صاحبان کے سر پر ہے۔ وہ خود اس پر عمل کر کے اپنے شاگردوں کے لیے مثال قائم کریں ۔تو دیکھیے کہ چند برس میں کایا پلٹ ہوجاتی ہے یا نہیں۔

غرض میری رائے میں اردو تحقیق کا معیار اس سطح پر نہیں آیا جس کی کسی ترقی یافتہ زبان سے توقع کی جاسکتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ خیال کرلیا گیا ہے کہ ہر شخص تحقیق کا کام کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اگر ہر شخص ڈاکٹر یا وکیل یا ریاضی داں نہیں ہوسکتا تو وہ تحقیق کا ماہر کیوں ہوسکتا ہے۔'' (۴)

ہمارے یہاں یونیورسٹیوں میں تحقیق کی روایت خاصی پرانی ہے۔ تاہم اس کی سمت و رفتار پر غور کریں

تو اسے کسی بھی صورت میں قابلِ رشک تو کجا، اطمینان بخش بھی نہیں کہا جا سکتا۔ سندی تحقیق کے لیے جتنے بھی تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں، ان کی تعداد ہزاروں میں پہنچتی ہے مگر بہت کم مقالات شائع ہو سکے ہیں۔ تحقیقی کاموں سے ادب کو فائدہ تبھی ممکن ہے جب وہ تکمیل کے بعد طبع ہو کر منظر عام پر بھی آئیں۔ اگر تحقیق کا مقصد اور اس کی افادیت اس کے علمی و ادبی صداقتوں کو عام کرنے میں مضمر ہے تو ان کی اشاعت ہر لحاظ سے سود مند ہوگی۔ اس کا ایک بڑا فائدہ تو یہ ہوگا کہ نئے محققوں کو تحقیق کے لیے ترغیب بھی ملے گی اور طریقۂ کار کے تعین میں رہنمائی بھی۔ لیکن بد قسمتی سے جو مقالات شائع بھی ہوئے ہیں ان میں بیش تر وہ مقالات ہیں جو تحقیق کے معیار پر کھرے نہیں اترتے بلکہ ان کی اشاعت کے پس پشت یہ جذبہ کارفرما ہے کہ مقالہ نگار کو صاحب کتاب ہونے کا شرف بھی حاصل ہو جائے۔ ادھر مقالوں کی اشاعت میں عجلت کا ایک سبب یہ بھی پیدا ہوا ہے کہ اکثر یونیورسٹیوں میں تقرر کے وقت صاحب کتاب امیدوار کو ترجیح دی جاتی ہے۔ بلکہ ترقی کے لیے تو باضابطہ پانچ اور دس کتابوں کا مصنف ہونے کی شرط ہوتی ہے۔

ہماری یونیورسٹیوں میں تحقیقی معیار کی پستی کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ ایسے اسکالرز کو جو تحقیق سے فطری ہم آہنگی نہیں رکھتے کسی نہ کسی سیاسی مصلحت کے تحت یا اساتذہ کے ذاتی تعلقات کی بنا پر جامعات میں داخلہ مل جاتا ہے، اس کے برعکس ذہین اور باصلاحیت امیدوار تحقیق سے فطری لگاؤ کے باوجود دانش گاہوں میں داخلے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس طرح کی علمی بد دیانتی ہماری دانش گاہوں میں عام ہو چکی ہے۔ ایسے حالات میں علم و تحقیق کا زوال کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے۔

یونیورسٹیوں میں تحقیق کے معیار میں افسوسناک گراوٹ کی ایک اہم وجہ یونیورسٹیوں میں علمی و ادبی کاموں سے زیادہ غیر علمی و ادبی سرگرمیوں کے چلن کا بڑھتا ہوا رجحان ہے۔ شعبوں میں چند اساتذہ اور طلبا کو چھوڑ کر بیش تر حضرات مصلحت پسندی، خوشامد اور سستی شہرت و نام آوری کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ اکثر نگراں حضرات کو تحقیق اور اسکالر کے کیریئر سے زیادہ فکر اپنی ترقی اور کیریئر کی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنا قیمتی وقت اور صلاحیت ایسے کاموں میں صرف کرتے ہیں جن سے ان کی ذاتی شہرت میں چار چاند لگ سکتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ بعض اوقات یہی غیر ذمہ داری رسوائی کا باعث بھی بن جاتی ہے۔

ایسے ماحول کے پروردہ اسکالر بھی تحقیق سے زیادہ توجہ اس بات پر دیتے ہیں کہ کسی صورت اساتذہ کی خوشنودی حاصل کی جائے۔ بیش تر طلبا کو اپنے اساتذہ کے علاوہ دوسری یونیورسٹیوں کے اساتذہ کی خوشامد میں مصروف دیکھا جاسکتا ہے۔انھیں جلد از جلد مقالہ داخل کر کے ڈگری کے حصول کی فکر رہتی ہے تاکہ جوڑ توڑ کے سہارے کہیں لکچر شپ حاصل کر لی جائے۔ایسے طلبا میں اکثر کو اصول تحقیق پر عمل آوری تو دور کی بات خود تحقیق کے مفہوم تک سے آشنائی نہیں ہوتی۔ایسے حضرات کسی صورت مقالہ لکھ کر یا لکھوا کر ڈاکٹریٹ کی سند بھی حاصل کر لیتے ہیں اور قسمت نے یاوری کی تو بہت جلد استاذ کے عہدے پر بھی فائز ہو جاتے ہیں۔ایسے اساتذہ اپنے طلبا کی رہنمائی کا فریضہ جس طرح ادا کریں گے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

اسی طرح مقالوں کی تعین قدر کا معاملہ بھی کافی غیر ذمہ دارانہ ہے۔اکثر ممتحن حضرات مقالوں کو پڑھے بغیر ہی سند دینے کی سفارش کر دیتے ہیں۔راقم الحروف نے کئی ممتحن حضرات کو انٹرویو کے دوران یہ کہتے ہوئے سنا کہ ''میں اپنی مصروفیتوں کے باعث آپ کا مقالہ پڑھ نہ سکا۔تاہم آپ نے لکھا ہے تو اچھا ہی ہوگا۔''ایسی صورت حال میں مقالہ نگاروں کو اس بات کی بھی فکر نہیں ہوتی کہ ان کا مقالہ رد بھی ہوسکتا ہے یا کم از کم انھیں دوبارہ لکھنے کے لیے کہا جاسکتا ہے۔(کم از کم راقم الحروف نے کسی مقالے کے رد ہونے کی کوئی خبر آج تک نہیں سنی)اگر ممتحن حضرات علمی دیانت داری کا ثبوت دیتے ہوئے پست مقالوں کو دوبارہ لکھنے کی بات کریں تو شاید ہماری تحقیق کے معیار میں کچھ اضافہ ہو سکے۔

یونیورسٹیوں میں تحقیق کے معیار اور صورت حال پر کلیم الحق مرحوم سے ایک ذاتی ملاقات میں مالک رام نے نہایت صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ ''ایمان داری کی بات تو یہ ہے کہ یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق پر کوئی ٹھوس کام نہیں ہو رہا ہے اور تحقیقی کاموں کے لیے جس قسم کے رسرچ اسکالرز کا انتخاب کیا جارہا ہے وہ نہایت مایوس کن ہے۔ان حالات میں اردو کے ریسرچ اسکالرز کے تحقیقی کاموں سے بہتری کی امید رکھنا عبث ہے۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مختلف یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور اردو شعبہ جات کے صدور کے درمیان ایک خاص قسم کا رابطہ اور سمجھوتہ ہے۔پروفیسر اپنی نگرانی میں کام کرواتے ہیں اور امتحان کے لیے دوسری یونیورسٹی یا دوسری ریاست کے پروفیسر کو بلوایا جاتا ہے۔جوان ریسرچ اسکالرز کے تحقیقی

کاموں کو قابل قرار دیتے ہیں اور انھیں با آسانی ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگریاں عطا کر دی جاتی ہیں اور یہی ڈگریاں یونیورسٹیوں میں ملازمت کا واحد ذریعہ ثابت ہوتی ہیں۔۔۔اب تک کسی یونیورسٹی میں کسی مقالہ نگار کا مقالہ مسترد بھی ہوا ہے؟ یہ بات سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایسا ابھی تک کہیں بھی نہیں ہوا ہے۔ایک پروفیسر دوسرے پروفیسر کے امیدوار کو ناکام نہیں کرتا۔وہ ایسا کر بھی نہیں سکتا۔اگر وہ کسی امیدوار کو کامیاب نہ کرے تو پھر اس کے امیدوار یا زیر نگرانی کام کرنے والے ریسرچ اسکالر اور اس تحقیقی مقالے کا کیا ہوگا۔یہ ہی وجہ ہے کہ آج تک کسی یونیورسٹی کا کوئی مقالہ مسترد نہیں ہوا۔۔۔یہ وہ تلخ حقائق ہیں جن سے انکار ممکن نہیں۔مگر یونیورسٹیوں کے بیشتر اساتذہ ایسے ہی ہیں جو اس بات کا فراخ دلی سے اعتراف کریں گے۔وہ مصلحتاً ان خیالات کو تحریر میں لانا نہیں چاہتے۔مگر اپنی طرف سے مجھے ان خیالات کا اظہار کرنے کی اجازت ہے اور فرمایا کہ میں اس بات کی بھی ضمانت دیتا ہوں کہ میری جانب سے ان باتوں کی تردید نہیں کی جائے گی۔(۵)

علم و تحقیق کے سنجیدہ اہل قلم حضرات کے ایسے سیکڑوں بیانات نقل کیے جاسکتے ہیں جن میں تحقیق اور بالخصوص یونیورسٹیوں میں ہونے والی تحقیق پر عدم اطمینان کا اظہار کیا گیا ہے۔فی الحال انھیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

طلبا کی عدم دل چسپی کا ایک سبب اور بھی نظر آتا ہے وہ یہ کہ اچھے اور ذہین طالب علم کو نظر انداز کر کے نا اہل اور خوشامد کرنے والے طالب علموں کی طرف اساتذہ کا التفات ہے۔اکثر ذہین اور لائق طالب علموں کو یہ کہتے بھی سنا گیا ہے کہ کیا ضرورت ہے اتنی محنت کرنے کی ، جب اساتذہ کی ساری توجہ خوشامدیوں پر مرکوز رہتی ہے، کامیابیاں تو انھیں کو ملیں گی ۔اور یہ اساتذہ حضرات ملکی سیمیناروں سے لے کر غیر ملکی سیمیناروں تک میں اپنے انھیں کمزور طالب علموں کے لیے سفارش کرتے نظر آتے ہیں۔ابھی حالیہ دنوں میں ہندوستانی طلبا کا ایک وفد غیر ملکی دورے پر گیا ہوا تھا وہاں سے ایک طالب علم نے اپنی سرگرمیوں کی رپورٹ لکھتے ہوئے معمار کا املا میمار لکھا ہوا تھا۔اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایسی صورت حال میں ہماری تحقیق کا معیار کہاں تک گر سکتا ہے۔بہر حال تحقیق کی موجودہ صورت حال کسی طور بھی تسلی بخش نہیں ہے۔اس میں

بہت اصلاحات اور طریقہ کار میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔اس بحث کو پروفیسر گوپی چند نارنگ کے اس بیان پر ختم کیا جاتا ہے:

> ''تحقیق کی دنیا میں آسمان دور اور زمین سخت ہے اس میں مسلسل محنت، لگن، ادبی دیانت داری اور پتہ مار کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔اس میں گوہر مراد آسانی سے ہاتھ نہیں آتا ہے لیکن افسوس ہے کہ ہمارے دور میں سستی شہرت کو مقصد سمجھ لیا گیا ہے۔جلد بازی کی وبا عام ہوگئی ہے اور ہوس کی گرم بازاری کا یہ عالم ہے کہ اس وقت '' آبروئے شیوۂ اہل نظر'' بھی خطرے میں ہے''۔(٦)

تحقیق کی صورت حال مسائل اور امکانات پر مسلسل غور کرنے کے بعد راقم حروف کے ذہن میں موجودہ صورت حال کے تدارک کے لیے کچھ تجویزیں ابھری ہیں جو شاید تحقیق کے معیار کو بہتر بنانے اور نئے امکانات کے در کھولنے میں معاون ہوسکتی ہیں۔ذیل میں ان امور اور تجویزوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔

تحقیق کے لیے سب سے پہلا اور شاید سب سے اہم مسئلہ موضوع کا انتخاب ہے۔تحقیق کے طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ موضوع کا انتخاب کرتے ہوئے نہایت احتیاط سے کام لے اور جن موضوعات میں اسے دلچسپی نہ ہو اسے اختیار نہ کرے۔اسی طرح جن علوم یا اصناف پر اسے دسترس نہ ہو، ان سے بھی اجتناب برتے۔کسی فن اور ارتقا پر کام کرتے ہوئے فن کی مبادیات کا بغور مطالعہ کرے اور اس فن میں عہد بہ عہد ہونے والی تبدیلیوں پر نظر رکھے اور اپنے فرض منصبی کا خیال رکھتے ہوئے موضوع کے ہر پہلو سے بحث کرتے ہوئے نتیجہ اخذ کرے۔اگر ایک ریسرچ اسکالر پوری احتیاط اور شوق کے ساتھ اپنے موضوع کا انتخاب کرے اور پوری ذمہ داری سے متعلقہ مواد تک پہنچنے کی کوشش کرے تو بہتر تحقیق کی امید کی جاسکتی ہے۔

موضوع کے انتخاب کے بعد سب سے اہم مرحلہ فراہمئ مواد کا ہے۔اس سلسلے میں ہمارے اداروں کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔پہلی بات یہ کہ یونیورسٹیوں اور دیگر تحقیقی اداروں میں ہونے والی تحقیقات کی مکمل فہرست شائع ہونی چاہیے۔میرے ناقص علم کے مطابق جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے علاوہ ہندوستان کی کسی بھی دوسری یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ہونے والی تحقیق کی مکمل فہرست نہیں ہے۔فہرست کی دستیابی

سے موضوعات کی تکرار سے بچا جا سکتا ہے۔ لائبریریوں کی کیٹلاگ سازی بھی جدید طرز پر ہونی چاہیے اور ممکن ہو تو کم از کم تمام قابل ذکر لائبریریوں کے کیٹلاگ آن لائن بھی کر دینے چاہیے۔ اس کے علاوہ اگر کیٹلاگ مطبوعہ صورت میں ہوں تو اور بھی سہولت پیدا ہو سکتی ہے مگر بد قسمتی سے ابھی تک چند ہی لائبریریوں کے کیٹلاگ آن لائن ہو سکے ہیں ورنہ اکثر لائبریریوں کے کیٹلاگ تو مرتب بھی نہیں ہوئے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ لائبریریوں کے استعمال کو آسان سے آسان تر بنایا جانا چاہیے۔ اکثر لائبریریوں میں بیرونی طلبہ کو داخلہ ہی بڑی مشکل سے مل پاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اکثر جگہ مطلوبہ کتابوں کی نقول کے دستیابی کا کوئی انتظام نہیں ہو پاتا۔ راقم الحروف کو خود سفارشی خط ہونے کے باوجود کئی لائبریریوں میں داخلہ نہ ملنے کا تجربہ ہوا۔ کئی جگہوں پر نقل کی دستیابی ممکن نہ ہو سکی۔ اکثر لائبریریوں میں کیمرے کے استعمال پر پابندی ہے۔ جب کہ ترقی یافتہ ممالک میں لائبریریوں سے استفادہ نہایت آسان ہے۔

علمی و تحقیقی رسائل و جرائد کی اشاعت بھی معیار تحقیق کو بہتر بنانے میں معاون ہو سکتی ہے۔ ماضی میں ایسے رسالوں کی اپنی تاریخ ساز روایت رہی ہے۔ ان رسائل و جرائد میں نئی تحقیقات بھی شائع ہوتی تھیں اور ان پر احتساب بھی کیا جاتا تھا۔ مگر بد قسمتی سے ایسے بیش تر رسالے بند ہو گئے اور جو باقی رہ گئے ہیں وہ معیار کی پستی کا شکار ہو گئے ہیں۔ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، فکر و نظر علی گڑھ، معارف اعظم گڑھ، فکر و تحقیق دہلی، اردو اب دہلی اور آج کل اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ ہمارے اسلاف نے جس زندہ تحقیقی روایت کو قائم کیا تھا اس کی بنیاد ہی احتساب پر رکھی گئی تھی۔ محمود شیرانی کی شعر العجم پر تنقید، قاضی عبد الودود کے احتسابات اور رشید حسن خان کے احتسابی رویے نے احتیاط کی روش کو عام کیا تھا۔ اس بات کی ضرورت موجودہ عہد میں زیادہ ہے کہ ذاتی تعلقات و تعصّبات سے بالاتر ہو کر پوری دیانت داری کے ساتھ محاسبہ کیا جائے تا کہ احتیاط کی روش عام ہو سکے۔

اساتذہ داخلے کے عمل کو شفاف بنائیں تا کہ اہل طالب علموں کو داخلہ مل سکے۔ قابل اساتذہ کے ذریعے اصولِ تحقیق کو پڑھایا جائے۔ مخطوطے جو ہماری ادبی تاریخ کا ناگزیر حصہ ہیں، ان کی شناخت کے لیے علاحدہ سے کورس قائم کیا جائے اور مخطوطہ شناس اساتذہ کے ذریعہ اس فن کی بھی تعلیم دی جائے۔ اگر اس

طرف بھی توجہ دی جائے تو ابھی بہت سے مخطوطے خانقاہوں، قدیم مدرسوں اور خاندانی ذخیروں میں دبے پڑے ہیں۔ ممکن ہے کہ اگر اس طرف توجہ دی جائے تو کچھ ایسے انکشافات بھی ہو سکتے ہیں جو ہمارے ادب کی تاریخ میں اضافے کا باعث ہوں۔

یہاں اس بات کا ذکر کر دینا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ اکثر نگراں حضرات اپنے زیر نگرانی کام کرنے والوں کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ اگر یہ اساتذہ اپنی اخلاقی اور منصبی ذمہ داری کو سمجھتے ہوئے باقاعدگی کے ساتھ وقفے وقفے سے کاموں کا جائزہ لیتے رہیں تو عین ممکن ہے کہ نتیجہ موجودہ صورت حال سے مختلف ہو۔ ذرا سی توجہ اور سختی ریسرچ اسکالروں کو محتاط اور فعال بنانے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

اب ذرا سا ذکر کرتے ہیں موضوعات کا۔ آج کل یونیورسٹیوں میں فلاں کے ناولوں کا سیاسی و سماجی مطالعہ، یا فکری و موضوعی مطالعہ یا تنقیدی مطالعہ کا رواج چل پڑا ہے۔ بے شک یہ کام بھی اہم ہے مگر اول تو ان موضوعات کی تحقیقی اہمیت مشتبہ ہے اور پھر ان موضوعات پر جس طرح سے کام ہو رہے ہیں، اہل علم وادب ان سے واقف ہیں۔ اگر اہل علم وادب ذرا سی توجہ موضوع کے انتخاب پر بھی دیں تو بہت ممکن ہے کہ صورت حال میں تبدیلی رونما ہو۔ اس سلسلے میں کئی بنیادی کام کرنے کے ہیں۔ جیسے لغت نویسی یا فرہنگ نویسی۔ اردو میں لغت نویسی کا کام جدید طرز پر نہیں ہوا ہے۔ چند ایک کام ضرور منظر عام پر آئے ہیں مگر ان پر اطمینان کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح ادبی تاریخ نویسی کا کام بھی ابھی تک نامکمل ہے۔ مجھے یہاں پر اجتماعی تحقیق کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔ اگر کوئی فاضل استاد چند طالب علموں سے اجتماعی طور پر ان موضوعات پر کام کروائے تو بہت مثبت نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح علاقائی تاریخوں، صنفی اور فنی تاریخوں پر خاطر خواہ کام کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے یہاں ادبا و شعرا کی سوانحی تاریخیں کم لکھی گئی ہیں۔ اگر اس جانب بھی توجہ دی جائے تو مثبت نتیجے کی امید کی جا سکتی ہے۔ قدیم متون کی ترتیب و تدوین بھی نہایت ضروری ہے اس طرف بھی توجہ دی جانی چاہیے۔ اب مطبوعہ کتابوں کی تدوین نو اور اشاعت بھی اتنا ہی ضروری ہو گیا ہے جتنا کہ غیر مطبوعہ متون کا۔ ستم تو یہ ہے کہ معمولی کتابیں تو درکنار آج بعض مشاہیر کی اہم تصنیفات تک سہل الحصول نہیں ہیں۔ اس لیے اس جانب بھی اہل تحقیق کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اگر

صورت حال کے تدارک کی تدبیریں نہ کی گئیں تو نہ صرف تحقیق کا معیار گرتا چلا جائے گا بلکہ ہماری زبان کا حسن بھی مجروح ہوتا جائے گا اور ہماری ادبی تاریخ بھی مشتبہ ہوسکتی ہے۔ میں اس تحریر کو مالک رام کے اس اقتباس پر ختم کرتا ہوں:

> ''یاد رکھیے اس سے آپ اردو کا مستقبل روشن نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ اور تاریک ہو رہا ہے۔ معاملہ ایک ڈگری یا سند عطا کر دینے پر ختم نہیں ہو جاتا۔ ان نو وارد ڈاکٹر صاحب کی بنیاد ہی کمزور اور کج ہے، وہ آگے طلبا کو کیا پڑھائیں گے اور کیا ان کی رہنمائی کریں گے۔ لازماً اس کا اثر نئی نسل کے طلبا پر پڑے گا اور یوں یہ دیوار تا ثریا کج ہی چلی جائے گی۔ خدارا اپنی ذمہ داریوں کا خیال کیجیے اور ہر سال پخت اور خام کار استادوں میں اضافہ نہ کیجیے۔ ممکن ہے اس وقت آپ کو کوئی ٹوکنے والا نہ ہو، لیکن مستقبل کا مورخ آپ کو ہرگز معاف نہیں کرے گا، خدا کرے میری یہ دردمندانہ نصیحت صدا بصحرا ثابت نہ ہو اور متعلقہ حضرات اس سے زیادہ محتاط ہو جانے کا تہیہ کر لیں۔'' (۷)

حواشی:

۱۔اختر اوینوری، مشمولہ رہبر تحقیق،لکھنؤ:۱۹۷۶ء،ص ۱۳۷

۲۔گوپی چند نارنگ، مشمولہ رہبر تحقیق،لکھنؤ:۱۹۷۶،ص ۱۴۳

۳۔مالک رام، مشمولہ رہبر تحقیق،لکھنؤ:۱۹۷۶ء،ص ۱۳۱

۴۔۳۔مالک رام، مشمولہ رہبر تحقیق،لکھنؤ:۱۹۷۶ء،ص ۱۳۲

۵۔گوپی چند نارنگ، مشمولہ رہبر تحقیق،لکھنؤ:۱۹۷۶،ص ۱۴۷

۶۔مالک رام، مشمولہ رہبر تحقیق،لکھنؤ:۱۹۷۶ء،ص ۱۳۴

۷۔مالک رام، مشمولہ رہبر تحقیق،لکھنؤ:۱۹۷۶ء،ص ۸۲

ماحصل

ماحصل

دیگر شعبہ ہائے علوم کی طرح زبان وادب میں بھی تحقیق کی بنیادی اہمیت ہے۔ تحقیق ادب کی تفہیم اور اس کے ارتقائی مراحل کو سمجھنے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ ادب میں ہمارا سروکار تخلیق سے ہوتا ہے، مگر محض تخلیق کو سامنے رکھ کر اس کی مکمل تفہیم یا تعین قدر ممکن نہیں۔ تخلیق کے پیچھے کا فنکار اور فنکار کے پیچھے کا جو ماحول و معاشرہ ہے، اسے بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں ادب میں متن کی بنیادی اہمیت ہے۔ صحیح اور اصل متن تک رسائی کے بغیر نتائج اخذ نہیں کیے جاسکتے۔ چنانچہ اس مقام پر آ کر تحقیق اپنی اہمیت تسلیم کروالیتی ہے۔

تحقیق کی اسی ناگزیری کے باعث اردو میں بھی تحقیق کی طرف توجہ کی گئی۔ یوں تو اردو میں باقاعدہ ادبی تحقیق کا سلسلہ بیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہوا، مگر اس کے ابتدائی نقوش انیسویں صدی ہی میں ابھرنے شروع ہو گئے تھے۔ اس سے قبل اردو میں تذکرہ نگاری کا رواج عام تھا۔ ان تذکروں میں تحقیقی عناصر کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ اگرچہ تذکروں میں تحقیق کا وہ معیار نہیں تھا جو آج ہمارے زمانے میں ہے، تاہم ان کی تحقیقی اہمیت سے کلی طور پر انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تذکرے ایک مخصوص وقت کی پیداوار ہیں اور ان کی تالیف کا مقصد کوئی تنقیدی یا تحقیقی کارنامہ انجام دینا نہیں تھا۔ چنانچہ فطری طور پر تذکرہ نگاروں کے یہاں تحقیق سے بے اعتنائی ملتی ہے۔ جس کی وجہ سے اکثر شعرا کے حالات از حد مجہول اور مختصر معلوم ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اکثر تذکروں کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق عمل میں آئی جس سے کسی شاعر کے زمانی تقدم یا تاخر کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، شعرا کے حالات میں سنین کے التزام پر بھی توجہ نہیں دی گئی۔ اس طرح کے نقائص تذکروں میں عام طور پر نظر آتے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے تذکرہ نگار بھی ہیں جن کا تاریخی یا تحقیقی شعور عام تذکرہ نگاروں سے زیادہ پختہ تھا۔ چنانچہ ان کے یہاں شعرا کے حالات میں تفصیل بھی ملتی ہے۔ مثلاً مجموعۂ نغز اور عمدۂ منتخبہ وغیرہ میں شعرا کے حالات تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، جس سے شاعر کی سیرت، شخصیت اور تخلیقی پس منظر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ اکثر تذکروں کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق عمل میں آئی ہے، مگر کچھ تذکرے ایسے بھی ہیں جن میں شاعروں کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نام محمد قیام الدین قائم کا ہے، انھوں نے مخزنِ نکات میں طبقاتی تقسیم کی بنیاد ڈالی اور بعد میں یہی طبقاتی تقسیم محمد حسین آزاد کے یہاں زیادہ تفصیل اور وضاحت کے ساتھ آب حیات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس سلسلے میں طبقات الشعرا (قدرت اللہ قاسم)، تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن) اور طبقات شعرائے ہند (کریم الدین) کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔

تذکروں کے تاریخی شعور کے سلسلے میں جو سب سے بڑا نقص ہے وہ یہ ہے کہ ان میں تاریخ اور سنین کا التزام نہیں ملتا لیکن اس سلسلے میں کچھ تذکرے ایسے بھی ملتے ہیں جن میں سنین کا خصوصی التزام پایا جاتا ہے۔ ان تذکروں میں گل عجائب (تمنا)، گلزارِ ابراہیم (خلیل) اور طبقات شعرائے ہند (کریم الدین) کے نام خاص طور پر لیے جاسکتے ہیں۔

تذکرہ نگار عام طور پر شعرا کے حالات اور انتخاب کلام کے سلسلے میں اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیتے، جس سے ان کی صحت اور عدم صحت کے بارے میں تشکیک بنی رہتی ہے۔ لیکن کچھ تذکرہ نگار ایسے بھی ہیں جن کے یہاں راوی کا حوالہ بھی مل جاتا ہے۔ مثلاً گلزارِ ابراہیم (خلیل) میں شعرا کے حالات اکثر ذاتی معلومات اور زیرِ بحث شاعر کی فراہم کردہ معلومات پر مبنی ہیں۔ خوش معرکۂ زیبا (ناصر) میں ناصر جب بھی کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں تو یہ ضرور بتاتے ہیں کہ اس کا راوی کون ہے۔ اسی طرح انتخاب کلام کے سلسلے میں تذکرہ نگار کی پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کلام کا انتخاب دواوین کے مطالعہ کے بعد ہی کیا جائے۔ دواوین فراہم نہ ہونے کی صورت میں تذکرہ نگار دوسرے ماخذات کی طرف رجوع کرتا ہے۔ چنانچہ مجمع الانتخاب (شاہ کمال) میں اکثر انتخابات براہِ راست دواوین سے ہی کیے گئے ہیں۔ تاہم تذکروں کے بیانات اور ان کے پیش کردہ انتخاب پر مکمل بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے تذکروں کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے اور ان کی فراہم کردہ اطلاعات کو جانچ پڑتال کے بعد ہی قبول کرنا چاہیے۔

۱۸۵۷ء سے قبل تذکروں سے قطع نظر اردو میں علمی تحقیق کا فقدان نظر آتا ہے۔ سب سے پہلے سرسید احمد خان

نے اس جانب توجہ کی اور کئی تحقیقی کارنامے انجام دیئے۔ اس ضمن میں آئین اکبری کی تصحیح و تدوین اور آثار الصنادید خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اگر چہ سرسید ادبی تحقیق کی جانب پوری یکسوئی کے ساتھ متوجہ نہ ہو سکے تاہم ادبی تحقیق ان کے اثرات سے بے نیاز نہ رہ سکی۔ یہ اثرات سرسید کے رفقا کے یہاں زیادہ گہرے دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ شبلی اور حالی کا شمار اس دور کے محققین میں ہوتا ہے جن پر سرسید کے اجتہادی افکار کے گہرے اثرات ہیں۔ محمد حسین آزاد اگر چہ سرسید تحریک سے وابستہ نہیں تھے تاہم انھیں زمانے کی تغیر پذیری کا احساس شدید تھا۔ چنانچہ انھوں نے ادبی تحقیق و تفتیش کی جانب قدم اٹھایا۔

حالی نے سعدیؔ، غالبؔ اور سرسید احمد خان کی سوانح عمریاں لکھیں۔ سعدیؔ سے متعلق یوں تو کچھ معلومات فارسی تذکروں اور انگریزی کتابوں میں مل جاتی تھیں مگر حالیؔ نے پہلی بار اسے جامع انداز میں مرتب کیا اور بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا۔ مثلاً سعدیؔ کا سومنات کے مندر میں آنا وغیرہ۔ یہ بات درست ہے کہ حالیؔ نے سعدیؔ کی سوانح پر تنقید کلام کے مقابلے میں زیادہ زور دیا ہے اور کتاب کا تنقیدی حصہ بہت ہی محنت سے لکھا گیا ہے۔ سعدیؔ سے متعلق یہ بنیادی کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔

حالیؔ نے ہی سب سے پہلے اردو کے ایک مایۂ ناز شاعر کے حالات اور اس کی شاعری پر قلم اٹھایا۔ اگر چہ حالیؔ کی فراہم کردہ معلومات مکمل نہیں ہیں مگر اس سے غالب شناسی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس لحاظ سے اس کتاب نے بہت دوررس اثرات مرتب کیے۔ غالبؔ کو حالیؔ نے جس انداز میں سمجھایا ہے، اس میں کلام نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح حالیؔ نے سرسید کی ایک مبسوط سوانح بعنوان 'حیات جاوید' لکھی، یہ کتاب سرسید اور علی گڑھ تحریک پر آج تک سب سے زیادہ جامع کتاب ہے اور ہماری ادبی تحقیق میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

حالی نے جہاں ادبی سوانح نگاری کی طرف توجہ مبذول کی وہیں محمد حسین آزاد نے 'آبِ حیات' لکھ کر ادبی تاریخ نگاری کی بنیاد ڈالی۔ جس سے آئندہ کے محققین نے بہت استفادہ کیا۔ اگر چہ اس کتاب کے تسامحات و تعصّبات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا مگر محمد حسین آزاد کے تاریخی اور ادبی شعور نے اسے ایک شاہکار بنادیا ہے۔ کوئی بھی ادبی مؤرخ و محقق اس سے صرف نظر کر کے اپنی تحقیق کو اعتبار کے درجے تک نہیں پہنچا

سکتا۔ اسی طرح آزاد کی 'سخن دانِ فارس' بھی اردو میں لسانی تحقیق کی پہلی کتاب قرار دی جاسکتی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد کی ان دونوں تصانیف نے اردو تحقیق پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔ چنانچہ ان کتابوں کے اثرات بعد میں ہونے والی تحقیقات میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

حالؔی اور آزادؔ کے ان کارناموں نے ادبی تحقیق کی جانب لوگوں کو متوجہ کیا اور متعدد دوسری سوانح عمریاں اور دوسرے موضوعات پر تحقیق کا رواج عام ہونے لگا اور ۱۹۱۴ء تک متعدد تحقیقی تصانیف منظرِ عام پر آ گئیں۔ لیکن ابھی تحقیق کی روایت پختہ نہیں ہوئی تھی۔ دراصل اب تک تحقیق کے طریقۂ تحقیق سے آگہی عام نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ اس دور میں حوالوں کا التزام مفقود نظر آتا ہے اور ساتھ ہی مبالغہ آمیزی بھی اس دور کی تصانیف میں عام طور پر نظر آتی ہے۔

طریقۂ تحقیق سے آگاہی سب سے پہلے شبلی کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ ان کی مشہور زمانہ کتاب 'شعر العجم' آج بھی فارسی ادب کی تاریخ میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں شعری محاسن و معائب کے ساتھ ساتھ قواعد زبان بھی زیرِ بحث آگئے ہیں۔ البتہ وسائل کی کمی کے باعث اکثر مقامات پر حوالوں کی کمی اور مجہولیت ضرور کھٹکتی ہے۔ مرزا علی لطف کے تذکرے 'گلشن ہند' کی ترتیب و تدوین ان کا ایک اور کارنامہ ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ انھوں نے اردو تحقیق کو تدوین متن سے متعارف کرایا۔ موازنۂ انیس و دبیر لکھ کر انھوں نے اردو میں تقابلی تنقید کی بنیاد ڈالی اور انیس شناسی کے لیے راہ ہموار کی۔ ان کی ہیرو پرستی نے ان سے الغزالی، الفاروق، النعمان اور سیرۃ النبی جیسی شاہ کار سوانحی تحقیقی کتابیں تصنیف کروائیں۔ مذکورہ کتابوں میں موجود تحقیقی مواد اور ان کے استعمال کے طریقے کو سامنے رکھ کر تحقیق کے اصول ترتیب دیے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے پہلی بار اردو تحقیق کو روایت اور درایت کے اصولوں سے آگاہ کیا۔ ماخذ و مواد کی تلاش و تفتیش، حوالوں کا فٹ نوٹ میں اندراج، راوی اور روایت کی معتبریت کا مسئلہ، تحقیقی منسوبات، تدوین متن وغیرہ کو شبلی کی اولیات میں شمار کیا جانا چاہیے۔

۱۸۵۷ء کے بعد مغربی تعلیم کا رجحان عام ہونے کی وجہ سے بیسویں صدی کے اوائل تک ایک ایسا طبقہ وجود میں آ گیا تھا جو انگریزی سے واقفیت رکھنے کے ساتھ ساتھ عربی فارسی پر بھی عبور رکھتا تھا۔ یہ طبقہ

انگریزی سے واقفیت رکھنے کے باعث تحقیق کے مغربی اصولوں سے بھی آگاہ تھا۔ چنانچہ اس طبقے نے اپنی عربی فارسی دانی کو بنیاد بنا کر مغربی طریقۂ تحقیق سے استفادہ کرتے ہوئے ادبی تحقیقات کا سلسلہ شروع کیا اور گراں بہا خدمات انجام دیں۔ دوسری جانب ایسے لوگ بھی تحقیقی خدمات انجام دے رہے تھے جو عربی فارسی پر تو مہارت رکھتے تھے مگر انگریزی سے ناواقف تھے تاہم انھیں بدلتے ہوئے معیارِ تحقیق سے آگاہی ضرور تھی۔

ادھر اردو ہندی کا جھگڑا روز بروز زور پکڑتا جا رہا تھا۔ منجملہ دیگر مباحث کے زبان کی قدامت کا مسئلہ بھی معرضِ بحث میں آیا۔ یہیں سے اردو میں لسانی تحقیق کا بھی آغاز ہوتا ہے۔ محمود شیرانی اور محی الدین قادری زور سے ہوتا ہوا یہ سلسلہ مسعود حسین خان تک آتا ہے اور آج بھی یہ سلسلہ کسی نہ کسی صورت جاری ہے۔ دوسری طرف دونوں زبانوں کے ماہرین نے اپنی اپنی زبان کی قدامت ثابت کرنے کے لیے قدیم متون کی تلاش شروع کی۔ چنانچہ اردو ادب میں دکنی ادب کی ایک طویل روایت کا اضافہ اسی دور میں ہوا اور متعدد ایسی شعری اور نثری کتب و رسائل کا علم ہوا جن سے اب تک اردو والے ناواقف تھے۔ اس طرح اردو تحقیق کی جانب سنجیدگی سے توجہ دی گئی اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر اچھا خاصا تحقیقی سرمایہ جمع ہو گیا۔

اس سلسلے میں شعری ادب پر خصوصی توجہ صرف کی گئی اور دکن اور شمالی ہند کے شعرا سے متعلق متعدد تحقیقی کارنامے انجام دیئے گئے۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اس دور میں ادبی متون کی تلاش زوروں پر تھی، اس لیے شعری ادب سے متعلق تحقیقات میں شعرا کے کلام، ان کے دواوین و کلیات کی تلاش و ترتیب پر سب سے زیادہ توجہ صرف کی گئی۔ اب تک ولی کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر مانا جاتا تھا مگر کلیات محمد قطب شاہ کی بازیابی کے بعد ولی کی اولیت ختم ہو گئی۔ اسی طرح متعدد دوسرے دکنی شعرا کے کلام کی بازیابی سے اردو ادب کی تاریخ کے سلسلے بہت دور تک جا نکلے۔

دکنی شعرا کے کلام کی ترتیب و تدوین کے ساتھ شمالی ہند کے قدیم شعرا کے کلام اور ان کے دواوین کی ترتیب و تدوین بھی عمل میں آئی اور مسعود حسن رضوی ادیب نے دیوانِ فائز مرتب کرنے کے ساتھ فائز کو شمالی ہند کا پہلا صاحب دیوان شاعر قرار دیا۔ اگرچہ آج کلیات جعفر زٹلی کی اشاعت کے بعد رضوی صاحب کا

یہ دعویٰ باطل ہو جاتا ہے تاہم اس وقت تک کی تحقیقات کے لحاظ سے یہ بڑا اہم کارنامہ تھا۔شمالی ہند کے شعرا میں غالب پر خصوصی توجہ صرف کی گئی۔نسخۂ بھوپال کی بازیابی سے کلام غالب کی تاریخی تدوین کا سلسلہ شروع ہوا۔اس سلسلے میں نسخۂ حمیدیہ، غالب نامہ (شیخ اکرام) خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔اس کے علاوہ امتیاز علی عرشی نے دواوین غالب کی تدوین نو جدید اصولوں کی روشنی میں کی۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ شعری متون کے مقدموں میں شعرا کے حالات، تصانیف اور شاعری سے متعلق تحقیقات بھی پیش کی جاتی تھیں۔ چنانچہ شعرا کے حالات وتصانیف سے متعلق یہ مقدمے بڑی تحقیقی اہمیت کے حامل ہیں۔

اس دور کے مرتبہ شعری متون پر نظر ڈالیں تو بیش تر حالتوں میں تدوین کے اصولوں سے بے اعتنائی نظر آتی ہے۔ یہاں مرتب کا بنیادی مقصد قدیم متون کی بازیابی نظر آتا ہے نہ کہ صحت متن۔ تاہم کچھ محققین ایسے بھی ہیں جن کے یہاں تدوین متن کے اصول کارفرما نظر آتے ہیں۔ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ایک سے زائد نسخے فراہم ہو جائیں اور باہم تقابل کے بعد جو اختلاف نسخ وغیرہ نظر آئیں ان کی نشان دہی ضرور کی جائے۔بعض محققین کے یہاں نامانوس اور مشکل الفاظ کی فرہنگ مرتب کرنے کا رجحان بھی نظر آتا ہے۔کچھ مرتب الحاقی کلام کا خیال بھی رکھتے ہیں اور غلط انتساب کی طرف بھی توجہ دیتے ہیں۔مثلاً نورالحسن ہاشمی صاحب نے جب دیوان ولی مرتب کیا تو دوسرے تمام نسخوں کے تقابل اور دیگر ذرائع سے فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں الحاقی کلام کو خارج کر دیا۔اس طرح اس دور کے مرتبہ متون کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ تدوین وترتیب متن کا جو سلسلہ ۱۹۲۰ء کے بعد شروع ہوا اس میں رفتہ رفتہ پختگی کے آثار ظاہر ہوتے گئے اور ۱۹۴۰ء کے بعد مرتب ہونے والے متون میں پہلے کی بہ نسبت تدوین کے اصولوں کا زیادہ خیال رکھا گیا۔ اس سلسلہ میں دیوان جوشش عظیم آبادی (مرتبہ قاضی عبدالودود)، انتخاب غالب (مرتبہ عرشی) اور دیوان فائز (مسعود حسن رضوی) کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

ادبی متون کی تدوین کے ساتھ شعرا کے حالات پر مستقل تحقیقی تصانیف بھی منصۂ شہود پر آئیں۔ عام سوانحی تصنیف سے قطع نظر چند ایسی تحقیقی کتابیں اس دور میں تصنیف ہوئیں جن میں جدید تحقیقی اصولوں کا خیال رکھا گیا۔اس سلسلہ میں غلام رسول مہر کی 'غالب'، شیخ محمد اکرام کی 'غالب نامہ'، مالک رام کی 'ذکر غالب'

اور شیخ چاند کی کتاب 'سودا' اہمیت کی حامل ہیں۔ان تحقیقی کتابوں نے نہ صرف ادبی تحقیق میں قابلِ قدر اضافے کیے بلکہ تحقیق کا ایک اعلیٰ معیار بھی قائم کیا۔ غلام رسول مہر کی 'غالب' غالبیات میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ شیخ چاند کی 'سودا' جدید انداز تحقیق پر لکھی گئی پہلی تصنیف ہے اور ادبی شخصیات پر جدید مقالہ نگاری کا انداز اسی کتاب کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

تدوین متن اور ادبی سوانح نگاری کے ساتھ ادبی تاریخ نگاری کی ایک مستحکم روایت ۱۹۴۷ء تک قائم ہو چکی تھی۔ اس سلسلہ میں 'گل رعنا' (عبدالحئی)، دکن میں اردو (نصیر الدین ہاشمی)، شعر الہند (عبدالسلام ندوی)، اردوئے قدیم (زور)، اردو ادب کی تاریخ (رام بابو سکسینہ)، تاریخ ادب اردو (گراہم بیلی) جیسی کتابیں معرض وجود میں آئیں۔ان کتابوں نے اردو ادب کی روایت میں صدیوں کا اضافہ کر دیا اور بہت سے ایسے شاعروں کو متعارف کرایا جنھیں ادبی دنیا فراموش کر چکی تھی۔ان مستقل ادبی تاریخوں کے علاوہ اصناف اور دبستانوں پر بھی تحقیقی مقالے لکھے گئے جن میں دلی کا دبستان شاعری (نور الحسن ہاشمی)، لکھنؤ کا دبستان شاعری (ابواللیث صدیقی) اور اردو غزل کا نشو و نما خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نظم کے مقابل نثری تحقیقات پر نسبتاً کم توجہ دی گئی مگر اس جہت میں بھی کئی اچھے کارنامے انجام دیئے گئے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے قدیم مخطوطات کی تلاش و اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔نثری متون میں 'معراج العاشقین' کی اشاعت عمل میں آئی اور اسے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب کرتے ہوئے اردو کی پہلی نثری تصنیف قرار دیا گیا اور ایک عرصہ تک اس کا انتساب اور اولیت برقرار رہی۔ بعد ازاں ڈاکٹر حفیظ قتیل کی تحقیق نے اس انتساب کو غلط ٹھہرایا اور یہ ثابت کیا کہ اس نثری رسالہ کا کوئی تعلق خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے نہیں ہے۔اسی طرح اردو نثر کی ایک اہم کتاب 'سب رس' اس زمانہ میں مدون ہوئی اور باغ و بہار کی تحقیقات کا سلسلہ بھی اسی زمانہ سے شروع ہوا۔شعرائے اردو کے متعدد تذکرے ڈھونڈ نکالے گئے اور ان کی اشاعت بھی جدید طرز پر ہوئی۔ غالب کے خطوط کی ترتیب و تدوین پر خصوصی توجہ صرف کی گئی۔امتیاز علی عرشی اور مہیش پرشاد نے اس سلسلے میں اہم کارنامے انجام دیئے۔۱۹۴۷ء تک مرتبہ ان متون میں عام طور پر اصول تدوین کا خیال نہیں رکھا گیا، لیکن کچھ کام ایسے ضرور ہوئے ہیں

جنھیں ہم اس دور کے لحاظ سے معیاری قرار دے سکتے ہیں۔اس سلسلے میں سب سے پہلا نام محمود شیرانی کا ہے۔انھوں نے 'مجموعۂ نغز' کی ترتیب میں جس محنت، عرق ریزی اور سلیقہ مندی کا ثبوت دیا ہے، اس سے پہلے اردو تحقیق میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ بعد ازاں امتیاز علی عرشی نے 'دستور الفصاحت' اور 'مکاتیب غالب' میں تدوین متن کا جو اعلیٰ معیار پیش کیا وہ آج بھی مثالی ہے۔

اب تک ادبی تاریخوں یا تذکروں میں نثر نگاروں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی، مگر یحییٰ تنہا نے 'سیر المصنفین' لکھ کر ایک مستحسن روایت قائم کی۔اس کتاب میں صرف نثر نگاروں کا تذکرہ ہے۔اس کے بعد رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو (حصۂ نثر)، سید محمد کی 'ارباب نثر اردو'، احسن مارہروی کی 'نمونۂ منثورات' اور حامد حسن قادری کی 'داستان تاریخ اردو' منصۂ شہود پر آئیں۔ان کتابوں میں اردو نثر نگاری کی پوری تاریخ سمٹ آئی ہے۔آزادی کے بعد بھی نثر کی تاریخ پر اس قدر کام نہیں ہوسکا۔ان مستقل ادبی تاریخوں کے علاوہ اصنافِ ادب اور ادیبوں کے حالات پر بھی مستقل تصانیف معرض وجود میں آئیں اور اردو نثر کے تمام پہلوؤں کو روشن کرنے کی کوشش کی گئی۔

۱۹۲۰ء کے بعد اردو زبان اور مسائل زبان پر بھی سنجیدہ تحقیقات کا سلسلہ شروع ہوا اور زبان کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی نقطۂ نظر سے غور وفکر کی راہ بھی ہموار ہوئی۔ چنانچہ قواعدِ لغات، اصلاح زبان، لفظیات، اصطلاح سازی، املا اور اردو زبان کی ابتدا جیسے موضوعات پر بہت اہم اور بنیادی کارنامے انجام دیئے گئے۔ جس سے اردو زبان میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوئی۔اردو زبان کی ابتدا سے متعلق بہت اہم اور بنیادی کتابیں اس دور میں وجود میں آئیں۔ان کتابوں میں 'پنجاب میں اردو' (محمود شیرانی)، ہندوستانی لسانیات (ڈاکٹر زور) اور مقدمہ تاریخ زبان اردو (مسعود حسین خان) خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

آزادی کے بعد اردو میں تحقیق کا رواج عام ہو چکا تھا اور اکثر یونیورسٹیوں میں بھی اردو شعبوں میں تحقیقی کام ہونے لگا تھا۔ پرانے محققین کے ساتھ کچھ نئے نام بھی اب منظر عام پر آنے لگے تھے۔قاضی عبدالودود، مولانا عرشی، مالک رام اور مسعود حسن رضوی ادیب کے ساتھ ساتھ نئے محققین کا ایک قافلہ اردو تحقیق کے میدان میں اپنے پاؤں جما رہا تھا۔ان محققین میں ڈاکٹر گیان چند جین، مختار الدین احمد، حنیف

نقوی، تنویر احمد علوی، رشید حسن خان، خلیق انجم، عبدالستار دلوی، پروفیسر نذیر احمد، علی جواد زیدی، کالی داس گپتا رضا اور عبدالرزاق قریشی وغیرہ کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

آزادی کے بعد اردو تحقیق کی سمت و رفتار میں تنوع اور تیزی آئی۔ آزادی کے بعد سے ۱۹۸۰ء تک کئی قابلِ ذکر متن جدید اصولوں کی روشنی میں مدون ہوکر سامنے آئے جن میں دیوان عزلت، کلیات ذوق اور کربل کتھا خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس عہد میں شخصی و سوانحی تحقیق کی طرف بھی خصوصی توجہ دی گئی اور مرزا مظہر جان جاناں، سودا، میر، غالب اور ذوق وغیرہ پر نہایت معیاری تحقیقات سامنے آئیں۔ اصناف ادب اور علاقائی ادبی تاریخوں کی طرف بھی توجہ دی گئی جس کے نتیجے میں مختلف ادبی مراکز کی خدمات ابھر کر منظر عام پر آئیں۔ نیز ادبی اصناف کی تاریخ مرتب کرنے کی راہ بھی ہموار ہوئی۔

اگرچہ آزادی سے قبل اردو ادب میں تحقیق کی قابلِ قدر روایت قائم ہوچکی تھی تاہم ابھی تک اردو میں اصولِ تحقیق مرتب نہیں ہوئے تھے۔ آزادی کے بعد جامعات میں تحقیق کا رجحان بڑھا تو اہلِ تحقیق نے اس طرف بھی توجہ کی۔ سب سے پہلے رسالہ 'آج کل' نے تحقیق نمبر شائع کیا۔ بعد ازاں متنی تنقید (خلیق انجم)، مبادیات تحقیق (عبدالرزاق قریشی) ۱۹۶۸ء میں طبع ہوکر منظر عام پر آئیں۔ تنویر علوی کی کتاب 'اردو میں اصولِ تحقیق و ترتیب متن' ۱۹۷۷ء اور گیان چند جین کی کتاب 'تحقیق کا فن' ۱۹۸۶ء میں منظر عام پر آئیں۔ اب تک اردو میں اصولِ تحقیق پر دو درجن سے زائد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

یوں تو آزادی سے قبل ہی غالبؔ پر تحقیق کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا مگر آزادی کے بعد اس میں تیزی آئی۔ اس عہد میں جن محققین نے غالبؔ کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا ان میں مالک رام، مختار الدین احمد، پروفیسر نذیر احمد، حنیف نقوی، کالی داس گپتا رضا اور خلیق انجم کے نام نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک طرف خلیق انجم نے خطوط غالب کو پانچ جلدوں میں ترتیب دے کر انجمن ترقی اردو سے شائع کیا وہیں دوسری طرف کالی داس گپتا رضا نے دیوان غالب کو تاریخی ترتیب کے ساتھ مرتب کرکے شائع کیا۔ غالبؔ کے علاوہ اس عہد میں میرؔ، سوداؔ، ذوقؔ اور اقبالؔ بھی کثرت سے موضوع تحقیق بنائے گئے۔ خطوط کے مدون کرنے کا رجحان بھی عام ہوا اور غالب کے علاوہ سرسید، شبلی، نذیر احمد اور اقبال وغیرہ کے خطوط بھی جدید طرز پر مدون

کیے گئے۔

اس زمانے میں تحقیق وتدوین کا رجحان عام ہواتو معیارتحقیق میں بھی گراوٹ آنے لگی۔ایسے میں قاضی عبدالودود، رشید حسن خان اور حنیف نقوی جیسے ثقہ محققین تازہ تحقیقات پر تبصرے کے ذریعے تسامحات کی نشان دہی کی طرف متوجہ ہوئے۔نتیجتاً تحقیق میں حزم واحتیاط کا رجحان عام ہونے لگا اور حواشی وضمیمے وغیرہ پر خصوصی توجہ دی جانے لگی اور تحقیق کے معیار میں بھی اضافہ ہوا۔

عہد حاضر میں جہاں علوم وفنون نے کافی ترقی کی ہے وہیں ادبی تحقیق پستی کا شکار ہوئی ہے۔اس کا سبب مادیت پرستی اور یونیورسٹیوں میں ریسرچ اسکالرز کی بڑھتی ہوئی بھیڑ ہے۔آج ہر شخص ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈگری حاصل کر کے اچھی ملازمتوں کا خواب دیکھ رہا ہے،اساتذہ اپنی ترقی کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسے میں تحقیق کا زوال کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔تحقیق تو ایک مسلسل عمل ہے اوراس کا مادی معاوضہ ممکن ہی نہیں ہے۔تحقیق کا صلہ تو وہ مسرت ہے جو محقق کو کسی نئی دریافت پر حاصل ہوتی ہے۔تاہم ابھی خال خال ہی سہی اعلیٰ تحقیق کے نمونے دیکھنے کو مل ہی جاتے ہیں۔فی الحال وہ محققین جن کے دم سے تحقیق کا بھرم آج بھی قائم ہے ان میں عبدالستار دلوی، پروفیسر محمد نسیم، داکٹر شمس بدایونی،ظفر احمد صدیقی، ڈاکٹر انصاراللہ وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

کتابیات

کتابیات

اکبر حیدری، تذکرہ ریختہ گویاں، اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، ۱۹۹۵ء

الیاس الاعظمی، دارالمصنفین کی تاریخی خدمات، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۲ء

امتیاز علی عرشی، دستور الفصاحت، ہندوستانی پریس، رامپور، ۱۹۴۳ء

آمنہ تحسین، حیدر آباد میں اردو ادب کی تحقیق، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۰ء

تنویر احمد علوی (مرتب) کلیات ذوق، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۲۰۰۵ء

تنویر احمد علوی، اردو میں بارہ ماسہ کی روایت (مطالعہ و متن) اردو اکیڈمی دہلی، ۲۰۱۵ء

تنویر احمد علوی، اصول تحقیق و ترتیب متن، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹ء

تنویر احمد علوی، آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق، اردو اکیڈمی، دہلی، ۱۹۹۰ء

جمیل جالبی، ادبی تحقیق، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۴ء

حالی، مقالات حالی حصہ دوم، انجمن ترقی اردو، جامع مسجد پریس، دہلی، ۱۹۳۶ء

حالی، حیات جاوید، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۲۰۱۳ء

حالی، حیات سعدی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۲۰۰۴ء

حالی، یادگار غالب، اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، ۲۰۰۹ء

حفیظ الرحمان واصف دہلوی، ادبی بھول بھلیاں، دہلی، ۱۹۷۹ء

حفیظ الرحمان واصف دہلوی، اردو مصدر نامہ، دہلی، ۲۰۱۲ء

حمیرہ جلیلی، سب رس کی تنقیدی تدوین، حیدر آباد، ۱۹۸۳ء

حنیف نقوی، تحقیق و تعارف، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۲۰۱۳ء

حنیف نقوی، حیات العلما، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۲۰۱۳ء

حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے، اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، ۱۹۹۸ء

خلیق انجم، دلی کے آثار قدیمہ، اردو اکیڈمی دہلی، دہلی، ۲۰۰۹ء

خلیق انجم، متنی تنقید، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۲۰۰۶ء

خلیق انجم، مرزا محمد رفیع سودا، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۳ء

خلیق انجم، مولانا ابوالکلام آزاد، اردو اکیڈمی دہلی، دہلی، ۲۰۱۳ء

خلیق انجم، (مرتب) رسوم دہلی، اردو اکیڈمی دہلی، دہلی، ۲۰۱۳ء

رشید حسن خاں (مرتب) گلزار نسیم، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۹۵ء

رشید حسن خاں (مرتب) باغ و بہار، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۲۰۱۰ء

رشید حسن خاں (مرتب) سحر البیان، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۲۰۱۰ء

رشید حسن خاں (مرتب) فسانۂ عجائب، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۲۰۰۹ء

رشید حسن خاں (مرتب) مثنویات شوق، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۹۸ء

رشید حسن خاں، ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ، ۱۹۹۰ء

رشید حسن خاں، اردو املا، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۲۰۰۹ء

رشید حسن خاں، زبان و قواعد، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۲۰۱۰ء

رشید حسن خاں، کلاسیکی ادب کی فرہنگ، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۲۰۱۳ء

سرسید احمد خاں، آثار الصنادید، اردو اکادمی دہلی، دہلی ۲۰۱۱ء

سید سجاد (مرتب) آب حیات کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ، اعجاز پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۵ء

سید شہاب الدین دسنوی، شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۸۷ء

سید عبداللہ۔ وجہی سے عبدالحق تک، ناز پبلشنگ ہاؤس دہلی، سنہ ندارد

سیدہ جعفر، دکنی رباعیاں، ساہتیہ اکیڈمی دہلی، ۱۹۶۶ء

سیدہ جعفر، سکھ انجن، حیدر آباد، ۱۹۶۸ء

سیدہ جعفر، ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ، حیدر آباد، ۱۹۶۰ء

سیدہ جعفر، (مرتبہ) من سمجھاون، حیدر آباد، ۱۹۶۴ء

شباب الدین، شبلی نعمانی: معنویت کی بازیافت، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۲۰۰۸ء
شبلی نعمانی، الفاروق، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۲۰۱۶ء
شبلی نعمانی، سیرۃ النبی (سات جلدیں) دارالمصنفین اعظم گڑھ ۲۰۰۵ء
شبلی نعمانی، شعرالعجم (پانچ جلدیں)، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۲۰۱۶ء
شبلی نعمانی، موازنۂ انیس و دبیر، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۲۰۰۴ء
شمیم طارق (مونوگراف) کالی داس گپتا رضا، ساہتیہ اکیڈمی، دہلی، ۲۰۰۴ء
ش۔ق۔نظام، غالبیات اور گپتا رضا، بمبئی، ۱۹۹۹ء
عبادت بریلوی، مقدمات عبدالحق، دہلی، ۱۹۷۳ء
عبدالحمید خاں عباسی، اصول تحقیق نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، پاکستان، ۲۰۱۵ء
عبدالرزاق قریشی (مرتب) دیوان راگ مالا، ادبی پبلشر، بمبئی، ۱۹۷۳ء
عبدالرزاق قریشی (مرتب) دیوان عزلت، ادبی پبلشر، بمبئی، ۱۹۶۲ء
عبدالرزاق قریشی (مرتب) مبادیات تحقیق، ادبی پبلشر، بمبئی، ۱۹۶۷ء
عبدالرزاق قریشی (مرتب) مرزا مظہر کے خطوط، ادبی پبلشر، بمبئی، ۱۹۶۵ء
عبدالرزاق قریشی (مرتب) نوائے آزادی، ادبی پبلشر، بمبئی، ۱۹۵۷ء
عبدالرزاق قریشی، اردو زبان کی تمدنی اہمیت، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۲۰۱۶ء
عبدالرزاق قریشی، مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا کلام، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۸۸ء
عبدالستار دلوی، اردو میں ادبی و لسانی تحقیق، بمبئی، ۱۹۸۶ء
عبدالستار دلوی، مقالات نجیب اشرف ندوی، انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی ۲۰۱۳ء
عبدالقیوم، تنقیدی نقوش، مقام طباعت و سنہ ندارد
علی جود زیدی، مالک رام ایک مطالعہ، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، ۱۹۸۶ء
قاضی عبدالودود، اردو شعر و ادب چند مطالعے، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء
قاضی عبدالودود، اردو مخطوطات، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء

قاضی عبدالودود، تحقیقات ودود، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء
قاضی عبدالودود، عبدالحق بہ حیثیت محقق، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء
قاضی عبدالودود، کچھ ادبی تحقیق کے بارے میں، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء
قاضی عبدالودود، میر، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء
قیام الدین قایم، مخزن نکات، اترپردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، ۱۹۸۵ء
کالی داس گپتا رضا، دیوان غالب کامل تاریخی ترتیب سے، ساکار پبلشر، بمبئی، ۲۰۰۵ء
گارساں دتاسی، مقالات گارساں دتاسی، حصہ دوم، انجمن ترقی اردو ہند، اورنگ آباد، ۱۹۴۱ء
گیان چندجین، ابتدائی کلام اقبال، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۲ء
گیان چندجین، اردو کی نثری داستانیں، اترپردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، ۲۰۰۲ء
گیان چندجین، پرکھ اور پہچان، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۵ء
گیان چندجین، تحقیق کا فن، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۲۰۰۸ء
گیان چندجین، عام لسانیات، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۱۹۸۵ءء
گیان چندجین، لسانی مطالعے، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۲۰۱۲ء
گیان چندجین، مقدمے اور تبصرے، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۹۰ء
مالک رام، تحقیقی مضامین، مکتبہ جامعہ لیمیٹیڈ، دہلی، ۱۹۸۴ء
مالک رام، تذکرہ، (مرتب) ساہتیہ اکیڈمی، دہلی ۲۰۱۵ء
مالک رام، خطبات آزاد، (مرتب)، ساہتیہ اکیڈمی، دہلی ۲۰۱۵ء
مالک رام، خطوط ابوالکلام آزد، (مرتب) ساہتیہ اکیڈمی، دہلی ۲۰۱۵ء
مالک رام، غبار خاطر (مرتب) ساہتیہ اکیڈمی، دہلی ۲۰۱۵ء
محمد امین زبیری و سید محمد یوسف قیصر، شمسی مشین پریس آگرہ، ۱۹۲۶ء
محمد حسین آزاد، سخن دان فارس، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۲۰۰۵ء
محمد حسین آزاد، آب حیات، اترپردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، ۲۰۰۳ء

محمد عبداللہ خویشگی (مرتب) مقالات سرسید، علی گڑھ سنہ ندارد
محمد قاسم، مولانا حفیظ الرحمان واصف دہلوی، اردو اکیڈمی دہلی، ۲۰۱۱ء
محمد نسیم (مرتب) دیوان درد، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۲۰۰۳ء
محمد نسیم (مرتب) کلیات غزلیات سودا، بنارس ہندو یونیورسٹی بنارس ۲۰۰۵ء
محمد نسیم (مرتب) مثنوی اسرار محبت، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۹۶ء
محمد نسیم، متعلقات سودا، بنارس ہندو یونیورسٹی بنارس ۲۰۰۳ء
محمود الٰہی) مرتب) طبقات شعرائے ہند، اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ ۱۹۸۴ء
محمود الٰہی) مرتب) نکات الشعرا، اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ ۱۹۸۴ء
محمود شیرانی (مرتب) پرتھی راج راسا، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۴۳ء
محمود شیرانی (مرتب) مجموعۂ نغز، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۲۰۰۲ء
محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، مکتبہ کلیاں، بشیرت گنج لکھنؤ ۱۹۶۰ء
محی الدین قادری زور، اردو شہ پارے، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد، ۱۹۲۹ء
محی الدین قادری زور، تذکرۂ مخطوطات (جلد اول) حیدرآباد، ۱۹۴۳ء
محی الدین قادری زور، داستان ادب حیدرآباد، طارق پریس حیدرآباد، ۱۹۵۱ء
محی الدین قادری زور، گلزار ابراہیم وگلشن ہند، انجمن ترقی اردو ہند، اورنگ آباد، ۱۹۳۴ء
محی الدین قادری زور، مرقع سخن، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد، ۱۹۳۷ء
مرزا اکبر علی بیگ، مرزا علی لطف: حیات اور کارنامے، حیدرآباد، ۱۹۷۹ء
مرزا قادر بخش صابر، گلستان سخن، اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ ۱۹۸۲ء
مسعود حسن رضوی ادیب، روح انیس، ساہتیہ اکیڈمی، دہلی ۲۰۱۱ء
مسعود حسن رضوی ادیب، نقد انیس، ساہتیہ اکیڈمی، دہلی ۲۰۱۴ء
مسعود حسین خاں، پرت نامہ، مشمولہ قدیم اردو حیدرآباد، ۱۹۶۵ء
مسعود حسین خاں، قصہ مہر افروز ودلبر (مرتب) انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۸۸ء

مسعود حسین خاں، نورالحسن ہاشمی، بکٹ کہانی، قدیم اردو حیدرآباد، ۱۹۶۵ء
مسعود حسین خاں۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۲۰۰۲ء
مسیح الزماں، اردو تنقید کی تاریخ، اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ ۱۹۸۷ء
مشتاق احمد، سرسید کی نثری خدمات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۹۳ء
مشفق خواجہ، تحقیق نامہ، مکتبہ جامعہ لیمیٹیڈ، دہلی، ۲۰۱۱ء
مظہر محمود شیرانی (مرتب) مقالات حافظ محمود شیرانی (جلد سوم) مجلس ترقئ ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء
مولوی عبدالحق، شبلی نعمانی، تذکرہ گلشن ہند، حیدرآباد، ۱۹۰۶ء
مولوی عبدالحق، گل عجائب، اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، ۱۹۸۵ء
مولوی عبدالحق، (مرتب) ریاض الفصحا، اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، ۱۹۸۵ء
نثار احمد فاروقی، تین تذکرے، مکتبہ برہان، دہلی، ۱۹۶۸ء
نجیب اشرف ندوی، مقدمہ رقعات عالم گیر، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۲۰۱۲ء
نذیر احمد (مرتب) قاضی عبدالودود: تحقیقی وتنقیدی جائزے، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۱۹۹۱ء
نذیر احمد (مرتب) قاضی عبدالودود: تحقیقی مطالعے، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۱۹۹۱ء
نذیر احمد (مرتب) مولانا امتیاز علی عرشی: ادبی وتحقیقی کارنامے، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۱۹۹۱ء
نذیر احمد (مرتب)، سید مسعود حسن رضوی ادیب، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۱۹۹۳ء
نورالحسن ہاشمی (مرتب) کلیات ولی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۱۰ء
نورالحسن ہاشمی (مرتب) مثنوی سراپا سوز، اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ ۱۹۸۸ء
نورالحسن ہاشمی (مرتب) مثنوی طوطی نامہ، اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ ۱۹۹۰ء
نورالحسن ہاشمی (مرتب) نوطرز مرصع، اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ ۱۹۸۵ء
نورالحسن ہاشمی، دلی کا دبستان شاعری، اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ ۲۰۰۹ء
وحید قریشی، مطالعۂ حالی، استقلال پریس لاہور ۱۹۶۱ء
یوسف حسین خاں، اردو غزل، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۲۰۱۵ء

رسائل و جرائد:

رسالہ ’نگار‘ کی متعدد فائلیں

سہ ماہی ’اسباق‘ پونہ کی متعدد فائلیں

سہ ماہی ’نوائے ادب‘ بمبئی، کی متعدد فائلیں

شش ماہی ’ابلاغ‘ پٹنہ کی متعدد فائلیں

ماہنامہ ’معارف‘ کی متعدد فائلیں

ماہنامہ ’الاصلاح‘ سرائے میر اعظم گڑھ کی متعدد فائلیں

ماہنامہ ’کتاب نما‘ کی متعدد فائلیں

ماہنامہ ’سب رس‘ حیدر آباد کی متعدد فائلیں

ماہنامہ ’شاعر‘ بمبئی کی متعدد فائلیں

ماہنامہ ’نیا دور کی متعدد فائلیں

’فکر و تحقیق‘ دہلی کی متعدد فائلیں

’فکر و نظر‘ علی گڑھ کی متعدد فائلیں

’ہماری زبان‘ انجمن ترقی اردو ہند، دہلی کی متعدد فائلیں

Urdu Mein Adabi Tahqeeq ki Riwayat: Eik Tajziyati Mutala

(Tradition of Litrary Research in Urdu : An Analytical Study)

Thesis submitted to the Jawaharlal Nehru University
In partial fulfilment of the requirements for the award of the degree

DOCTOR OF PHILOSOPHY

Submitted By

Ayaz Ahmad

Under the supervision of

Dr. Mohammad Asif Zahri

Co-Supervisior

Prof. Mohd. Shahid Hussain

Centre of Indian Languages

School of Language, Literature and Culture Studies

Jawaharlal Nehru University

New Delhi-110067

2017